شذراتِ رشادی

مولانا محمد ہارون رشادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب:۔ شذراتِ رشادی

مصنف:۔ مولانا محمد ہارون رشادی

سن اشاعت:۔ ۱۴۳۶ھ مطابق ۲۰۱۵ء

کمپوزنگ:۔ رشادی گرافکس بنگلور

تعداد:۔ ایک ہزار

قیمت:۔

ملنے کے پتے:۔

☆ القلم ایجوکیشنل اینڈ ویلفر ٹرسٹ، سدیا روڈ، بنگلور 9341944161

☆ رشادی بک سنٹر، نزد مسجد باگسوار، بنگلور

☆ محبوب بک ڈپو، روبرو رسل مارکیٹ، شیواجی نگر، بنگلور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	کلامِ الٰہی کی تاثیر	14
۲	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے دو اہم پہلو	21
۳	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکیمانہ اسلوبِ تبلیغ	25
۴	سیرتِ رسول، قول وعمل میں مطابقت کا اعلیٰ نمونہ	29
۵	مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ کی رحلت پر اظہارِ تاثر	34
۶	بڑے حضرت کی بڑی ادائیں	25
۷	بڑے حضرت رحمۃ اللہ علیہ	44
۸	بڑے حضرت ایک جامع صفات شخصیت	50
۹	ملفوظات بڑے حضرتؒ	57
۱۰	درخشاں ستارے	66
۱۱	اسم بامسمّی مردِ مجاہد قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ	80
۱۲	بھلا سکے گی کہاں ان کی خدمتیں دنیا	83
۱۳	کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے	87
۱۴	مدتوں رویا کریں گے اہلِ مے خانہ تجھے	96
۱۵	ہوگئی انجمن سونی فضا ہے سوگوار	101
۱۶	علم کی فضیلت	105
۱۷	ایک عالم دین کا طلبہ کو ڈاپٹ کرنا	109

۱۸	بچوں کی تعلیم میں ماں باپ کا کردار	111
۱۹	شب برأت کی فضلیت اور احکام	116
۲۰	قربانی، ایک جان کا زیاں ہے سوا ایسا زیاں نہیں	122
۲۱	عیدِ قرباں نہ رائیگاں جائے	127
۲۲	ختنہ کی شرعی حیثیت	134
۲۳	مسجدیں جنت کے باغ ہیں	146
۲۴	روزہ بندے اور رب کے درمیان ایک راز ہے	151
۲۵	روزہ پچھلے گناہوں کا کفارہ	154
۲۶	روزہ چھوڑنے والے کے لیے وعید	158
۲۷	افطار کے وقت ہزاروں دوزخیوں کی رہائی	161
۲۸	تراویح کے رکعات بیس ہیں	163
۲۹	اعتکاف کی فضلیت	170
۳۰	مختصر اعمالِ حج	174
۳۱	حج عبادت ہے تجارت نہیں	179
۳۲	حج کیمپ کو میلے کی شکل نہ دیں	183
۳۳	حج ٹورس والے اور دوسروں کے نام	186
۳۴	حج ہاوز......اردو ہال	188
۳۵	دینی مدارس میں اردو	190
۳۶	مسلمانوں سے چند اہم گذارشات	196
۳۷	ہر محلے کا ادارہ اردو اسکول اڈاپٹ کرے	197
۳۸	کرناٹک اردو اکیڈمی کی افسوسناک صورتحال	199
۳۹	اردو ہال کا بے حال	201

۴۰	کیا اتحادِ امت ناممکن ہے؟	203
۴۱	کیا ماہِ صفر منحوس ہے؟	217
۴۲	عاشوراء کا روزہ، حدیث کی روشنی میں	220
۴۳	موجودہ دور میں نکاح بوجھ کیوں؟	225
۴۴	مہر کی شرعی حیثیت	233
۴۵	طلاق کے استعمال کا شرعی طریقہ	243
۴۶	طلاق نامہ ایڈوکیٹ کا، فتویٰ مفتی کا	254
۴۷	کیا عورتوں کی ملازمت مناسب ہے؟	257
۴۸	جہیز کی خرابیاں اور والدین کی پریشانیاں	259
۴۹	جہیز ایک لعنت عظمیٰ	264
۵۰	معاشرے کی بدنظمیاں اوران کا سد باب	277
۵۱	مصیبتیں اوران سے نجات کا راستہ	280
۵۲	اسلام میں آزادی کا تصور	283
۵۳	مسلم خواتین مندر میں	291
۵۴	لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی	292
۵۵	وائے رے ستم ظریفی	294
۵۶	ملک میں مخلوط حکومت قائم ہوگی	296
۵۷	ہمدردانِ قوم کے نام	298
۵۸	مذہبی مقامات بل، دستورِ ہند کے پس منظر میں	300
۵۹	جشن میلاد النبی اور نوجوانانِ ملت سے گذارش	303
۶۰	جلسۂ سیرت النبی یا سیاسی جلسے	305
۶۱	آخر ایک دوسرے پر پھول جھڑیاں کب تک؟	306

٦٢	مسلم متحدہ محاذ کل ہند سطح پر	307
٦٣	لجنۃ العلماء کا قیام وقت کی اہم ضرورت	309
٦٤	ہمارے دیگر مسائل کی فکر کون کرے	313
٦٥	مبارکبادیوں کے بعد ہمارے وزراء کیا کریں؟	315
٦٦	خدمت خلق اور ہمارے سماجی کارکن	318
٦٧	تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں	320
٦٨	قصور کس کا، جھنڈے کا یا......؟	322
٦٩	اصلاحِ معاشرہ کے ذمہ داروں سے چند اہم گذارشات	324
٧٠	پڑھئے یک نہ شد دو شد	328
٧١	الیکشن میں مسلمانوں کا رول کیا ہو	330
٧٢	جنہیں دیکھ کے شرمائے یہود	332
٧٣	آخر اس مرض کی دوا کیا ہے؟	338
٧٤	بمبئی ٹو گوا	342
٧٥	جئے نگر عیدگاہ اور کارپوریشن کا پیشاب خانہ	344
٧٦	ضلعی وقف کمیٹیوں کی تشکیل	346
٧٧	ارزاں ہے خونِ انساں گائے کے دودھ سے	348
٧٨	غلامی سے آزادی کی طرف	351
٧٩	ٹکٹ کوڑی سر	358
٨٠	کرفیو پاس	362
٨١	دولہا سعودی کا کیس ڈاوری کا	366

مولانا مولوی قاری محمد ہارون رشادی کا مختصر تعارف

مولانا کی تاریخ پیدائش ۶/ اکتوبر ۱۹۷۲ء ہے۔ ماولی گورنمنٹ اردو اسکول اور الامین ہائی اسکول بنگلور میں ابتدائی تعلیم کے بعد اپنی رضا ورغبت سے دینی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور دار العلوم سبیل الرشاد میں داخلہ لے کر عالم، فاضل اور قاری کی اسناد کے ساتھ اکیس سال کی عمر میں فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد مادرِ علمی دار العلوم سبیل الرشاد ہی میں ناظم کتب خانہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور پھر دعوت وتبلیغ کے عظیم مقصد کو لے کر ملک وبیرونِ ملک کا ایک سال کا دورہ کیا۔ جس کے بعد شہر کے ایک دینی مدرسے میں تقریباً تین سال تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر مادرِ علمی میں استاذ محترم مربی ومحسن حضرت امیر شریعت کرناٹک مدظلہ العالی کی توجہات اور مشورہ سے امارت شرعیہ کرناٹک کے تحت مرکزی دار القضاء میں معین قاضی کے عہدہ پر مامور ہوئے جس پر تادمِ تحریر فائز ہیں اور کئی اہم مقدمات کی تکمیل میں حضرت قاضی صاحب (خطیب محمد یوسف صاحب باقویؒ) کے دستِ راست رہے ہیں۔

معین قاضی کے عہدہ کے علاوہ کئی دینی علمی ملی اداروں سے وابستگی ہے جن میں (۱) القلم ایجوکیشنل اینڈ چارٹیبل ٹرسٹ بنگلور جو کہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور اردو زبان وادب کی خدمت، ترویج واشاعت کے عظیم مقصد کے لیے قائم ہوا ہے اس کے آپ

بانی ، نائب صدر ہیں۔(۲) علماء کرام کی فلاحی انجمن رباط العلماء کرناٹک کے آپ جوائنٹ سکریٹری ہیں۔(۳) لجنۃ العلماء کرناٹک کے رکن شوریٰ، نائب معتمد مجلس صحافت ۔(۴) جامعہ غیث الہدیٰ شکاری پالیہ بنگلور کے بھی رکن ہیں۔(۵) بزمِ انجم کے ممبر ہیں۔

اس کے علاوہ میدانِ تحریر وتصنیف میں بھی سرگرم ہیں، دینی، سیاسی اور حالاتِ حاضرہ کے موضوعات پر آپ کے فکر انگیز مضامین اکثر مقامی اور بیرونی اردو اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔مولانا ایک دردمند دل کے مالک ہیں، ملی خدمات کا جذبہ آپ کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔اپنے فکر انگیز مضامین کے ذریعہ ہر وقت سلگتے ہوئے مسائل کی طرف ملت کے عوام وخواص کو نہ صرف متوجہ کرتے رہتے ہیں، بلکہ اس کے مؤثر حل بھی پیش کرتے ہیں۔اردو آپ کا گویا اوڑھنا بچھونا ہے، جہاں جاتے ہیں اردو کو اپنے ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ہر سرکاری وغیر سرکاری دستاویز پر آپ اردو ہی میں دستخط کرتے ہیں۔آپ کا اردو دستخط اتنا شستہ اور خوبصورت ہوتا ہے کہ انگریزی داں حضرات بھی اسے سراہتے اور پسند کرتے ہیں۔مولانا کی متحرک اور فعال شخصیت اس دور میں نوجوان علماء کے لیے اپنے اندر ایک سبق رکھتی ہے۔مختصر یہ کہ

ہوا ہے گو تند وتیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

سلیمان خان، موتی نگر، بنگلور
جنرل سکریٹری آل انڈیا ملی کونسل کرناٹک

تقریظ

حضرت العلام مناظرِ اسلام مولانا محمد سیف الدین صاحب رشادی عمت فیوضہم

استاذ حدیث وفقہ دار العلوم سبیل الرشاد بنگلور

الحمدللہ! مولانا محمد ہارون رشادی کی کتاب 'شذراتِ رشادی' متفرق مقامات سے دیکھنے کا موقع ملا۔

خط ان کا بہت خوب عبارت بہت اچھی
اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

مولانا کی یہ کتاب ہمہ جہتی مضامین پر مشتمل ہے، اس میں بالترتیب خدا تعالیٰ، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور بندگانِ خدا کے تذکرے کے بعد اہم دینی موضوعات پر نگارشات کی گئی ہیں پھر اخیر میں کچھ افسانے بھی مولانا کے قلم سے نکلے ہیں۔ اکثر مضامین شہر و بیرونِ شہر کے موقر اردو روزناموں اور رسالوں میں طبع شدہ ہیں، تاہم غیر مطبوعہ مضامین بھی کچھ کم نہیں۔ بڑے حضرت علامہ شاہ ابوالسعود احمد نور اللہ ضریحہ پر مولانا کے مضامین خاصے کی چیز ہیں۔ دیگر اساتذۂ دار العلوم سبیل الرشاد پر بھی مولانا نے 'درخشاں ستارے' کے عنوان سے نگارشات کی پہل کی ہے۔ یہ حضرات اس قابل ہیں کہ ضخیم جلدوں میں ان کی سوانح لکھی جائیں۔

چند مضامین ایسے بھی ہیں جو اخبارات کے لیے وقتی حالات کے تناظر میں لکھے گئے تھے، مرورِ زمانہ سے اب ان کی وہ حیثیت تو باقی نہ رہی البتہ اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت سے ان کی قدر اب بھی مستحکم ہے۔ نیز چونکہ یہ مضامین کثیر جہتی ہیں لہٰذا قاری کو متنوع گراں قدر معلومات سے روشناس کراتے ہیں، مولانا اردو کے صاحبِ طرز ادیب ہیں، اردو کے ساتھ قلبی لگاؤ رکھتے ہیں اور اردو سے متعلق خدمات میں پیش پیش رہتے ہیں، پیشہ وارانہ مصروفیات کے باوجود ایسے گراں قدر مضامین لکھنا مولانا ہی کا خاصہ ہے۔

خدا کرے عزیز محترم کی کوششیں بارآور ہوں اور یہ کتاب ناظرین کے لیے قیمتی سرمایہ بنے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرما کر ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین

(دستخط)
حضرت مولانا محمد سیف الدین رشادی غفرلہ
۱۰ر شوال ۱۴۳۶ھ

دعائیہ کلمات

محدث العصر استاذ الاساتذہ حضرت مولانا صغیر احمد صاحب رشادی عمت فیوضہم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہمارا ملک ہندوستان اس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے بستے ہیں ، جمہوری ملک ہے، ہر ایک کو اپنے دین و مذہب میں آزادی ہے، لیکن آزادی کے بعد وقفہ وقفہ سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے۔ ہندوازم کے نعرے لگائے جاتے ہیں، اس کے نتیجے میں اسلامی قوانین اور اس کے پرسنل لاء میں تبدیلی اور مسلمانوں کو ملک چھوڑنے کی باتیں کہی جاتی ہیں ، مسلمان عورتوں کی آزادی اور پردہ سے باہر نکلنے پر زور دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں خود مسلمانوں کے بعض افراد ایسے نئے مسائل کھڑا کر دیتے ہیں جن سے امت کا شیرازہ بکھرنے کا اندیشہ ہو جاتا ہے۔ الحمد للہ ان تمام پریشانیوں کو امت سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش ہر وقت دوررس اللہ کے خاص بندے قرآن وحدیث میں گہرائی و گیرائی رکھنے والے، ماہر و محقق دوررس علماء کرام دانشوران اور مسلمان صحافی کرتے آرہے ہیں۔ جزاء اللہ خیر الجزاء، جس سے امت کی اصلاح بھی ہوتی ہے نیز ہر چھوٹے بڑے فتنے بھی دب جاتے ہیں۔ یہ مقتداء و پیشوا محترم علماء عظام اور مسلم دانشوران امت مسلمہ کے لیے ڈھال ہیں اور جو باطل پرستوں کی طرف سے ہونے والے حملوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔

دار العلوم سبیل الرشاد نہ صرف ایک دینی و علمی و تبلیغی درسگاہ ہے بلکہ تحفظ شریعت

اور باطل سے نبرد آزمائی میں پیش پیش رہتا ہے اور تقریر و تصنیف وصحافت کی راہ سے بھی پوری امت محمدیہ کی رہنمائی کرتا ہے، یہاں کے فارغ علماء کی تصنیفات وتالیفات اوران کی تقریریں اس کی گواہ ہیں۔انہیں علماء میں ممتاز عالم دین مولانا محمد ہارون صاحب رشادی بنگلوری زید مجدہ ہیں۔ جو قدیم فارغین میں سے ہیں اور فراغت کے بعد مسلسل دین اور علمِ دین کی خدمت انجام دے رہے ہیں، کئی سالوں سے مرکزی دارالقضاء احاطہ سبیل الرشاد میں قضاء کے مقدس عہدہ پر فائز ہیں ذلك فضل اللّٰه يوتيه من يشاء ،نیز مولانا محمد ہارون صاحب رشادی ایک ماہر ادیب اور قدیم قلمکار ہیں، جن کی نگارشات اور مراسلات شہر گلستان بنگلور کے اکثر رسائل وجرائد کی زینت بنتے ہیں۔ان کے قلم میں بلا مبالغہ روانی ہوتی ہے، یہ کتاب دینی اصلاحی علمی سیاسی اور تاریخی مضامین پر مشتمل ایک حسین قلمی کاوش ہے جو شذراتِ رشادی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ شذرات مولانائے محترم کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو حالات حاضرہ کے تقاضوں پر مختلف رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔احقر نے اس کو مختلف جگہوں سے پڑھا ہے۔ ماشاء اللہ ان کی اس تالیف کو بہت ہی حسین اور مفید پایا۔اللہ تعالیٰ زورِ قلم کو اور زیادہ کرے۔قبولیت سے نوازے۔امت کے ہر خاص وعام کو خوب فائدہ پہنچائے، دارین کی کامیابی کا سبب بنائے۔آمین یارب العالمین۔

صغیر احمد رشادی
دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور
۱۸ رجب ۱۴۳۶

پیش لفظ

زیرِ نظر کتاب میرے ان مطبوعہ وغیر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً گردشِ دوراں نے ازخود مجھ سے لکھوائے۔ میرا اپنے ان مضامین کے بارے میں ایسا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ یہ مضامین کبھی کتابیں شکل پائیں گے اور میرے لیے ذخیرۂ آخرت کی ایک مستحکم صورت ہوگی۔ بس جب جب ضرورت محسوس ہوئی، قلم نے گردش کی اور حالاتِ حاضرہ پر جو کچھ ذہن و دماغ میں آیا لکھتا چلا گیا۔ لیکن مولوی اسماعیل میرٹھی نے سچ ہی کہا تھا

لکھا لکھنے والے نے ایک ایک حرف
ہوئی گتھیاں کتنی کاغذ کی صرف

اس طرح ہوتے ہوتے میرے پاس مضامین کا ایک ذخیرہ جمع ہوگیا۔ میرے ایک رفیق مولوی ریاض احمد انصاری رشادی نے اس ذخیرہ کو دیکھ کر کہا کہ کیا ہی اچھا ہو اگر ان قیمتی مضامین کو کتابی شکل میں جمع کردیا جائے، خیال معقول تھا، میں نے کمر باندھی اور بقولِ اسماعیل میرٹھی

اگر تھوڑا تھوڑا کرو صبح و شام
بڑے سے بڑا کام بھی ہو تمام

خدا کا شکر ہے میرے بکھرے ہوئے مضامین کا ایک بڑا منتخب حصہ اس کتاب میں جمع ہوگیا ہے۔

میں اپنے بارے میں کسی ایسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوں کہ میں بہت بڑا ادیب ہوں اور میرے یہ مضامین ادبی ذخیرے میں ایک قیمتی اضافہ ثابت ہوں گے۔تاہم جو کچھ میں نے تحریر کیا ہے وہ میرے والدین کی دعائیں اور اساتذہ کی جوتیوں کا صدقہ ہے اور ان کی خدمتِ بابرکت میں رہ کر حاصل کیے ہوئے تھوڑے بہت علم کا خلاصہ ہے۔

مضمون نویسی کی ابتداء مشفق و مربی حضرت مولانا نیر ربانی صاحبؒ کی تحریک اور زیر سرپرستی شروع ہوئی۔حضرت والا کی ہمت افزائی پر خاکسار نے سب سے پہلا مضمون جو تحریر کیا تھا اور حضرت والا نے اپنے دست مبارک سے اس مضمون کی اصلاح فرمائی تھی وہ بھی اس مجموعہ کی زینت ہے۔

چونکہ زیرنظر کتاب وقتاً فوقتاً حالات کے پیش نظر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے، اس لیے اس میں کسی خاص ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔تاہم اتنا ضرور ہے کہ ابتداء میں چند مضامین سیرتِ نبی علی صاحبہا الف الف تحیہ سے متعلق ہیں، پھر اسی سیرتِ نبوی سے فیض یافتگان کا ذکر خیر چند مضامین کو گھیرے ہوئے ہے، اس کے بعد ٹھیٹھ دینی مضامین کا ایک گلدستہ سجایا گیا ہے پھر مختلف سماجی، سیاسی مسائل سے آراستہ چند مضامین کے بعد ایک دو افسانوں پر کتاب کو ختم کیا گیا ہے۔

قارئین سے گذارش ہے کہ قابل اصلاح امور کی طرف توجہ دلائیں۔انشاءاللہ اگلے ایڈیشن میں غلطیاں درست کردی جائیں گی۔فقط

خاکسار: محمد ہارون رشادی عفی عنہ

یومِ عاشوراء ۱۴۳۶ھ

کلام الٰہی کی تاثیر

قدرت کا قانون انقلاب ہمارے گرد وپیش ہے اور خود ہمارے اندر ہر گھڑی نمایاں ہے۔ انقلاب اس دنیا کا خاصہ اور لازمہ ہے، پھر انقلاب دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک کائناتی انقلاب اور دوسرا ذہنی انقلاب۔ کائناتی انقلابات دنیا کی صورت بدلتے رہتے ہیں، جیسے جغرافیائی تبدیلیاں اور موسموں کا انقلاب۔ دوسرا ذہنی انقلاب ہے جو قوموں کے عروج وزوال کا باعث ہوتا ہے۔ ایام کی گردش نے کسی کو محروم نہیں چھوڑا اور نہ کسی کو بخشا۔

اللہ تعالیٰ اس انقلابات کی دنیا میں اپنی معرفت وشناخت کرانے کے لیے انسانوں کو پیدا فرمایا، یہ دنیا درحقیقت ایک بڑا مدرسہ ہے، خدا تعالیٰ نے اس مدرسہ میں ہم طلباء کے لیے کھانے پینے، رہنے سہنے، بیماری علاج غرض کہ یہ تمام ضروریات کا انتظام فرمایا اور یہ انتظامات اتنے مکمل اور منظّم ہیں کہ والدین بھی اپنی اولاد کے لیے، بادشاہ اپنی رعایا کے لیے، اور آقا اپنے غلام کے لیے کرنا چاہے تو نہیں کرسکتا۔

اس پوری دنیائے مدرسہ کے معلم حضراتِ انبیاء ہیں اور کتابیں آسمانی ہیں۔ خدا تعالیٰ نے انسانیت کو بے یار ومددگار نہیں چھوڑا۔ اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ اس دنیا کے مدرسے میں طلباء تو فراہم کردیتا لیکن اساتذہ نہ بھیجتا۔ اساتذہ کا انتظام تو کردیتا لیکن

کتابیں مہیا نہ کراتا۔ خدائے تعالیٰ جیسے حکیم وعلیم سے یہ بدانتظامی ممکن نہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اساتذہ کو بھیجا اور آسمانی کتابیں نازل فرمائیں۔

آسمانی کتابوں میں آخری کتاب قرآن حکیم ہے جو بنیادی طور پر انسان کو احکام الٰہی سے واقف کرانے اور اس کی روحانی ترقی اور اخروی کامیابی کے لیے دستور بنا کر اتاری گئی ہے۔ قرآن مجید نے ان اعمال کی نشاندھی کی جن کے ذریعے رضائے الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ وہ ممنوعات بھی ذکر کیے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہیں۔ پچھلی اقوام کے حالات اور ان کی بربادی کے اسباب بیان فرمائے تاکہ اگلے انسان پچھلے انسانوں کے انجام سے سبق حاصل کریں۔ بندے پر اللہ تعالیٰ کے اور بندے پر دوسرے بندگانِ خدا کے کیا حقوق ہیں، دینی زندگی کی فلاح اور عاقبت کی خوش انجامی کے راستے دکھانا قرآن کا بنیادی مقصد ہے۔ ترغیبات اور ترہیبات ساتھ ساتھ ہیں خوشخبریاں اور خوف پیدا کرنے والی باتیں ایک ساتھ۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”نَبِّیٔ عِبَادِیٓ اَنِّیٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ“ (سورہ حجر، ۴۹، ۵۰) اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ خبر دو میرے بندوں کو کہ یقیناً میں ہی بخشنے والا مہربان ہوں، اور یہ کہ میرا عذاب دردناک عذاب ہے۔ جس طرح شہر میں اگر کوئی اجنبی مسافر آجائے تو اسے کوئی پوچھتا نہیں اور کوئی معروف و باعظمت شخصیت آجائے تو پورا شہر اس کے استقبال میں ہمہ تن لگ جاتا ہے، اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے من جانب اللہ وہ انتظامات کئے گئے جو آپ کی شان رفیع کے مناسب تھے، ایسے ہی قرآن کا نزول ابھی شروع نہیں ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے عالی شان نزول کے مطابق اہتمام شروع

کر دیا۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ نزول قرآن سے پہلے شیاطین آسمان پر چڑھتے تھے اور ملأ اعلیٰ میں جو کچھ ہوتا تھا چوری سے سن کر اس کو کاہنوں کے کانوں میں پھونک دیتے تھے، لیکن جیسے ہی نزول قرآن کا دور آیا تو آسمان پر شیطان کی پرواز کی راہوں پر پہرے بٹھادیے گئے۔ اب اگر کوئی اوپر چڑھتا ہے تو اس پر بالکل اسی طرح فائرنگ کی جاتی ہے جیسے ہماری اس دنیا میں کسی ملک کی سرحد میں ناجائز طور پر داخل ہونے والوں پر فائرنگ کی جاتی ہے۔

قرآن مجید کو لوح محفوظ سے آسمانِ دنیا پر جس رات میں اتارا گیا اس رات کو ہزار مہینوں سے افضل قرار دیا گیا، پھر اس نزول کے لیے سب سے طاقتور فرشتے کا انتظام ہوا جو کہ سید الملائکہ حضرت جبرئیل ہیں۔ نزول قرآن کے آغاز کے لیے اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کی سرزمین کا انتخاب فرمایا جو پوری زمین کا مرکز ہے اور اس کلام پاک کو محفوظ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مومن بندوں کے سینوں کا انتخاب فرمایا۔ یہ تمام انتخابات کلام الٰہی کی عظمتوں اور اس کی رفعتوں کو واضح کرنے اور سمجھانے کے لیے ہیں، اس لیے کہ یہ کتاب ربِ عظیم کی طرف سے نازل شدہ کلام ہے۔ تمام کلاموں کا بادشاہ کلام اللہ کو دنیا کی تمام کتابوں پر ایسی ہی فضیلت حاصل ہے جیسے رب کائنات اور خالق کائنات کو اس کی تمام مخلوقات پر فضیلت حاصل ہے۔ کہنے والے نے بالکل درست کہا ہے کَلَامُ الْمُلُوْكِ مُلُوْكُ الْكَلَامِ (بادشاہوں کا کلام کلام کا بادشاہ ہے)

کلامِ الٰہی اتنا ثقیل اور وزنی ہے کہ بندہ اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ یہ خالق کریم ہی کا کرم ہے کہ اس کو عطا فرمادیا، حالانکہ آسمان وزمین اور پہاڑ جیسی عظیم اشیاء نے اللہ تعالیٰ کے اس بار امانت کو اٹھانے سے اپنی معذوری ظاہر کردی اور اس ظلوم وجہول بندے

نے اس بارِ امانت کو اٹھالیا۔ یہ رب حکیم کی حکمت ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کی کوئی مخلوق اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ احادیث مبارکہ میں تفصیل موجود ہے، جب کوئی آیت مبارکہ نازل ہوتی تو آپ پر بہت گرانی ہوتی۔ اگر آپ اونٹنی پر تشریف فرما ہوتے تو اونٹنی وحی کے بوجھ کو برداشت نہ کر کے بیٹھ جاتی، نزول وحی کے وقت آپ کا چہرہ اقدس سرخ ہو جاتا تھا۔ اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ کلام الٰہی اتنا وزنی اور ثقیل تھا کہ امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں اس کے تحمل کی قوت تھی کہ آپ نے اللہ کا مبارک کلام لے کر ہم تک پہنچایا۔

اللہ کا کلام بہت بڑی، لازوال اور لافانی نعمت ہے۔ یہ اپنے حاصل کرنے والوں کو بھی لازوال بنا دیتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا یقیناً اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ کسی قوم کو عزت وشرف کا بلند مقام عطا فرماتا ہے اور اسی کتاب کے ذریعے سے دوسرے لوگوں کو ذلت ورسوائی سے نیچے گرا دیتا ہے۔ اس ارشاد پر غور کرنے کی ضرورت ہے، کہ اللہ تعالیٰ اپنے کتاب کے ذریعے بہت سے گمنام خاندان اور گمنام لوگوں کی اولادوں کو دنیا بھر میں حسرت انگیز عزت اور بلندی نصیب فرماتا ہے، نیز جس کو اللہ نے کتاب اللہ کا علم عطا فرمایا ہے، اس کے مرنے کے بعد بھی دنیا میں بھی اس کے نام لیوا موجود ہوتے ہیں۔

کلامِ الٰہی کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ حضرت عمرؓ جیسے قوی القلب کا اسلام لانا اسی قرآن کا مرہون منت ہے۔ حبش کے نجاشی بادشاہ کا گریہ وبکاء، اسی قرآن کا نتیجہ ہے اور قرآن کی تاثیر آج ساڑھے چودہ سو سال کے بعد بھی قائم ہے، حالاں کہ وہ اب ہم جیسے نام کے مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے، جس کا تقاضہ تھا کہ اس کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔ حدیث میں ہے کہ حجر اسود جنت کا پتھر ہے، جب وہ جنت سے آیا تھا تو دودھ کی طرح سفید

تھا۔لیکن گنہ گار مسلمانوں کے ہاتھ لگتے رہنے کی وجہ سے سیاہ ہوگیا، بلکہ حجر ابیض کے بجائے نام ہی حجر اسود ہے۔ایسے ہی قرآن کی تاثیر کو بھی ہمارے ہاتھوں تک پہنچتے پہنچتے کمزور اور مدھم پڑجانا چاہیے تھا مگر چونکہ خدا کا کلام ہے، اس لیے آج بھی تاثیر کے اعتبار سے جوان ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے کے ایک ناظم مولانا سلطان الحق صاحب بھی تھے، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی خصوصی عنایتیں ان پر ہوتی تھیں، ایک مرتبہ حضرت مرغ اور مرغیاں لائے۔مولانا سلطان صاحب کو بھی ایک جوڑا دیا۔ انہوں نے بڑے شوق سے مرغ پالا تھا، اتفاقاً گم ہوگیا تو مولانا بڑے بے چین ہوئے۔ اس زمانے میں دیوبند میں ایک ہندو پنڈت تھا، اس کے پاس ایسا عمل تھا کہ سادہ کاغذ کچھ پڑھ کر پانی میں ڈالتا تو ہر ضرورت مند کے آنے کی وجہ اور اس کی پریشانی کا حل لکھا ہوا آتا۔ناظم کتب خانہ بھی اپنی پریشانی لے کر وہیں پہنچ گئے تو پنڈت نے حسب دستور اپنا عمل کیا، جس کا جواب یہ تھا کہ مرغ کھالیا گیا۔یہ مایوس وہاں سے لوٹے، دوروز کے بعد اپنے محلے کے ایک ہندو کے پاس جانا ہوا تو اس نے بتایا کہ مولوی صاحب میرے یہاں ایک چھوٹا سا سفید مرغ نہایت خوبصورت آگیا ہے۔ میں نے بند کر کے رکھا ہے، دیکھا گیا تو وہ انہیں کا مرغ تھا۔مولانا اگلے روز پھر اس پنڈت کے پاس پہنچے اب کی بار ان کے ساتھ ایک طالب علم بھی آیا، جس کی جیب میں جیبی قرآن تھا۔پنڈت نے ان کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ پھر کسی ضرورت سے آئے ہیں۔اس لیے اپنا عمل کیا لیکن اب اس کے کاغذ پر کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔کاغذ کورا نکل آیا۔اس نے گھبرا کر پھر عمل کیا اور کاغذ پانی میں ڈال کر نکالا تو پھر بھی لکھا ہوا نہیں تھا۔اس نے گھبرا کر پوچھا کہ تم میں سے کسی کے پاس کلام اللہ تو نہیں

ہے؟اس طالب علم نے کہا میری جیب میں قرآن مجید موجود ہے۔پنڈت نے ایک صاف تولیہ لاکر دیا اور کہا کہ اس قرآن مجید کو ذرا دور رکھ کر آیئے۔اس کے بعد اس نے عمل کیا تو اب کاغذ پر جواب موجود تھا۔مولانا سلطان صاحب نے اس کی وجہ پوچھی تو پنڈت بولا کہ مولانا میرا عمل شیطانی ہے، رحمانی کلام کی موجودگی میں وہ نہیں چلتا۔قرآن مجید کی یہ تاثیر آج ساڑھے چودہ سوسال کے بعد بھی اس انداز سے اعلانیہ طور پر ظاہر ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے چھوٹے صاحبزادے ہیں، جن کا ترجمہ قرآن الہامی ترجمے سے معروف ہے۔جب حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کی وفات ہوئی تو ان کے بڑے بھائی حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے فرمایا ''عبدالقادر کے دفن ہونے کے بعد اس قبرستان کے تمام مردوں سے بھی عذاب اٹھالیا گیا۔اور ایسا حفظ قرآن کی برکت سے ہوا''۔

جون پور جو یوپی میں مشہور مردم خیز علاقہ ہے، وہاں کے ایک بزرگ اپنے شہر سے کہیں سفر میں گئے ہوئے تھے، کچھ روز کے بعد واپسی میں پیدل چل کر آرہے تھے، راستے میں بستی کا مقبرہ پڑا۔انہوں نے وہاں کھڑے ہوکر ایصالِ ثواب کیا، پھر فرمایا کہ جب میں یہاں سے کچھ روز پہلے گیا تھا تو قبرستان کے اکثر مردوں پر عذاب ہو رہا تھا لیکن آج عجیب معاملہ ہے کہ سب مردوں پر رحمت کی بارش ہو رہی ہے، کسی نے عرض کیا حضرت کوئی نئی بات پیش نہیں آئی۔البتہ چند روز پہلے شہر کے فلاں پرانے حافظ قرآن کی وفات ہوئی ہے۔جنہیں یہاں دفن کیا گیا۔اس پر یہ بزرگ بولے انہی حافظ قرآن کی وجہ سے پورے قبرستان پر رحمت کی بارشیں ہو رہی ہیں۔

مومن کو چاہیے کہ قرآن پاک کی تلاوت کا اہتمام کرے۔اس لیے کہ قرآن

پاک ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کو دیکھنا بھی ثواب، پڑھنا بھی ثواب اور سننا بھی ثواب ہے۔ کلامِ الٰہی کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اس کو سمجھے بغیر پڑھنا بھی ثواب کا باعث ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، قرآن کے ہر حرف کے پڑھنے پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور میں یہ نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف علاحدہ حرف ہے۔ لام علاحدہ حرف ہے اور میم علاحدہ حرف ہے۔ یعنی الم کے پڑھنے پر تیس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ

کی مدنی زندگی کے دواہم پہلو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کے دواہم رخ ہیں، ایک مکی زندگی جونبوت کے تیرہ سالوں پر پھیلی ہوئی ہے اور دوسری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی جودس سال سے کچھ زائد عرصے پر مشتمل ہے۔ مدینہ کی زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلامی دستور حیات کی تفصیلات وحی خداوندی نے بتلائیں اور قرآنی اصولوں کی روشنی میں عبادات، معاملات، معاشرت کی جزئیات سے مطلع کیا گیا۔ مدنی زندگی ہی میں نماز جمعہ فرض ہوئی اور اسی دور میں رمضان المبارک کے روزے فرض کیے گئے، جہاد کی فرضیت مدینہ پہنچنے کے بعد ہی ہوئی، جہاں تک نماز باجماعت اور نماز جنازہ کا تعلق ہے تو مکہ کی زندگی چونکہ مظلومیت اور کسمپرسی کی تھی، اس لیے وہاں کے جابر ماحول میں شعائر اسلام پر کھلم کھلا عمل کرنا دشوار تھا، لیکن مدینے میں اسلام کو خداوند قدوس نے سربلندی عطا فرمائی۔ یہاں پہنچ کر مسجدیں تعمیر کی گئیں جن میں بے خوف وخطر نماز باجماعت ہونے لگی اور جنازوں کی نمازیں کثیر مجمع کے ساتھ بے دھڑک ادا کی جانے لگیں۔ اسی دور میں زکوۃ فرض ہوئی اور اسی دور میں حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشاعت اسلام کے لیے مختلف قبیلوں اور علاقوں کی طرف تبلیغی قافلے روانہ کئے۔

مدینے میں اسلام کو شوکت واقتدار حاصل ہوا تو اسلام کے اصولوں کی تفصیلات وجزئیات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام ومسائل کی شکل میں خدائی حکم کے مطابق پیش فرمایا اور اپنے ارشادات کے ذریعے عملی زندگی کے آداب بتلائے۔

اسی زندگی میں جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی علمی واخلاقی تربیت فرمارہے تھے، وہیں علم واخلاق کی بقاء اور تحفظ کے لیے دفاعی مورچہ بندی بھی فرمارہے تھے۔ مشرکین مکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابیوں اور اسلام کے فروغ سے آتش زیر پا تھے اور آپ کی دشمنی اب زبان درازی سے آگے بڑھ کر تلوار ہاتھ میں اٹھوا رہی تھی۔ چنانچہ کفر اور اسلام کا پہلا معرکہ مدینہ ومکہ کے درمیان میدانِ بدر میں ہوا۔ جہاں اسلام کو سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہترین قیادت میں عظیم الشان کامیابی وکامرانی ملی۔ پھر کچھ عرصے بعد مدینے سے متصل احد کے میدان میں دوسری عظیم جنگ ہوگئی اور جنگِ خندق تو خاص مدینے ہی میں لڑی گئی اور اس کے علاوہ اور جنگیں مدنی زندگی ہی میں پیش آئیں، ان میں کچھ لشکر دور دراز علاقے میں جاکر لڑے اور کچھ جنگوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود شریک نہ رہے بلکہ آپ نے شوریدہ قبائل کی سرکوبی کے لیے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دستے روانہ کئے، اور کئی جنگوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وجودِ بابرکت کے ساتھ خود بھی شریک رہے۔

دوسری طرف اس بات پر بھی غور کرنا ہے کہ مدینہ طیبہ میں جہاں شان وشوکت اور کامرانی نے قدم چومے ہیں، مشرکین مکہ سے بڑھ کر خوفناک دشمن سے بھی سابقہ پڑا ہے، یہ یہودیوں کی قوم تھی جو سازشی اور مکار تھے، ان کی دھوکہ دہی کا مظاہرہ منافقت کی صورت میں ہوا۔ یہودیوں کا ایک گروہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اعلانیہ دشمنی کا اظہار کررہا

تھا۔ جن کی سربراہی کعب بن اشرف جیسے لوگ کررہے تھے۔ دوسری جماعت بغلی چھرا بنی ہوئی تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب ہوکر بظاہر مسلمان بن کر مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ورغلانے کا کام کررہی تھی۔ ان منافقوں کی سربراہی اُبی بن سلول کررہا تھا۔ جو آج تک منافقوں کے سردار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک طرف مشرکین مکہ سے میدانِ جنگ میں لوہا لینا پڑ رہا تھا، یہودیوں کی سازشوں کا بھی ہر وقت سامنا تھا اور دوسری طرف منافقوں کی ریشہ دوانیوں سے بھی ہر وقت سابقہ تھا۔ تو یہ ابتدائی تین دفاعی محاذ تھے جن سے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بیک وقت اپنی اعلیٰ ترین بصیرت وتدبیر اور خدائی اعانت ونصرت کے ساتھ نمٹ رہے تھے۔

چوتھا رخ حیات اقدس ﷺ کا اشاعت اسلام کا اہم ترین فریضہ تھا جس کی ادائیگی صرف عرب کے قبیلوں تک محدود نہیں تھی بلکہ ایک عالمگیر مذہب کے داعی کی حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری بیرونِ عرب بھی اسلامی پیغام کو پہنچانے کی تھی۔ چنانچہ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد جہاں ایک طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تبلیغی وفود عرب کے قبیلے والوں کی خدمت میں دین کا پیغام پہنچارہے تھے۔ وہیں سرکارِ مدینہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم، شاہانِ عجم کو بھی تبلیغی ودعوتی خطوط ارسال فرمارہے تھے۔ چناچہ عیسائی فرمانروا، قیصر روم، مجوسی بادشاہ، کسریٰ فارس، سلطان مصر مقوقس اور افریقہ کے حکمران نجاشی کے نام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد فرامین نبوت لے کر روانہ ہوئے۔ ادھر مدینہ ملک شام کا دروازہ تھا اور شام میں عیسائیوں کی حکومت تھی ان میں ایک طرف رومی نژاد لوگ تھے جو اصلا یورپین تھے، دوسری طرف عیسائی تھے۔ مدینہ منور میں

ایک نئے دین کے داعی کی بڑھتی ہوئی طاقت اور روز افزوں شہرت ومقبولیت کو پڑوسی ملک کے عیسائی تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، بلکہ اس قوت کو تلوار کے زور سے کچل دینے کی تیاریاں بھی شروع کر چکے تھے۔ اس طرح سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کی صف میں ایک نئی اور انتہائی منظّم وطاقتور شہنشاہیت کا مزید اضافہ ہوا۔ جس سے برسرِ پیکار ہونے کے لیے آپ کو مجبور ہونا پڑا۔ یہ چوتھا دفاعی محاذ تھا اور اس کے خطرات کا سد باب کرنے کے لیے بھی آپ کو سیاسی اور جنگی بصیرت استعمال کرنی ضروری تھی، ادھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو خط کسریٰ فارس کے نام گیا تھا، اس پر کسریٰ اس قدر برافروختہ ہوا کہ عرب میں اپنے گورنر کو لکھا کہ (نعوذ باللہ) حضور اکرم کو گرفتار کر کے پابجولاں دربار میں لایا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ایرانی آتش پرستوں کے عرب حلیف بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جاں کے درپے ہوگئے۔

غرض مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی بحیثیت داعی اسلام جتنی کامیابیوں سے ہم کنار ہوئی، اتنی ہی ذمہ داریوں، بے شمار خطرات اور بے شمار سنگین آزمائشوں سے پر نظر آتی ہے۔ اس میں ایک لمحہ بھی چین اور اطمینان کا نظر نہیں آتا۔ مگر اس کے باوجود سرکارِ دو عالم تاجدارِ مدینہ رحمۃ للعالمین شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر عمل، ہر تدبیر، ہر سیاست اور ہر حکمت عملی انتہائی باوقار اور سکون کے ساتھ روبکار ہوئی۔ یہ بے مثال شجاعت اور بے نظیر متانت صرف پیغمبر اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی نظر آسکتی ہے اور ایک نبی کو ہی حق تعالیٰ ایسی منفرد خصوصیات سے نوازتا ہے۔

(مطبوعہ روزنامہ سیاست، میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم نمبر، مورخہ ۱۵ مئی ۲۰۰۳ء)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکیمانہ اسلوبِ تبلیغ

دعوت خواہ کسی بھی چیز کی دی جائے خواہ وہ کسی نظریہ اور عقیدے کی دعوت ہو یا کسی دنیاوی مال ومتاع کے حصول کی دعوت، اپنے اندر اثر انگیزی اور قوتِ تاثیر پیدا کرنے کے لئے داعی میں حکیمانہ ومشفقانہ اسلوبِ تبلیغ کی متقاضی ہوتی ہے، پھر جس چیز کی طرف دعوت دی جارہی ہے، مدعوئین کے لئے وہ چیز جس قدر اجنبی تعجب خیز انوکھی بلکہ متنفر اور نفرت آمیز ہوگی، داعی کو اس اجنبی چیز کی طرف دعوت دینے کے لئے اسی قدر حکیمانہ اسلوب، تدبرانہ طریقہ اور مشفقانہ طرز عمل پیش کرنا ہوگا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عرب کے لق ودق صحرا میں نخلستان میں اسلام کی تخم ریزی کی، اس وقت مذہبِ اسلام اپنے مدعوین کے لئے نہایت اجنبی، تعجب خیز، انوکھا اور نیا مذہب تھا۔ جو نگاہ اسلام کی طرف اٹھتی اس میں استعجابیہ نشان ہوتا جس کسی کو شعائرِ اسلام کی بھنک پڑتی وہ یوں متحیر ومتعجب رہ جاتا گویا زمین پر زمینی نہیں بلکہ کسی اور سیارے کی مخلوق، عجیب وغریب حرکات وسکنات میں مشغول ہو۔

غالباً غزوہ تبوک سے واپسی کا موقع ہے۔ رسول خدا کا دارِ ہجرت مدینۃ النبی قریب آرہا ہے، چند میل کی مسافت رہ گئی ہوگی لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مظفر ومنصور اور فاتح لشکر کو پڑاؤ کا حکم دیا۔ آپ کی عادتِ شریفہ تھی کہ آپ شہر میں رات کو داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ آپ کی کوشش ہوتی کہ دن میں داخل ہوں، ڈیرے ڈال دئے گئے، خیمے نصب کردئے گئے، آس پاس کے گاؤں میں عام شہرہ تھا کہ مدینہ (یثرب) میں ایک نئی قوم پیدا

ہوئی ہے جس کا لشکر ہر جگہ فتوحات حاصل کر رہا ہے، پڑاؤ کی خبر ملی تو آس پاس کے دیہاتی بچے لشکر دیکھنے جمع ہو گئے، ادھر نماز کا وقت آیا ادھر موذن نے باآواز بلند اذان دینی شروع کی، ان بچوں نے کبھی اذان سنی نہ ہوگی اب کی بار اذان سنی تو اس نئی حرکت کو دیکھ کر ان بچوں کو بھی شرارت سوجھی اور موذن کے اللہ اکبر کہنے پر سارے بچے بھی اللہ اکبر اللہ اکبر کہنے لگے۔

بچے کی ذہنی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑوں کی نگاہ میں اونچا بتانے کے لئے بڑوں کی نقل اتارا کرتا ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ عموماً مغرب کی نماز میں امام صاحب سورہ فاتحہ کے ساتھ چھوٹے چھوٹے سورہ پڑھتے ہیں تو جب بچوں کو وہ سورے یاد ہوتے ہیں تو وہ امام سے آگے آگے پڑھنے لگتے ہیں ابھی امام نے قل ہو اللہ احد کہا کہ پیچھے سے بچے کی آواز آتی ہے اللہ الصمد گویا بچہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ مجھے بھی یہ سورہ یاد ہے اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ ادھر امام نے کہا اللہ اکبر ادھر پیچھے سے کسی بچے کی آوازِ بلند گونجتی ہے اللہ اکبر۔

بہر حال رسول اکرم ﷺ کے موذن نے با آوازِ بلند اذان دینی شروع کی تو ان بچوں نے بھی اس کی نقل اتارنی شروع کی۔ سارے بچے ملکر اذان کہیں گے وہ بھی با آوازِ بلند تو ظاہر ہے کہ شور ہو گا ہی۔ رسول اکرم ﷺ نے جب شور کی آواز سنی تو خیمے سے باہر تشریف لائے اور دریافت فرمایا یہ شور کیسا؟ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! موذن اذان دے رہا ہے اور بچے اس کی نقل اتار رہے ہیں حضور اکرم نے فرمایا ''انہیں پکڑ لاؤ''۔ صحابہ پکڑنے کے لئے دوڑے تو بچے بھاگ گئے۔ ابو محذورہ ایک بچے تھے...... بچے کیا...... بچپن کی حدود کو پار کر کے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے انہیں غیرت آئی کہ بھلا میں بھاگ جاؤں! ٹھہر کر دیکھیں کیا ہوتا ہے...... چنانچہ یہ یونہی کھڑے رہے، صحابہ نے انہیں دھر لیا اور حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا آپ نے فرمایا'' تم کیا

کرر ہے تھے' انہوں نے ہمت کی اور کہا '' کچھ نہیں میں اذان دے رہا تھا''۔

''اذان'' گو عملی طور پر فرض نہیں، اس کا شمار سنن میں ہوتا ہے، مگر اذان شعائر اسلام اور اسلام کی نشانیوں میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجاہدین صحابہ کو حکم دے رکھا تھا کہ ''جب کسی بستی پر حملہ کرنا ہو تو پہلے اس بستی کے باہر رک کر وقتِ اذان کا انتظار کرو۔ اگر بستی سے اذان کی آواز آئے تو وہ مسلمانوں کی بستی ہوگی اذان کی آواز نہ آئے تو اس بستی والوں پر حملہ کردو''۔ (طحاوی)

حضورِ اکرم ﷺ نے ابو محذورہ سے فرمایا ''اچھا اب اذان دو'' انہوں نے دھیمی آواز میں کہا اللہ اکبر اللہ اکبر آپ ﷺ نے فرمایا ''زور سے کیوں نہیں کہتے'' انہوں نے زور سے کہا اللہ اکبر اللہ اکبر (جیسے موذن اذان میں کہتا ہے) آپ نے فرمایا...... ''اچھا آگے کہو''

اذان میں اس کے بعد **اشھد ان لا الہ الا اللہ** ہے اس کا اقرار گویا توحید کا اقرار ہے ابو محذورہ نہ ہی اتنے چھوٹے بچے تھے کہ توحید کے مفہوم سے ناآشنا ہوتے نہ ہی ہماری طرح عربی زبان سے ناواقف۔ بہر حال حضور ﷺ کے اصرار پر دھیرے دھیرے کہا **اشھد ان لا الہ الا اللہ**۔ حضور نے فرمایا زور سے کہو۔ انہوں نے زور سے کہا **اشھد ان لا الہ الا اللہ**۔

حضور ﷺ نے فرمایا ''آگے بڑھو''۔ آگے ''**اشھد ان محمدا رسول اللہ** تھا ......یہ تو اصل نزاعی مسئلہ تھا...... اسلئے کہ توحید کے قائل کسی نہ کسی درجے میں تو سارے اہل عرب ہی تھے، بالکل انکار کسی کو نہ تھا، کہتے تھے، خالق و مالک تو ایک ہی ہے، البتہ اس نے اپنا فلاں اختیار فلاں کو دے رکھا ہے اور فلاں فلاں کو۔ کوئی بارش کا خدا ہے تو کوئی آگ کا، کوئی روزی کا ہے تو کوئی اولاد کا۔ اسی لئے جب مشرکین مکہ حج کو جاتے تو ان کا تلبیہ ہوتا **لبیک اللھم لبیک لا شریک لک الا شریکا ھو لک** " اے اللہ میں تیرے پاس حاضر ہوں۔ تیرا

کوئی شریک نہیں ہاں البتہ وہ تیرا شریک ہے جسے تو نے خود اپنا شریک بنا رکھا ہے"۔ خلاصہ یہ کہ توحید کو تو کسی نہ کسی درجے میں مانتے تھے مگر رسالت تمام جھگڑے کی جڑ تھی، رسالت کو ماننے کا مطلب یہ تھا کہ اپنے تمام ان عقائد ونظریات کو جو باپ داداؤں کے زمانے سے چلے آرہے تھے یکسر بھلا دینا۔ بھلا انہیں یہ کب گوارا ہوسکتا تھا۔ لیکن یہاں ابومحذورہ برے پھنسے......

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا " آگے چلو، آگے کے الفاظ کی نقل اتارو"۔ ابومحذورہ نے ہلکے سے کہا۔ **اشھد ان لا الہ الا اللہ** بس پھر کیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشفقانہ طرز عمل اور حکیمانہ اسلوب تبلیغ سے نقل اتارتے اتارتے اصل حقیقت ابومحذورہ کے گوشۂ دل میں جاگزیں ہوگئی انھوں نے بآواز بلند اذان پوری کردی۔

آپ نے فرمایا "ٹھیک ہے، جاؤ" انہوں نے بزبانِ حال عرض کیا "حضور والا اب کہاں جاؤں اب تو میں آپ کا غلام بن چکا ہوں اسلام کی حقیقت میرے دل میں رچ بس گئی ہے۔

جو اسلام کل کو اجنبی تھا، اجنبیت کے ماحول میں جی رہا تھا، وہ آج بھی اسی غربت کا شکار ہے، اپنوں ہی کے درمیان اس اجنبی غریب کا کوئی پرسان حال نہیں۔ آج رسول اکرم ﷺ کی یہ پیشین گوئی پوری ہوتی نظر آرہی ہے **بَدَأَ الاِسْلَامُ غَرِیْباً وَسَیُعُودُ کَمَا بَدَأَ غَرِیْباً فَطُوْبیٰ لِلْغُرَبَاءِ (رواہ مسلم ، رقم الحدیث ۳۸۹)** اسلام نے اجنبیت کے ماحول میں آنکھیں کھولیں پھر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ پھر وہ دوبارہ اجنبیت کے دوراہے پر ہوگا، خوشخبری ہے ان نیک بختوں کے لئے جو اس پرآشوب زمانے میں اسلام کی راہ پر چل کر اجنبیت کا شکار ہوں۔ آج ہمیں اسی اجنبیت کے ماحول میں جی کر مشفقانہ طرز عمل اور حکیمانہ اسلوبِ تبلیغ اپنانے کی ضرورت ہے۔

(مطبوعہ روزنامہ سالار میلاد النبی نمبر ۱۴۳۰ھ)

سیرت رسول ﷺ

قول وعمل میں مطابقت کا اعلیٰ نمونہ

خالق کائنات نے ہر دور میں انسانوں کی رہبری ورہنمائی کے لیے انبیاء ورسل بھیجے جو انسانوں کے خیر خواہ، سچے ہمدرد اور حقیقی محسن تھے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی انسانوں کی بھلائی اور خیر خواہی میں گزاری۔ انہیں زندگی گزارنے کا طریقہ سکھایا، فلاح ونجات کا نہ صرف راستہ بتایا بلکہ خود اس پر چل کر دکھلا دیا۔ اور اپنے کردار وعمل اور اخلاق کا نمونہ اس جہاں کے سامنے پیش کر دیا۔ جو لوگ ان کی رہنمائی میں سیدھے راستے پر چلتے ہیں وہ کامیاب وکامران ہوئے اور جو اس سے روگردانی کرتے ہیں وہ ناکام ونامراد ہوئے۔

سب سے آخر میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، رحمت عالم اور ہادی عالم بنا کر بھیجے گئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رب العالمین نے تا قیام قیامت انسانوں کے لیے رہبر اور صلاح ورشد کا نمونہ بنایا۔ اور آپ کے ذمہ یہ کام کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کی کشتی کو زندگی کے منجھدار میں صحیح چلانے کا طریقہ کار بتائیں، اس کے لیے خود آپ کی حیات طیبہ کے سب پہلو زندگی کے صحیح رخ کو سمجھنے کے لیے بطور نمونہ اور ذریعہ تعلیم وتربیت رکھے گئے۔ رب العالمین کی طرف سے جو ہدایات بندوں کی صلاح وفلاح کے لیے نازل کی جاتیں ان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام محض حکم پہونچا دینا نہیں تھا بلکہ آپ حالات اور ضروریات کے لحاظ سے ذاتی عمل وکردار سے اس کو واضح فرماتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اپنے اصحاب

کے ساتھ مشفقانہ ومربیانہ ہوا کرتا تھا، انہیں تعلیم وتربیت دینے کے لیے آپ اپنے عمل کو ان پر پیش کرتے ، جس کا اثر صحابہ کرام پر فوری اور زور دار ہوا کرتا، وہ دل وجان سے آپ ﷺ کی تابعداری کرتے ، آپ پر نثار ہوتے ، اور آپ ﷺ کے اشاروں پر چلتے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت اور آخری ضابطہ حیات کے طور پر جو کتاب (قرآن مجید) نازل کی ، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم پر صرف یہی احسان نہیں کہ انہوں نے خدا کی اس کتاب کو خدا کے بندوں تک پہونچادیا۔ بلکہ آپ نے اس کے ایک ایک حکم پر بذات خود اپنا عملی نمونہ امت کے سامنے رکھ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب صحابہ کی ایک جماعت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفیق حیات اور چہیتی بیوی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ مبارکہ کے بارے میں معلوم کرنا چاہا تو آپؓ نے وہ بلیغ جملہ ارشاد فرمایا جو کتب حدیث وسیر میں منقول ہے کہ: کَانَ خُلُقُهُ القُرآن (ابوداؤد) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق بعینہ قرآن تھے، آپ کی حیاتِ مبارکہ قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے، آپ کے اسوۂ حسنہ کے لیے یہی بات بہت کافی وشافی ہے کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل شدہ آخری کتاب قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مستقل اعلان فرمادیا ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَن كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْراً ۔(تمہارے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بہترین نمونہ ہے، یہ ہر اس شخص کے لیے ہے جو اللہ کے فضل وکرم کی امید وتوقع رکھتا ہے، اور آخرت اور حساب کے دن سے امید قائم کرتا اور اللہ کو خوب یاد کرتا ہو)

آج دنیا اپنی تمام تر رعنائی، دلکشی، اور ترقی کے باوجود ایک اضطراب وبے قراری اور بے چینی کی کیفیت سے دوچار ہے، ظاہر چمک دمک کا ایک دردناک پہلو یہ ہے کہ باطن کی دنیا تمام تر تاریک ہے، مادہ پرستی کی نحوست اہل دنیا کو اپنے آپ سے کورا اور اندھا بنائے ہوئے ہے۔ دنیا نے

سکون وراحت کے لیے مختلف مذاہب اور تہذیبوں کی آڑلی، ہر گوشہ کو اس امید کے ساتھ دیکھا کہ شاید یہاں سکون وراحت میسر ہو لیکن انہیں کیا معلوم کہ سکون واطمینان تو خالق کائنات کے بتائے ہوئے نظام حیات میں ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں ہے، آپ کا اسوۂ حسنہ ہماری حیاتِ مستعار کے نکھار، شخصیت کی تعمیر اور مقصد حیات کی تکمیل کا ضامن ہے۔

آپ کی سیرت کے گونا گوں اور عظیم گوشوں میں سے ایک نمایاں گوشہ، اور روشن تابناک پہلو یہ ہے کہ آپ کے اقوال واعمال میں مکمل مطابقت تھی، ایمان ویقین، توحید ومعرفت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد ایثار وقربانی، صبر وشکر، عزم واستقلال، حسن اخلاق غرض ہر صفتِ محمود جس کی آپ نے تعلیم وتبلیغ فرمائی اس کے لیے سب سے پہلے آپ نے اپنا ہی نمونۂ عمل پیش فرمایا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تڑپ اور فکر اس بات کی ہوا کرتی تھی کہ کس طرح بندگانِ خدا کو جہنم کی آگ سے بچایا جائے اور جنت کی طرف لے جایا جائے یہ بھی آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوہ مبارکہ کا ایک اہم اور نمایاں پہلو ہے، خود قرآن کریم نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے **لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَفْسَکَ عَلَی آثَارِهِمْ اِنْ لَمْ یُؤْمِنُوا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفاً** (اچھا تو اے نبی شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائیں)

ہر بڑے مقصد اور عظیم امر کے لیے اخلاقی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے بغیر کامیابی کا تصور اور فلاح کی امید نہیں کی جاسکتی، آپ کی سیرت کا ایک تابناک اور تابندہ پہلو یہ بھی ہے کہ آپ اخلاق وکردار کے اعلیٰ نمونہ اور بلند اور بالا مقام پر فائز تھے، قرآن مجید نے فرمایا: **اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ** بیشک آپ اخلاق کے بڑے مرتبے پر فائز ہیں۔ آپ کے

اخلاق کریمانہ کا اعتراف آپ کے دشمنوں کو بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ باوجود عناد اور دشمنی کے انہوں نے آپ کو صادق اور امین کے لقب سے ملقب کیا تھا، اور اپنی امانتیں آپ ہی کے پاس رکھوایا کرتے تھے، جب آپ ﷺ نے ان دشمنوں کے ظلم وزیادتی سے مجبور ہو کر اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے مدینہ طیبہ ہجرت کا ارادہ کیا تو اپنے چچیرے بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے پیچھے مکہ میں چھوڑ دیا کہ وہ پہلے آپؐ کے پاس جمع شدہ تمام امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالے کردیں پھر خود بھی ہجرت کر کے مدینہ آجائیں۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد جب مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی ریاست کا آغاز ہوا، دستورِ الٰہی کے عملی نفاذ کی راہ ہموار ہوئی اور مدینہ طیبہ اس ریاست کا پایہ تخت قرار پایا، تو یہ پایہ تخت اور ایوانِ حکومت، کیسا تھا؟ اس کے شب وروز کیسے تھے؟ یہاں کے دربار کا عالم کیا تھا، اس کی ایک دلکش منظر کشی حضرت مولانا مناظر حسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی البیلی کتابِ سیرت ''النبی الخاتم'' میں اس طرح فرمائی ہے:

''پھر کیا مدینہ میں جو پایہ تخت قائم ہوا، وہاں منبر کی جگہ تخت بچھایا گیا؟ وہی منبر ہے ......وہی مسجد ہے......وہی جھونپڑے ہیں......وہی چمڑے کا اکہرا گدا ہے......نہ حاجب ہیں نہ دربان ہیں......امیر بھی آتے ہیں اور غریب بھی آتے ہیں......دونوں کے ساتھ ایک معاملہ ہے......عجب دربار!!

سلاطین کہتے ہیں: شاہی دربار تھا کہ......فوج تھی......علم تھا...... پولیس تھی...... جلاد تھے......محتسب تھے...... گورنر تھے......کلکٹر تھے......منصف تھے......ضبط تھا...... قانون تھا۔ مولوی کہتے ہیں: مدرسہ تھا...... درس تھا...... وعظ تھا......افتاء تھا...... قضاء تھا......تصنیف تھی...... تالیف تھی......محراب تھا......منبر تھا۔ صوفی کہتے ہیں خانقاہ تھی

کہ......دعا تھی ......جھاڑ تھا...... پھونک تھا......ورد تھا...... وظیفہ تھا...... ذکر تھا......شغل تھا......تحنث (چلہ کشی) تھا......گریہ تھا......وجد تھا......حال تھا......کشف تھا......کرامت تھی......فقر تھا......فاقہ تھا......زہد تھا......قناعت تھی۔

مگر سچ تو یہ ہے وہ سب کچھ تھا اس لیے کہ وہ سب کے لیے آیا تھا، آئندہ جس کو کسی کو چلنا تھا، جہاں کہیں چلنا تھا، جس زمانے میں چلنا تھا؛ اسی روشنی میں چلنا تھا" (النبی الخاتم ص ۱۰۱)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس خلق عظیم پر فائز تھے، دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر تھے، اور آپ کے یہ اخلاق حسنہ آپ کی فطرتِ شریفہ کا خاصہ تھے، یہی وجہ ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کے اخلاقِ حمیدہ کا تذکرہ سن کر آپ سے نکاح کا جو ارادہ ظاہر کیا وہ نبوت کے بعد بلکہ نہیں نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے۔ نیز جب اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو غار حرا میں نبوت ورسالت کی زینت بخشی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی ہیبت وجلال سے خوفزدہ اپنے گھر پر پہونچے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو ان الفاظ سے تسلی دی تھی:

(آپ فکر نہ کریں) خدا کی قسم، خدا آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا، کیونکہ آپ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، (ایک روایت کے مطابق) امانتیں ادا کرتے ہیں، بے سہارا اور لاچار لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں۔ (بخاری شریف)

آپ کے اوصاف حمیدہ کا ذکر بھلا مجھ سے کیا ہو، کلکِ ناتواں اپنی اتنی جسارت پر از حد شرمندہ ہے۔ خدا ہمیں آپ کی سنتوں کو جان جان کر عمل کرنے کی توفیق دے اور نمائش اور محض قول سے اجتناب کرتے ہوئے اپنے اعمال کو سدھارنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

مفکر اسلامؒ کی رحلت پر

معین قاضی مرکزی دارالقضاء کا اظہار تاثر

محمد ہارون رشادی معین قاضی مرکزی دارالقضاء ، امارت شرعیہ کرناٹک ، دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور نے کہا: ''مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے سانحۂ ارتحال کی جان کاہ خبر دل کو دہلا گئی۔ حضرت مفکر اسلام کی ذات گرامی ملت اسلامیہ ہند کے لیے خصوصاً اور عالم اسلام کے لیے عموماً ایک عظیم انعام خداوندی تھی، آپ کی ہستی ایک شجرۂ سایہ دار کی حیثیت رکھتی تھی ۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت کو اعلیٰ علیین میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور امتِ مسلمہ کو حضرت کا نعم البدل عطا فرمائے۔

مطبوعہ روزنامہ سیاست مورخہ 02/01/2000

بڑے حضرت کی بڑی ادائیں

یہ دنیا اپنے اندر عجب رنگ و بو لیے ہوئے ہے، اس کی نیرنگیوں کا کیا کہنا اب یہی دیکھ لیجئے کہ بعضے حضرات زندگی ایسی گزارتے ہیں کہ ان کی وفات پر تعزیتی پیغام یا مقالہ لکھنا ہو تو الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر، لغات چھان پٹک کر، تعریفی کلمات تلاش کر کر کے، ایک مضمون تیار کرنا پڑتا ہے۔ اور بعض ایسے کہ قلم ہاتھ میں لیا اور ان کی یادیں، ان کی باتیں، ان کی ادائیں، ان کی مہربانیاں، ان کی نوازشات، ان کے انعامات، ان کے احسانات، ان کے فرمودات، اور ان کے ارشادات ذہن کے چٹیل میدان پر ایسے مسلسل اور پیہم برسنے لگتے ہیں گویا صحراء میں موسلا دھار بارش کا سماں بندھ جاتا ہے۔ آج اس ارادہ سے قلم لے کر بیٹھا کہ بڑے حضرتؒ کے بارے میں کچھ لکھوں، کچھ لکھوں کیا بلکہ بقول شیخ الملت حضرت علامہ اماںؒ

بڑی مدت سے تھا یہ دل میں ارماں
کہ کرلوں مغفرت کا اپنی ساماں

اپنی مغفرت کا سامان بہم پہنچا لوں تو بڑے حضرت کی باتیں بلکہ خود بڑے حضرت اس طرح دل و دماغ پر چھائے کہ قلم اپنی سست روی اور تنگ دامنی کی شکایت کرتا محسوس ہوتا ہے۔ سوچتا ہوں کاش کوئی سائنس داں ایسا قلم ایجاد کرے کہ آدمی جو کچھ سوچتا ہے، جتنا کچھ یاد کرتا ہے، وہ قلم اسی رفتار سے اسے ضبطِ تحریر میں لاتا رہے۔ دل بڑے حضرت کی یادوں میں کھویا رہے، ادھر قلم صفحات کے صفحات سیاہ کرتا چلا جائے۔

یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

کسی نے بہت خوب کہا ہے ''مشک آنست کہ خود بوید نہ کہ عطار بگوید'' اصلی مشک اپنے وجود کی خبر خود دیتا ہے۔ اگر آپ دیکھتے ہیں کہ عطار مشک پیش کرنے کے بعد اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگے، محاسن وفوائد کا طومار باندھنے لگے، تو آپ خود سمجھ جائیں کہ یہ سرے سے مشک ہی نہیں، یا مشک تو ہے مگر اصلی نہیں۔ یہی حال بڑے حضرت علیہ الرحمۃ کا ہے، بخدا مجھے بڑے حضرت کے بارے میں از خود کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی عطر بداماں زندگی اپنے بارے میں خود خبر دے گی۔ اپنی عظمت کا اعتراف خود کروالے گی، اپنی وقعت دلوں میں خود بٹھادے گی۔ بس آپ پڑھیے اور پڑھتے چلے جائیے، سنیے اور سنتے چلے جائیے۔

اللہ سے ہونے کا یقین

''حضرت میں ایک مدرسہ شروع کرنا چاہتا ہوں''

یہ جملہ ایک مولوی صاحب نے جو حضرت کے شاگرد اور سبیل الرشاد کے فارغ التحصیل تھے، حضرت کی خدمت میں عرض کیا۔

یہ کوئی انوکھا واقعہ یا بڑے حضرت کے لیے کوئی نیا اور عجیب سا جملہ نہ تھا، کرناٹک کے وادئ غیر ذی زرع میں اللہ تعالیٰ نے دینی علوم کی آبیاری کے لیے بڑے حضرتؒ کا انتخاب عالم بالا میں طے کر دیا تھا۔ آپ آئے، اور کرناٹک میں آپ کی آمد تھی کہ مساجد اور مدارس کی نئی فصل جنم لینے لگی، ایسے لوگ جنہیں دنیا کے کسی عہدہ کے قابل نہ سمجھ کر موذن بنادیا جاتا، سرکاری عہدوں سے ریٹائر ہو چکے بوڑھوں کو کچھ اور نہ کر سکنے کی بنا پر امام بنادیا جاتا، ق اور ک کے صرف چھوٹا اور بڑا ہونے کا فرق بتانے والوں کو مدرسِ مکتب بنادیا جاتا......نکال نکال کر متدین عالم دین کو امام بنایا جانے لگا، مستند حافظ کو موذن بنایا جانے لگا اور ماہر عالم کو مدرسِ مکتب کی مسند سونپی جانی لگی۔ فارغانِ سبیل الرشاد موقع موقع سے آتے کہ

''حضرت فلاں مقام پر میں نے اہل محلّہ کی کوشش سے مسجد کی تعمیر کا بندوبست کیا ہے، آپ سنگِ بنیاد رکھ دیں''

''حضرت! تعمیر مسجد کا کام پورا ہو چکا ہے، آپ افتتاح فرما دیں''

''حضرت میں نے فلاں مسجد میں مکتب شروع کیا ہے، آپ بسم اللہ خوانی کرا دیں''

''حضرت میں نے ایک مدرسہ شروع کیا ہے آپ دعا فرمائیں''

بس اسی طرح کے کوئی رشادی عالم تھے جو یہ کہہ رہے تھے:

''حضرت میں ایک مدرسہ شروع کرنا چاہتا ہوں''

یہاں واقعے میں آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں یہ خیال بھی ضرور کر لینا چاہیے کہ یہ آج کل کا زمانہ نہیں تھا کہ مدارس کی کثرت کے باوجود استقبال مدارس ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب مدرسہ شروع کرنے کا مطلب عیش و راحت کو قربان کر کے تنگی و جفاکشی کو گلے لگانا تھا۔ جو لوگ مدارس اور اس کے ماضی و حال سے واقف ہیں وہ میرے اس تجزیہ کی ضرور تائید کریں گے۔

بڑے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جب مولوی صاحب نے کہا کہ وہ ایک مدرسہ شروع کرنا چاہتے ہیں۔ بڑے حضرت مسکرائے، فرمایا: ''اللہ کی ذات سے ہونے کا یقین رکھتے ہوئے اللہ سے مدد مانگو''

''مانگتا تو ہوں حضرت'' مولوی صاحب نے کہا۔

لیکن مانگنے مانگنے میں بڑا فرق ہے، اور مانگی جانے والی چیزیں بھی الگ الگ۔

چیز چھوٹی ہو تو مانگ چھوٹی ہوتی ہے۔

چیز بڑی تو مانگ بڑی۔

اور مانگنے کا ڈھنگ بھی الگ۔

بڑے حضرتؒ کو مانگی جانے والی چیز کی عظمت کا خیال تھا۔ فوراً فرمایا:

’’سب مانگتے وقت مانگے تو کیا فائدہ جی۔ سب سو رہے ہوں اس وقت مانگو‘‘۔

ٹال مٹول اور سستی سے کام لینے والے نفس کو بہلانے پھسلانے اور قیام اللیل پرآمادہ کرنے کے لیے اس قدر سادگی سے کہا گیا جملہ کیا کچھ اثر کر گیا ہوگا۔

خشوع وخضوع

مغرب کی نماز ہو رہی تھی بڑے حضرتؒ تحتانی مسجد میں تھے، وابستگانِ سبیل الرشاد جانتے ہیں کہ یہاں کی مسجد میں امام فوقانی مسجد میں ہوتا ہے، امام نے قرأت ختم کی اور رکوع میں جارہے تھے کہ نیچے سے بڑے حضرت کی بارعب آواز آئی ’’امام صاحب، نماز دوبارہ پڑھاؤ۔ نماز فاسد ہوگئی‘‘۔

معلوم ہوا کہ امام صاحب نے سورہ بینہ میں خیر البریہ کی جگہ شر البریہ پڑھ دیا ہے۔ زَلۃ القاری کے مسائل پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ اگر امام صاحب نے کسی آیت کی اس طرح تلاوت کی کہ اس کا مفہوم بالکل برعکس نکل گیا، اور آیت میں جو بات کہی جارہی ہے اس کے بالکل برعکس مطلب ہوگیا۔ اور امام نے آیت کو دوبارہ صحیح نہ پڑھا بلکہ ویسے ہی آگے بڑھ کر رکوع کرلیا تو نماز جاتی رہے گی۔

مسائل اپنی جگہ، مگر فوری طور پر ان پر عمل درآمد اسی کے بس کی بات ہے جو ان کا استحضار رکھتا ہو۔ نماز میں خشوع وخضوع حاصل ہو۔ ورنہ تو ظہر کی چار رکعتوں میں چار دکانوں کا حساب کرنے والے کا واقعہ ہم سنتے سناتے چلے آئے ہیں۔

بڑپن

کتابوں میں ہم نے پڑھا ہے

نہد شاخِ پرمیوہ سر بر زمیں

اور خود ہمارا تجربہ ہے کہ میوے سے لدی شاخ عجز وانکساری سے اپنا سر زمین پر

رکھ دیتی ہے اور خالی بانس اپنے آپ کو اکڑائے رہتا ہے۔ بڑے حضرتؒ کو ہم نے کبھی نہیں سنا کہ آپ نے کسی کی دل آزاری کی ہو نہ اپنے عمل سے نہ اپنی زبان سے۔ آپ کا طرز خطاب ہر ایک سے محبت بھرا اور اپنائیت والا ہوتا، چاہے وہ مدرسے کے استاذ ہوں، چاہے رقیب صاحب ہوں، چاہے مدرسے کے بچے۔

''مولوی صاحب''

''رقیب صاحب''

''ادھر آؤ بابا''

''ادھر آؤ میاں''

''کیوں جی! نماز کو آنے ہوتا نہیں''

میرے قلم میں یہ طاقت نہیں کہ آپؒ کے لب ولہجہ کی شیرینی کو، مٹھاس کو، حلاوت کو، کیف وسرور کو سپردِ قرطاس کر سکے۔

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اب تک میں نے جو واقعات سپردِ قلم کیے وہ 'عَنْعَنَہٗ' کی قبیل سے تھے۔ لیجئے اب رأیتُ اور سمعتُ کے درجے کی چیز پیشِ خدمت ہے۔

''حضرت میں ایک سال کے لیے جماعت میں جانا چاہتا ہوں''

راقم السطور نے ڈرتے ڈرتے حضرت کی خدمت میں اجازت طلب کی۔

اور اس ''ڈرتے ڈرتے'' کی بھی ذرا وضاحت ہو جائے تو مناسب ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب میں دار العلوم سبیل الرشاد میں بحیثیت ناظم کتب خانہ خدمت انجام دے رہا تھا۔ ایک طرف والد ماجد کی خواہش اور خود اپنا بھی ارادہ کہ ایک سال اللہ کی راستے میں لگایا جائے۔ لیکن دوسری طرف یہ ڈر کہ اس ارادہ کو ''مفوضہ خدمت سے راہِ فرار'' نہ خیال

کرلیا جائے۔

خیر تو میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا:

''حضرت میں ایک سال کے لیے جماعت میں جانا چاہتا ہوں''

یہ سننا تھا کہ بڑے حضرت کے چہرے پر سارے جہاں کا نور اتر آیا، مسکرائے۔

فرمایا: ''بہت بڑا اور اونچا کام ہے، نبیوں والا کام، ہر عالم کو ضرور کرنا چاہیے''۔

پھر وہ خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا جو ابھی تک کانوں میں رس گھول رہا ہے:

''مولوی صاحب! اگر تمہاری طرف سے ایک آدمی بھی ہدایت کے راستے پر آجائے تو تمہاری نجات کے لیے یہی کافی ہے۔ جاؤ میں دعا کرتا ہوں''

مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہی فرمایا تھا

فَوَ اللّٰہِ لَاَنْ یَھْدِیَ اللّٰہُ بِکَ رَجُلاً وَاحِداً خَیْرٌلَکَ مِنْ اَنْ یَکُوْنَ لَکَ حُمْرُ النَّعَمِ (صحیح البخاری ۳۷۰۱)

بے نفسی

اللہ تعالی نے ناچیز کو توفیق بخشی کہ عمر کی اس منزل میں جب بڑے حضرتؒ چلنے پھرنے میں دشواری محسوس کرتے تھے، بندہ حضرت کے آٹو رکشا کا ڈرائیور بن کر حضرت کو شہر لے جایا کرتا۔ حضرت کو نماز کے لیے گھر سے آنا ہوتا تو ہم خادمان حاضر ہو جاتے اور وہیل چیر پر بٹھا کر حضرت کو گھر سے مسجد لے آیا کرتے۔ بارہا ایسا ہوا، اور بارہا ہوا جبھی تو یاد ہے کہ جب میں حضرت کو مغرب کے بعد گھر وہیل چیر پر لے جا کر گھر پہونچا دیتا تو حضرت گھر میں داخل ہوتے وقت فرماتے

''مولوی صاحب، عشاء کو لینے آنے ہوتا کیا''؟

میری کیا مجال کہ حضرت مجھے حکم دیں اور میں سرپٹ بھاگا چلا نہ آؤں۔ مگر یاد نہیں پڑتا کہ حضرت نے کبھی حاکمانہ انداز میں ''عشاء کی نماز کو بھی لینے آؤ'' فرمایا ہو، ہمیشہ یہی فرماتے ''عشاء کو لینے آنے ہوتا کیا''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے **لا یدخل الجنة احد فی قلبه مثقال حبة من خردل من کبر** (رواہ مسلم، مشکوٰۃ ص۴۳۳) کہ جس کے سینے میں رائی کے دانے کے برابر بھی کبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا، 'رائی کے دانے کے برابر بھی کبر نہ ہونا' کسے کہتے ہیں، یہ ہمیں بڑے حضرت کے طرزِ عمل سے سمجھ میں آیا۔

آپ کا یہ عمل بھی ہم نے بارہا مشاہدہ کیا کہ دفتر سے گھر جاتے ہوئے، کلاسوں سے گذرتے، کسی کلاس میں استاذ کو موجود نہ پاتے، پوچھتے، حضرت کہاں ہیں۔ معلوم ہو جاتا استاذ رخصت میں ہیں، تو سیدھے جوتیاں اتار کر کلاس میں داخل ہوتے اور متعلقہ کتاب کا سبق پڑھا دیتے۔ کبھی یہ خیال دل میں نہ آتا کہ میں مدرسے کا مہتمم ہو کر چھوٹے اساتذہ کی کتابیں کیونکر پڑھاؤں۔

ہمت مرداں

''حضرت، اطلاع ملی ہے کہ کسی نے ہمارے مدرسے میں بم رکھ دیا ہے''

یہ اطلاع رقیب صاحب نے حضرت کو دی۔ اور یہ سنیے کہ کس وقت دی۔

بڑے حضرت کا معمول تھا کہ مغرب کے بعد جب طلبہ سورہ واقعہ وملک کی تلاوت سے فارغ ہو کر اٹھتے تو آپؒ خود اجتماعی دعا فرماتے۔ ابھی طلبہ نے تلاوت ختم کی تھی اور قرآن مجید الماریوں میں رکھ کر بڑے حضرت کے گرد جمع ہو رہے تھے کہ یہ بھیانک

خبر رقیب صاحب نے بآواز بلند سنادی۔

'بم' کا لفظ سن کر اچھے اچھوں کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں، اَن دیکھی موت مرنا بھلا کون پسند کرے گا۔

بڑے حضرتؒ نے رقیب صاحب کی بات سنی، اک شکن چہرے پر نہیں، ہنس کر فرمایا: جاؤ جی، کچھ بھی نہیں ہوتا، جاؤ''۔

آج مدرسے کو پچاس سال ہونے آرہے ہیں۔ بم تو دور کی بات، کیا کسی کو معلوم ہے کہ سبیل الرشاد میں ایک پٹاخہ بھی پھوٹا ہے؟؟؟

خدا تا قیامت مدرسے کو نظر بد سے بچائے۔ آمین

روشناسی

ہم لوگ دورۂ تفسیر وحدیث کے طالب علم تھے اور مدرسے کی جانب سے ہمارے لیے ماہانہ وظیفہ دیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت کچھ زیادہ بیمار ہوگئے۔ دو ماہ بعد کچھ شفایابی ہوئی تو درس میں تشریف لائے۔ چونکہ آپ دو ماہ سے نہیں آئے تھے لہٰذا ان دو مہینوں کا ہمارا وظیفہ بھی نصیب نہ ہوا تھا، وظیفہ دیتا کون، اس کے لیے حضرت کی اجازت کی ضرورت تھی، آپ کے درسگاہ میں آنے سے قبل ہم ساتھیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ پہلے حضرت کی مزاج پرسی کریں گے، اس کے بعد آہستہ سے وظیفہ کی بات کریں گے۔

حضرت تشریف لائے۔ ہم نے مزاج پرسی کی۔

چلیے یہ کام تو ہوا، اب وظیفہ کے بارے میں بات کرنا تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ بات کرے کون؟ بھلا کسے ہمت تھی کہ حضرت سے وظیفہ پوچھتا۔ ہم آپس میں کانا پھوسی کرر ہے تھے، اور اشارے کرر ہے تھے کہ یہ بات تم کہو، تم کہو، اتنے میں بڑے حضرت

نے خود فرمایا: اچھا آپ لوگوں کو دو ماہ کا وظیفہ نہیں ملا ہے نا؟ جاؤ منشی صاحب کو بلاؤ‘‘
یہ فرمایا اور فوراً منشی صاحب کو بلوا کر دو ماہ کا وظیفہ جاری کر دیا۔

اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے ۔ ایسے تھے ہمارے بڑے حضرت ،علیہ الرحمۃ والرضوان ۔

(مطبوعہ ’تذکار بڑے حضرت‘، مرتبہ حکیم الملت امیر شریعت قبلہ دامت برکاتہم)

بڑے حضرت

رئیس العلماء شاہ ابوالسعود احمد نور اللہ ضریحہ

ولادت: حضرت والا کی ولادت اپنے ددھیال بلنجپور ضلع شمالی آرکاٹ میں بتاریخ ۱۱؍ربیع الاول ۱۳۲۹ھ بروز دوشنبہ کو ہوئی۔ بلنجپور سے مغرب کی جانب تقریباً دس کلو میٹر کی مسافت پر ایک بستی پلی کنڈہ ہے جو آپ کا ننھیال ہے۔

آباؤ اجداد: آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی حضرت مولانا حافظ الحاج عبدالستار صاحب تھا، دادا حضرت مولانا حافظ محمد ابراہیم صاحب، اور پردادا حضرت مولانا حافظ محمد لبے صاحب میل پالیم تھے۔

تعلیم اور خدمات: ۔ بڑے حضرت کی مکمل تعلیم ملک کی مشہور دینی درس گاہ مدرسہ باقیات الصالحات ویلور میں ہوئی، ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ تعلیم کے آخری سال جب بیضاوی کا درس شروع ہونے والا تھا تو استاذ محترم مولانا عبدالرحیم صاحب نے فرمایا کہ تمام طلبہ عمامہ باندھ کر درس میں آئیں، چنانچہ اس دن سے جو سلسلہ آپ نے عمامہ باندھنے کا شروع فرمایا بحمد اللہ تمام حیات جاری رہا۔ باقیات الصالحات سے فراغت کے موقع پر اعلیٰ حضرت ثانی مولانا ضیاء الدین احمد صاحبؒ نے حضرت کو بلا کر فرمایا کہ ڈسٹرک بورڈ نیلور میں اردو منشی کی ضرورت ہے، تم وہاں چلے جاؤ، سرکاری تنخواہ ہوگی اور شہری اہل ثروت ہونے کی بناء پر اچھے معاون ثابت ہوں گے، اسی موقع پر اسلامیہ ہائی اسکول میل وشارم کے لیے مدرس دینیات کی دعوت ملی، بڑے حضرت نے

دینی جذبے کے تحت اس غیر سرکاری اور کم تنخواہ والی ملازمت کو ترجیح دی اور اپنے استاذ محترم سے معذرت فرمالی۔

تبلیغ اسلام :اسلامیہ ہائی اسکول میل وشارم کی تدریس کے زمانے میں (ملک کی آزادی سے پہلے) اسکول کے چند شاگردوں کو اپنے ہمراہ لے کر شام کے وقت غیر مسلموں کے محلوں میں جاتے، ایک طرف مردوں کو اور دوسری طرف پردے کے ساتھ عورتوں کو بٹھا کر اسلام کے فضائل اور آخرت کی زندگی کے بارے میں تقریر فرماتے، اور اسلام قبول کرنے کی ترغیب دیتے۔ بڑے حضرت نے ایک مرتبہ فرمایا کہ تقریر کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سارے ہی لوگ مسلمان ہو جائیں گے، مگر پھر وہ لوگ تذبذب اور تردد میں مبتلا نظر آتے۔ بعد میں اس کی وجہ معلوم ہوئی کہ جو عیسائی مشنریاں ان پر پہلے سے محنت کرتی تھیں وہ دوسرے ہی دن پہنچتیں اور دنیاوی لالچ دلا کر ساری محنت پر پانی پھیر دیتیں۔ خیر نصف النہار کے سورج کو بادل کہاں تک روک سکتے ہیں، کئی دنوں کی محنت ، دعا اور کوشش کے بعد اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ایک شخص مسلمان ہوا، پھر دوسرا، پھر اللہ نے ہدایت عام فرمادی۔ اور خاندان کے خاندان مسلمان ہونے لگے اور یدخلون فی دین اللہ افواجا کا منظر نظر آنے لگا۔

انجمن تبلیغ اسلام کا قیام اور بڑے حضرت کا اخلاص

بڑے حضرت نے میل وشارم کے چند مخلص اصحاب خیر کو توجہ دلائی اور ان نومسلم حضرات وخواتین کے قیام وطعام اور تعلیم وتربیت کے لیے ایک ادارہ انجمن تبلیغ اسلام کے نام سے قائم فرمایا، شہر کے تاجرانِ چرم نے اس انجمن کی دل کھول کر مدد کی۔ انجمن کے قیام کے چند سالوں میں انجمن کی ضرورتیں پوری ہونے کے بعد بھی کافی رقم بچ رہی تو ارکانِ

انجمن نے مشورہ کر کے حضرت سے کہا کہ حضرت آپ تو بہت محنت کرتے ہیں اور انجمن میں کافی رقم موجود ہے، لہٰذا ہماری خواہش ہے کہ آپ الاؤنس کے طور پر ماہانہ ایک سو روپے قبول فرمالیں، آج سے ساٹھ پینسٹھ سال پہلے یہ بڑی بھاری رقم تھی، بڑے حضرت نے فرمایا ”یہ کام میں اللہ کے لیے کر رہا ہوں، ہائی اسکول سے مجھے جو تنخواہ دی جاتی ہے وہ میری ضرورت کے لیے کافی ہے، اگر اللہ تعالیٰ قیامت میں کہہ دے کہ اس محنت کا معاوضہ تم نے دنیا ہی میں لے لیا تھا تو کیا کروں گا، لہٰذا یہ ساری محنتیں اللہ ہی کے لیے رہنے دیں۔

اس ضمن میں بڑے حضرت اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے کہ بھائی آپ دین کے جس کام پر بھی مامور ہوں اسے بحسن وخوبی انجام دیتے ہوئے کچھ کام دین کا زائد بھی کیا کرو، لکیر کے فقیر بن کر مت رہا کرو، بحمد اللہ بڑے حضرت کی اسی مخلصانہ جدوجہد کے نتیجے میں پانچ سو سے زائد افراد مسلمان ہوئے۔ ۱۹۴۷ کے بعد اس راہ میں مختلف رکاوٹیں کھڑی کی جانے لگیں، تو مشورے سے عارضی طور پر اس سلسلے کو روک دیا گیا۔

دعوت وتبلیغ : بڑے حضرت قبلہ کو حضرت مولانا محمد الیاس صاحب والی دعوت وتبلیغ کی عالمی محنت سے والہانہ تعلق تھا، جنوبی ہند میں عموماً اور ضلع شمالی آرکاٹ میں خصوصاً ہر جگہ تبلیغی اسفار فرماتے، اجتماعات کی سرپرستی فرماتے، ۱۹۶۱/۱۹۶۲ء میں آپ نے ایک بڑی جماعت کے ساتھ ملیشیاء کا سفر فرمایا۔ جو بہت کامیاب رہا اور واپسی میں اہل ملیشیا کی ایک جماعت ہمراہ لائے تھے، آپ نے سری لنکا کا تبلیغی دورہ بھی فرمایا تھا۔ قرب وجوار میں چھوٹے بڑے تبلیغی اجتماعات ہوتے، حضرت اپنے ہمراہ بعض طلبہ کو لے جاتے، ایک مرتبہ شیخ آدم صاحب قبلہ نے طلبہ کو جماعت میں لے جانے سے منع فرمایا تو آپ نے استاذ محترم کا پاس وادب ملحوظ رکھتے ہوئے طلبہ کے سلسلے کو بند فرمادیا۔

معمولات: بڑے حضرت کے فارغ اوقات کا بیشتر حصہ کلام مجید کی تلاوت اور اس کے تدبر و تفکر میں صرف ہوتا تھا، کئی سالوں سے روزانہ دس پارے تلاوت کا معمول تھا، سفر وحضر میں تہجد کا اہتمام فرماتے تھے، ہمیشہ اشراق و چاشت اور اوابین نیز دیگر سنن ونوافل بھی ادا فرماتے تھے۔

نماز پنجگانہ با جماعت مسجد میں ادا کرنے کا ہمیشہ بہت زیادہ اہتمام رہا تھا، اخیر عمر میں جب کہ چلنا نسبتاً دشوار ہوگیا تھا، وھیل چیئر سے مسجد جاتے اور پانچوں نمازیں با جماعت ادا فرماتے۔ اور عصر کو جا کر مغرب کے بعد مسجد سے واپسی پھر عشاء میں دوبارہ حاضری کا معمول تھا۔ اپنے شاگردوں اور مدرسے کے طلبہ کو تمام نوافل کی ترغیب دیتے۔ اشراق اوابین عصر کے بعد ذکر اور مغرب اور فجر کے بعد تلاوت قرآن بشمول سورۂ یاسین اور سورۂ واقعہ، سبیل الرشاد کے معمولات میں شامل ہے۔

بیعت و خلافت: بڑے حضرت کے اندر اللہ تعالیٰ نے اخلاص وللہیت کو کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا، لہٰذا وہ اپنے بیعت وارشاد کے سلسلے کو بھی اسی طرح پوشیدہ رکھتے جس طرح دیگر کمالات کو۔ آپ کے قریب رہنے والے بہت سے احباب ایسے ہوں گے جن کو آج تک حضرت کے سلسلۂ بیعت کا علم نہ ہو، بڑے حضرت کو حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ حضرت مولانا الحاج محمد سعید صاحب باقوی کیرنوریؒ سے خلافت واجازت حاصل تھی، اور ایک حلقہ تھا جو آپ کی رہبری میں راہِ سلوک طے کر رہا تھا، بڑے حضرت قبلہ مستجاب الدعوات تھے، ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ کسی ضروری مد میں خرچ کرنے کے لیے ایک متعین رقم کی ضرورت تھی، نماز عشاء کے بعد دعا کر کے مسجد سے باہر تشریف لائے، زمانہ حجاج کرام کی حج سے واپسی کا تھا، ایک حاجی صاحب مسجد کے باہر

کھڑے حضرت کا انتظار فرمارہے تھے، حضرت کو دیکھتے ہی انہوں نے کہا کہ آپ ہی کا منتظر ہوں۔ ایک تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں، میری درخواست ہے کہ آپ اسے ضرور قبول فرمالیں۔ حضرت نے فرمایا کہ میرے ذہن میں آیا کہ شاید زمزم اور کھجور پیش کریں گے جو عموماً حجاج کرام پیش کرتے ہیں، مگر انہوں نے ایک لفافہ پیش کرکے کہا، یہ ہدیہ ہے قبول فرمالیں۔ حضرت نے لفافہ کھولا تو حیرت ہوئی کہ وہی مطلوبہ رقم اس میں موجود تھی۔

مناصب: آپ جامعہ باقیات الصالحات ویلور کی تعلیمی کمیٹی کے رکن تھے، گذشتہ کئی سالوں تک باقیات الصالحات کا جلسہ دستار بندی آپ کی صدارت میں منعقد ہوتا رہا۔ آپ کے دستِ حق پرست سے تقسیم اسناد عمل میں آتی رہی۔ جامعہ باقیات الصالحات کی موجودہ نئی پانچ منزلہ عمارت کا سنگ بنیاد بڑے حضرت کی دعاؤں کے بعد آپ ہی کے دست مبارک سے رکھا گیا اور افتتاح بھی آپ ہی نے فرمایا۔

آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو اور دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کے رکن مجلس شوریٰ تھے، حضرت حکیم الاسلام کے دور تک آپ دارالعلوم دیوبند کے رکن شوریٰ بھی رہے ،آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ جو بلا مبالغہ سارے مسلمانانِ ہند کا متفقہ پلیٹ فارم ہے، اس کے آپ نائب صدر تھے، نیز آل انڈیا ملی کونسل کے بھی آپ سرپرست تھے، جنوبی ہند کے بیشتر مدارس کے بھی آپ سرپرست تھے۔

خوردوں پر شفقت وعنایت: بڑے حضرت کا ایک امتیازی وصف اپنے چھوٹوں پر شفقت وعنایت تھا۔ آپ کی گفتگو میں ایک عجیب قسم کی مٹھاس اور چاشنی ہوا کرتی، اپنا کام ہمیشہ آپ کرنے کے عادی تھے، کسی سے خدمت لینا آپ کو گوارا نہ تھا،

حتی کہ خود خدام سے بھی خدمت لینے میں آپ کو تامل سا رہتا تھا۔

آپ کے سفری خادم حضرت مولانا سیف الدین صاحب رشادی بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ دورانِ سفر کسی منزل پر قیام ہوا، چونکہ مجھے معلوم تھا کہ حضرت رات کو تہجد کے لیے ضرور اٹھیں گے، لہٰذا میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت رات میں اٹھتے وقت مجھے ذرا سا آواز دے دیں تاکہ میں آپ کو وضو وغیرہ کرا سکوں۔

رات کو ہلکی سی آہٹ ہوئی، میں نے دیکھا کہ کوئی سایہ دھیرے دھیرے حمام خانے کی طرف رینگتا جا رہا ہے، غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ حضرت بذات خود وضو کرنے کے لیے حمام خانے کو جا رہے ہیں، ایک طرف کسی کو زحمت نہ دینے کا خیال آپ کو خادم کو بیدار کرنے سے روک رہا ہے تو دوسری طرف نقاہت کا یہ عالم ہے کہ سیدھے قدموں چلا بھی نہیں جاتا۔ رینگتے ہوئے حمام خانے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ میں یہ محسوس کرتے ہی یکلخت اٹھ کھڑا ہوا، حضرت نے میرے اٹھنے کی آواز سنی تو مسکرا کر فرمایا "اٹھ گئے مولوی صاحب، لو ہاتھ پکڑو۔

امانی کیا بیاں ہو وصف ساقی
زباں ہے گنگ اور مدحت ہے باقی
نہیں ممکن امانی سب کی تحریر
مناسب ہے کہ کرلوں ختم تقریر

بڑے حضرت
رئیس العلماء شاہ ابوالسعود احمد رحمہ اللہ
ایک جامع صفات شخصیت

اللہ تعالیٰ نے موت وحیات کی تخلیق فرما کر انسانوں کا امتحان فرمایا، اللہ تعالیٰ نے زندگی اور موت کی تخلیق اس طرح فرمائی کہ دونوں کے مابین تلازم کا رشتہ ہے۔ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں، اور موت وحیات کی کشمکش ایسی فیصلہ کن حقیقت ہے کہ جس کا آغاز ابتدائے آفرینش سے ہے، اور قیامت تک برابر جاری رہے گا۔

دنیائے فانی میں ہر آنے والا جانے ہی کے لیے آتا ہے، کوئی بھی ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آتا، یہ حقیقت اللہ کے علم میں ہے کہ ہر دن دنیا میں کتنے بچے پیدا ہوتے ہیں اور کتنے وفات پاتے ہیں۔ اس عالم فانی سے انتقال کرنے والوں میں بہت سے افراد ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی موت کا علم ان کے خاندان اور متعلقین کے سوا کسی کو نہیں ہوتا۔ مرنے کے ساتھ ہی ان کی زندگی بھی اور ان کے کارگذاری بھی ختم ہو جاتی ہے، لیکن چند افراد اور شخصیات اپنی زندگی کے کارناموں میں خیرِ محض ہوتے ہیں، ان کی زندگی ایک کامل انسان کا نمونہ اور دوسروں کے لیے اسوہ اور قدوہ ہوتی ہے، اور وہ ملکوتی صفات کے حامل ہوتے ہیں، جس کی بناء پر وہ زندگی میں مرجع خلائق بنے رہتے ہیں اور ان کے انتقال پر ملال کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک فرد نہیں بلکہ ایک جماعت دنیا سے رخصت ہوگئی۔

یہ اللہ کی شانِ کریمی ہے کہ اس نے اولیاء اور علماء دین کی فلک بوس شخصیات سے تاریخ کے کسی دور کو تہی دامن نہیں رکھا۔ ہر زمانے میں شخصیت ساز مراکز اور ادارے بھی وجود میں آتے رہے ہیں، اور ان کے ذریعے اللہ کے دین کو سنبھالنے والے دین کے خدام بھی اس جہاں میں ابھرتے رہے ہیں، اس خدائی نظام کے تحت جامع شریعت وطریقت، استاذ الاساتذہ، بڑے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی ظہور میں آئی۔

حضرت والا ایسی ہی شخصیات مغتنمات میں سے تھے جن کی ذات گرامی اپنے آپ میں ایک انجمن تھی۔ حق تعالیٰ نے آپ کو گونا گوں عظیم صفات سے اور خصائل حمیدہ سے سرفراز فرما کرامت مسلمہ کے درمیان ایک غیر متنازع اور انتہائی محترم شخصیت بنا دیا تھا۔

کسی ایسی شخصیت پر قلم اٹھانا نسبتاً آسان ہوتا ہے جو ایک دو خوبیوں کی مالک یا چند صفات ہی میں امتیاز رکھتی ہو، لیکن ان افراد پر لکھنا جو عبقری صفات اور گونا گوں خصوصیات وامتیازات کے حامل ہوں، جن کے محاسن بیشمار ہوں، جو ان گنت خوبیوں کے مالک ہوں، ایک طرح کا امتحان ہوتا ہے۔ کیونکہ تمام خصوصیات کا بیان اور شخصیت کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنا بالخصوص کسی ایک مضمون میں ممکن نہیں ہوتا۔ اور پھر یہ فیصلہ کرنا کہ ان اوصاف میں سے کسے موضوع بنایا جائے اور کسے چھوڑا جائے، محال نہ سہی، مشکل ضرور ہے۔

حضرت والا کی اس علمی اور روحانی جامعیت کی جامع ترین تعریف قاضی القضاۃ حضرت مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ، سابق صدر آل مسلم پرسنل لاء بورڈ نے یہ فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت اور اس کے کرمہائے گراں مایہ کا ایک نمونہ حضرت مخدومی وسیدی وسندی مولانا ابوالسعود احمد اس دار فانی سے انتقال فرما کر اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون پوری ملت اسلامیہ کو جو نقصان ہوا ہے

وہ نا قابلِ تلافی ہے، حضرت والا کے بغیر سبھی محفلیں اور مجلسیں سونی سونی نظر آتی ہیں، اللہ تعالیٰ کے بندے اور مردانِ خدا سامنے ہوں تو پوری طرح پہچانے نہیں جاتے، اور جب چلے جاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہم نے کیا کیا کھو دیا۔ بڑے حضرت سراپا شفقت، مجسم تواضع، انکساری، بے نفسی، دینی صلابت، سنت پر استقامت اور سب سے بڑھ کر رجال سازی اور دین کے صحیح شعور کے ساتھ کام کرنے والے افراد کی ذہن سازی کی خوبیاں جو حضرت اقدس میں جمع تھیں وہ شاذ و نادر ہی کسی فرد میں جمع ہوتی ہیں،

لَیْسَ عَلَی اللّٰہِ بِمُسْتَنْکَر
اَنْ یَجْمَعَ الْعَالَمَ فِیْ وَاحِدٖ

اور قاضی صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ''مومن کے ہاں موت کا تصور وہ نہیں جو دنیا داروں کا ہے''

نشانِ مردِ مومن باتو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

(مردِ مومن کی علامت میں تجھے بتاتا ہوں، جب اسے موت آتی ہے تو اس کے ہونٹوں پر تبسم رہتا ہے۔)

حضرت امیر شریعتؒ اول زندگی بھر لوگوں سے مسکراتے ملتے رہے، ہمیشہ ان کے نورانی چہرے پر تبسم کھلتا رہا، وہ تبسم کے ساتھ ہی دنیا سے تشریف لے گئے، کچھ لوگ دنیا میں اپنی ذات کے لیے جیتے ہیں اور کچھ دوسروں کے لیے جیتے ہیں، اور سب سے اچھا جینا نسبتِ رسالت کے ساتھ جینا ہے یعنی آدمی پوری کائنات کے لیے جئے۔ سب کے لیے اس کا سینہ کشادہ رہے اور وہ سب کے لیے فکرمند رہے۔ امیر شریعتؒ اول کو یہ نسبت مبارکہ حاصل تھی، وہ بلا تفریق سب کے لیے تھے، سب کے لیے جیتے تھے، اور جب وہ دنیا

سے رخصت ہوئے ، سب کی آنکھوں میں غم کے آنسو تھے، حضرت امیر شریعت اول کی صحبت کے فیض یافتگان ریاستوں اور ملکوں میں اسی ذہن صالح کے ساتھ دینی اور ملی کاموں میں مشغول ہیں۔ حضرت کا فیض ملک اور عالم میں جاری ہے، اصل کام یہی ہے کہ آپ کے بتائے ہوئے کاموں کو یاد کیا جاتا رہے۔

اسی طرح مبلغ اعظم داعی کبیر حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری نے بڑے حضرت کی وفات حسرت آیات کے موقع پر مرکز نظام الدین بنگلہ والی مسجد میں فرمایا تھا کہ ''جنوب کا ایک قیمتی ہیرا اللہ تعالیٰ نے اٹھالیا''۔ بڑے حضرت نے موجودہ دور کے نوجوانوں کی ذہن سازی کا جو طریقہ اختیار کیا، وہ نبوی اسلوب سے ہم آہنگ تھا۔ شرافت ونجابت کا اصل معیار تو علم اور تقویٰ ہے، جس کے اندر علمِ دین کا جس قدر کامل رسوخ ہوگا، اسی قدر خشیت الٰہی کا رنگ غالب ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰکُمْ﴾ اور ایک موقع پر ارشاد فرمایا ﴿اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ بڑے حضرت میں یہ صفت بدرجہ اتم موجود تھی، آپ کریمانہ اخلاق کے حامل تھے اور ہر آنے والے کا کشادہ دلی اور خوش روئی کے ساتھ استقبال کرتے۔ بڑی ملاطفت اور شفقت کا معاملہ فرماتے، آپ سے ہر ملنے والا متاثر ہوتا اور جب واپس ہوتا تو فرح وانبساط کی کیفیت اس پر ہوتی۔ آپ ہندوستان کے جید علماء میں ایک خاص مقام رکھتے تھے، علم کی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ تقویٰ، اخلاص، توکل اور تواضع کا وصف نمایاں تھا، فکر کی بلندی، قلب کی وسعت، اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ سچی محبت نے آپ کو مقبول عام بنادیا تھا، عالمانہ وقار اور داعیانہ کردار آپ کا طرۂ امتیاز تھا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو دعوت وتبلیغ کا خاص جذبہ عطا فرمایا تھا اس جذبہ کی

کارفرمائی سے آپ کا یہ فیض ہوا کہ خصوصاً تمل ناڈو، کرناٹک اور عموماً ملک کی دوسری ریاستیں تحریک دعوت وتبلیغ سے متعارف ہوگئیں، صرف جنوبی ہند ہی نہیں بلکہ عالم میں دعوت وتبلیغ کی محنت کو چلانے اور اس کے حلقۂ اثر اور دائرۂ کار کو وسیع تر اور قوی تر کرنے میں حضرت اقدس کی فکر اور محنت اور دعائیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

بڑے حضرت اخلاص وکردار اور تقویٰ وطہارت کا عظیم پیکر تھے، مشتبہ امور سے بھی احتراز فرماتے تھے، ہمیشہ آخرت پیش نظر رہا کرتی، تعلیم وتربیت، اصلاح وارشاد اور دعوت ودعا کا مجسم پیکر تھے۔ جامعہ باقیات الصالحات کے بار اہتمام سے سبکدوش ہونے کے بعد حضرت والا نے بنگلور میں ورود مسعود فرمایا، آپ ہی کی جد وجہد اور آپ کے مخلص رفقاء کے تعاون سے شہر بنگلور کا پہلا بڑا تبلیغی اجتماع بتاریخ ۲۲ ربیع الاول ۱۳۸۰ھ مطابق ۱۴ستمبر ۱۹۶۰ھ بروز چہارشنبہ سبیل الرشاد کے وسیع احاطے میں منعقد ہوا، دراصل یہ تبلیغی اجتماع دارالعلوم سبیل الرشاد کی مبارک افتتاحی تقریب کے سلسلے میں منعقد ہو رہا تھا۔

بحمداللہ دارالعلوم سبیل الرشاد کی تقریبِ افتتاح تبلیغی اجتماع کی شکل میں منعقد ہوئی۔ اس طرح ریاست کرناٹک میں علومِ دینیہ کی ترویج کا دیرینہ خواب بڑے حضرت کی انتھک کوششوں اور مخلص رفقائے کار کے تعاون سے تعبیر آشنا ہوا اور پورے شہر پر خوشیوں اور مسرتوں کی بہار چھا گئی۔

حضرت نے شب وروز اپنے خونِ جگر سے اس کو سینچا، اللہ تعالیٰ نے اس کو چہار دانگ عالم میں خصوصی امتیاز بخشا، نہ صرف ملک بلکہ دنیا کے کونے کونے سے طالبانِ علومِ دین نے یہاں علمی تشنگی بجھائی اور آسودگی وسیرابی پائی اور اپنے اپنے ملکوں میں مدرسے قائم کرکے حضرت والا کے لیے صدقہ جاریہ کا نظم کیا۔ حضرت والا ملک کے کن کن

مدرسوں کے سر پرست اور مہتمم تھے اور کن کن صوبائی وملکی تنظیموں ،تحریکوں اور جماعتوں کے سر پرست اور ذمہ دار تھے، یہاں اس کی تفصیلات کی گنجائش نہیں ۔مختصراً عرض ہے، آپ حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے دور تک دارالعلوم دیوبند کے رکن شوریٰ رہے، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کے رکن شوری تھے،آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ جو بلا مبالغہ سارے مسلمانانِ ہند کا متحدہ مرکز ہے،اس کے آپ نائب صدر تھے،آل انڈیا ملی کونسل کے سر پرست تھے ،جامعہ باقیات الصالحات ویلور کے تعلیمی کمیٹی کے رکن تھے اور کئی سالوں تک باقیات الصالحات کا جلسہ آپ کی صدارت میں منعقد ہوتا تھا۔

آپ کی وفات پر پوری امتِ مسلمہ ایک بڑے مخلص اور مدبر، صاحب بصیرت اور روحانی مقتداء سے محروم ہوگئی۔ بڑے حضرت بتاریخ ۷شوال ۱۴۱۶ھ مطابق ۲۷فروری ۱۹۹۶ء بروز سہ شنبہ ساڑھے تین بجے خدا تعالیٰ کی جوارِ رحمت میں رحلت فرما گئے ۔انا للہ وانا الیہ راجعون اس حادثہ کی خبر برقی لہر کی طرح سارے شہر اور ملک میں پھیل گئی۔ حضرت اقدس کی شخصیت کی ہمہ گیری کی بناء پر ریاست اور ملک کے مشائخ اور علماء، سیاسی وسماجی قائدین اور دانشوران تحریکات، واداره جات اور دوسرے ہزاروں افراد کا جم غفیر نماز جنازہ اور دیدار میں دیکھا گیا، بہت سے معمر حضرات کا کہنا تھا کہ بنگلور کی تاریخ میں اتنا بڑا مجمع نماز جنازہ کے لیے نہ کبھی دیکھا گیا اور نہ کبھی سننے میں آیا۔ یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ حضرت کی مقبولیت اور محبوبیت کا عوام اور خواص پر کتنا اثر تھا۔

عالم فانی سے بعض جانے والے اس طرح جاتے ہیں کہ ان پر کوئی روتا تک نہیں،قرآن نے فرمایا﴿فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْض﴾اس کے برخلاف

ایسے بھی رحلت کرنے والے ہوتے ہیں کہ ان پر نہ صرف انسان، بلکہ ملائکہ، جنات اور دیگر مخلوق حتی کہ آسمان وزمین بھی روتے ہیں، حضرت عمرؓ کا انتقال ہوا تو جنات بھی روپڑے اور غم میں مرثیہ پڑھنے لگے (تاریخ الخلفاء ص ۱۰۳) تفسیر مظہری میں مذکورہ بالا آیت کے تحت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آسمان میں ہر بندے کے لیے دو دروازے مقرر ہیں، ایک سے اس کا رزق نازل ہوتا ہے اور دوسرے سے اس کا عمل صالح اوپر پہنچتا ہے، چنانچہ جب وہ بندہ مرتا ہے تو وہ دروازے اس کو یاد کر کے روتے ہیں، تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ مومن کے مرنے پر آسمان وزمین چالیس دن تک روتے ہیں اور وہ زمین روتی ہے جہاں وہ نماز پڑھتا تھا اور اللہ کو یاد کرتا تھا۔ حضرت امیر شریعت کا رحلت فرمانا ایسی ہی شخصیات کا جانا ہے۔ یہ مقبولیت عند اللہ کی علامت ہے۔

ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَاءُ ، وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمُ۔

ملفوظات بڑے حضرتؒ

رئیس العلماء شاہ ابوالسعود احمد رحمہ اللہ

رئیس العلماء، بقیۃ السلف، علامۂ زماں، فقیہ النفس، حافظ وقاری، مولانا مفتی الشاہ ابوالسعود احمد رحمہ اللہ بانی دار العلوم سبیل الرشاد بنگلور نے ارشاد فرمایا:

(۱) خدا کی قدرت دیکھو کہ کروڑوں انسانوں کو پیدا کرتا ہے اور ہر ایک کی شکل الگ الگ رکھا، کسی فیکٹری میں کوئی چیز بنتی ہے تو کیا اس کی شکل الگ الگ ہوتی ہے، ایسے ہی آواز ہے کہ سب کی الگ الگ۔ یہ سب خدا کی قدرت ہے۔

(۲) زبان ہے، اس کے نیچے ایک چشمہ ہے، ضرورت کے وقت پر وہاں سے پانی نکلتا ہے، وہ پانی کہاں سے آتا ہے، یہ بھی خدا کی ایک قدرت ہے، عوام ان باریکیوں کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے، اہل علم اس کی طرف زیادہ متوجہ ہو سکتے ہیں۔

(۳) ہمارے لیے اصل اللہ کی مدد ہے۔ غیر اللہ سے کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ اگر مدد کرنا چاہے تو کوئی نہیں روک سکتا اور اللہ کی مدد اس وقت آتی ہے جب کہ بندے اس کی طرف متوجہ ہوں۔ اور اس کی طرف متوجہ ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے احکامات پر عمل کریں اور پنجگانہ نمازی بن جائیں۔

(۴) صرف پڑھنے سے اور کتابوں سے کچھ نہیں ہوتا، عمل بہت ضروری ہے۔

(۵) تمام انبیاء اس بات کے متفکر رہتے تھے کہ کوئی بھی جہنم میں نہ جائے، اسی طرح ایک عالم کو بھی متفکر رہنا چاہیے۔

(۶) آج کل مدارس میں تعلیم ہے، تربیت نہیں ہے، خود طالب العلم پڑھائی کے زور سے ٹھیک ہونا چاہیے مگر ہوتا نہیں۔

(۷) سب کچھ اللہ ہی ہے اور سب اسی سے ہے، وہی طاقت دیتا ہے، انسان بذاتِ خود کچھ بھی نہیں ہے، جب تک کہ خدا نہ دیں، یہاں تک کہ پیغمبر بھی محتاج ہیں۔

(۸) ساری دنیا اب اسلامی طرز اور قانون سے گھبراتی ہے۔ اسی واسطے اسلام ہی کو لوگ ختم کرنا چاہتے ہیں، اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ اسلامی طرز پر باقی اور قائم رہیں۔

(۹) اخلاص سے کام کریں تو کام ہو جاتا ہے، اخلاص کا معنیٰ یہ ہے کہ میں کچھ نہیں ہوں سب کچھ خدا ہی سے ہوتا ہے۔ جب آدمی اس اخلاص سے کام کرے گا تو ایسے آدمی کے ساتھ خدا کی مدد ہوتی ہے۔

(۱۰) اس عالم کو کیا کہتے ہیں۔ اس عالم کو عالم اسباب کہتے ہیں۔ اس لیے کہ ہر آدمی اسباب کی طرف متوجہ رہتا ہے، مسلمان بھی، غیر مسلم بھی، لیکن مسلمان کو تو اسباب سے زیادہ مسبب کی طرف متوجہ رہنا ہے۔ ایک لڑکا کتے کو پتھر مارتا ہے تو وہ پتھر کتے کے جسم پر لگتا ہے، اب وہ پتھر کی طرف متوجہ نہیں ہوتا بلکہ اس لڑکے کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ اس نے مجھے مارا ہے۔ ایک کتے کو بھی اس کے خیال میں مسبب کی طرف دھیان ہے تو پھر آدمی کیوں خدا کی طرف متوجہ نہ ہو۔

(۱۱) ہم کو چاہیے کہ ہم پورے طور پر خدا پر بھروسہ کریں، اپنے مال، شہرت اور معاونین سے کچھ نہیں ہوتا، اپنی طاقت سے ایک قطرہ پانی نہیں بنا سکتے۔

(۱۲) تنگی ہے تو کیا کرنا چاہیے، دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ سے مانگنا چاہیے۔ دکان بے جان چیز ہے، وہ نہ نفع پہنچا سکتی ہے اور نہ نقصان۔ اللہ چاہے تو دکان میں نفع اور

نقصان پہنچاتا ہے، یہ یقین پیدا کرنا چاہیے، بات چیت کے حد تک ہوتو کچھ نہیں ہوتا۔ دل میں یہ بات رہنا چاہیے۔

(۱۳) دولت مند وہ ہے جس کو تفویض اور توکل کا سرمایہ مل جائے۔ وہ سکون اور اضطراب دونوں ہی حالتوں میں خدا پر بھروسہ رکھتا ہے۔ نہ اپنی ذات پر نہ اپنے علم پر۔

(۱۴) داعی بن کر زندہ رہو، جب تک دوسروں کو دعوت دیتے رہو گے خود محفوظ رہو گے، کوئی دوسرا تمہیں دعوت نہیں دے گا، ورنہ تم مدعو بن جانے کا خطرہ ہے۔

(۱۵) طاعت میں کمال پیدا کرو، تاویلات اور اعذار کا راستہ مت ڈھونڈو۔ اتنا جذبۂ اطاعت پیدا کرو جیسا کہ ایک صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز 'بیٹھو' سنی اور مسجد کے دروازے پر ہی بیٹھ گئے ۔ایک صحابی نے گلی میں یہ آواز سنی اور وہیں بیٹھ گئے۔

(۱۶) بچہ اگر رحم مادر میں بگڑ گیا تو وہ کبھی درست نہیں ہوتا، اگر ہو بھی جائے تو نقلی شکل کا پتہ صاف چل جاتا ہے۔ اسی طرح مدارس کے طلباء اس چہار دیواری میں اگر درست نہ ہو سکے تو باہر نکل کر اصلاح ناممکن نہیں تو بھی مشکل ضرور ہے۔ اس لیے یہیں اپنی زندگی بنالو، سنوار لو۔

(۱۷) دنیا میں اس طرح زندہ رہو کہ دنیا تمہارے اندر نہ آئے ، ورنہ ڈوب جاو گے، جیسے سمندر میں جہاز چلتا ہے لیکن سمندر سے بچا بچا۔ اگر پانی جہاز میں داخل ہو گیا تو جہاز ڈوب جاتا ہے۔

(۱۸) موسم سرما میں کمبل بہت آرام دہ ہوتا ہے، مگر وہی گرمی میں پریشان کن ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح گناہ دنیا میں بہت لذیذ معلوم ہوتا ہے، مگر آخرت میں سخت مصیبت بن جائیں گے۔

(۱۹) یہ دین تواتر کے ساتھ چلا آرہا ہے، اس لیے اپنے بزرگوں اور اساتذہ کے طرز عمل پر مضبوطی سے جم جاؤ۔

(۲۰) بچہ کھلونوں سے کھیلتا ہوا کھانے کی بہت سی چیزیں پکاتا ہے اور سالن کے متعدد اقسام تیار کرتا ہے، مگر جوں ہی اسے بھوک لگتی ہے، سب کھلونوں کو چھوڑ کر ماں کو پکارتا ہے، فوراً ماں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمیں خدا کی طرف اصلی توجہ اور پوری توجہ رکھنا چاہیے۔ وہی ہماری صحیح بھوک مٹانے والا ہے اور صحیح آرام دینے والا ہے، ورنہ یہ دنیا اور اس کی ساری چیزیں لہو ولعب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اِنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَلَھْوٌ۔

(۲۱) علم ایک ہدایت ہے، لیکن اس کا صحیح استعمال اور اس کے درست تقاضوں پر چلنے ہی سے فائدہ ہوتا ہے۔ جیسے چراغ راہ سے راستہ روشن تو ہو جاتا ہے مگر خطرہ سے خالی نہیں ہوتا۔ اس کے نشیب وفراز، کانٹے اور رکاوٹیں اپنی جگہ باقی رہتی ہیں۔ اگر اس روشنی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے احتیاط اور سلیقے سے چلوگے تو منزل تک پہنچ سکوگے۔ صرف چراغ جلانے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔

(۲۲) خیر امت کی صفت پیدا کرو، دوسروں کو دعوت دیتے ہوئے خود پر بھی نظر رکھو، دوسروں کے مقابلے میں اپنی کمزوریوں کا زیادہ خیال رکھو، اپنے گھر کی صفائی کی طرف خاص توجہ دو تاکہ مہمان آئے تو خوش ہوں اور متاثر ہو کر جائیں۔

(۲۳) مدینہ دین کا مرکز تھا۔ جہاں سے لوگ دین سیکھتے تھے، احکام معلوم کرتے تھے ، ہر شئی کی تقسیم وہیں سے ہوتی تھی، اسی طرح دین کے نظام کی تقویت کے لیے ایک مرکز ضرور بنائے رکھو۔ اس سے تمہیں ہمہ وقت قوت ملتی رہے گی۔

(۲۴) جو دوستی اس دنیا میں تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہوگی، وہ آخرت میں بھی قائم رہے گی، ورنہ آخرت میں یہی دوستی دشمنی میں بدل جائے گی، اس لیے للہ دوستی کرو۔

(۲۵) جو کام بھی کرنا ہے بس اللہ کے لیے کرنا ہے، اس میں نفع کم ملے یا زیادہ ملے دلانے والا اللہ ہے، وہ زیادہ دلانا چاہے تو دلا سکتا ہے یا کم دلانا چاہے تو کم بھی دلا سکتا ہے۔

(۲۶) جو نعمت اللہ نے ہمیں قرآن کی دی ہے، اس کو زیادہ پڑھ کر زیادہ ثواب حاصل کرنا چاہیے، صرف رمضان کے لیے اور تراویح کے لیے قرآن کو یاد نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ہمیشہ پڑھتے رہنے کے لیے قرآن کو یاد کر لینا چاہیے۔

(۲۷) اخلاص سے کام اللہ کے لیے کریں تو اس کی بڑی برکت ہے۔

(۲۸) علماء کو زیادہ عبادت کرنا چاہیے، عوام جتنی عبادت کرتے ہیں، اس سے زیادہ کرنا چاہیے، ورنہ اتنا پڑھ کر کیا فائدہ، عوام تو پڑھے بغیر ہی اتنی عبادت کرتے ہیں، تو علماء کو اس سے زیادہ کرنا ہے یا نہیں؟

(۲۹) ہر بات اللہ کے حوالے کرنا، اس سے مانگنا، اس کی طرف متوجہ رہنا چاہیے، بس اللہ پر بھروسہ کرنا ہے، کوئی کچھ نہیں کر سکتے، کوئی نہ بچا سکتے ہیں اور نہ کوئی مدد کر سکتے ہیں، بس اللہ ہی بچا سکتا ہے اور وہی مدد کر سکتا ہے۔

(۳۰) ایمان جتنا مضبوط ہوتا ہے اتنا اللہ پر بھروسہ ہوتا ہے، ایمان اگر مضبوط نہیں ہے تو روزی کے معاملے میں ایک ہندو کی طرح مسلمان کا عقیدہ رہے گا، اگر وہ ایس ایس ایل سی تک پڑھا تو ہی نہ کھائے گا، ورنہ کیسے روزی کا مسئلہ حل ہوگا!!؟ اگر ایمان کمزور رہا تو دنیا میں اس طرح رزق کی فکر کرے گا۔

(۳۱) عورت کی ذمہ داری گھر کی حفاظت اور اولاد کی تربیت ہے، اگر یہ

کارخانے کو کمانے گئی تو نوکر کیا تربیت کرسکتا ہے، بچے کی تربیت صحیح طریقے سے نہیں ہوسکتی۔

(۳۲) آج کل لڑکیوں کو اسکول بھیجتے ہیں، پھول لگا کر، سنگھار کر، یہ جائز نہیں ہے، عورت کو نوکری کرنے کی غرض سے پڑھانا درست نہیں ہے۔ عورت نماز روزے کے مسائل کے علاوہ طہارت کے مسائل پڑھ لے تو کافی ہے۔

(۳۳) ہماری حقیقت کچھ نہیں ہے۔ سب کچھ اللہ ہی ہے، سب کچھ اسی سے ہے، وہ جیسا چاہتا ہے ویسا ہوتا ہے، جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرتا ہے، وہ کامیاب ہوجاتا ہے، جو شخص نفس امارہ کے حوالہ اپنے آپ کو کرتا ہے وہ تباہ و برباد ہوجاتا ہے، نفس جو ہے امارہ ہے، امر نہیں ہے۔

(۳۴) نفس کے غلام بن گئے تو تباہی آتی ہے، تھوڑے مزے کے لیے آخرت تباہ و برباد ہوتی ہے، علماء نبی کے وارث ہیں، وہ جتنا تقویٰ پر قائم رہیں گے ان سے اتنی ہی لوگوں کو ہدایت ملے گی، اگر وہ تقوے سے دور رہیں گے تو خود بھی برباد ہوں گے، دوسروں کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

(۳۵) اَللّٰہُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ کافروں کے مقابلے میں ولی ہیں، ایمان والوں کے ساتھ دوستی ہے، ولایت دو قسم کی ہے، ایک ولایت عامہ، ایک خاصہ ہے، اس کو حاصل کرنے کی کوشش کریں، جو کوشش کرے گا اس کو حاصل کرلے گا، اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ جس مقصد کے لیے تخلیق ہوئی ہے اس کو آگے رکھنا چاہیے، مقصد تخلیق عبادت ہے۔

(۳۶) علماء کو کچھ خصوصی عبادت کرنا چاہیے، تلاوتِ قرآن ذکر اللہ وغیرہ۔ خصوصاً نوافل میں تہجد کی نماز، یہ علماء کو ضرور کرنا چاہیے۔

(۳۷) اللہ سے چھوٹی چھوٹی باتوں سے ڈرنے والے علماء ہی ہوتے ہیں، عوام کو کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا، پیسہ خود بخود ملتا ہے، پیسہ خود دینے والا اللہ ہے، اللہ دینا چاہا تو بہت کچھ دے سکتا ہے، آخرت کی کمائی کی کوشش کرنا چاہیے۔

(۳۸) مسلمان کو تو صرف خدا کی عبادت میں آگے بڑھنے والا ہونا چاہیے، زندگی بھر تکبیر تحریمہ کے ساتھ نماز پڑھنے والا ہونا چاہیے، سب کچھ اسی کی طرف سے ہوتا ہے، ذریعہ وسبب کے طور پر دوسرے استعمال ہوتے ہیں۔

(۳۹) یہ یقین دل میں بٹھالو کہ ہماری ہر خوشی اور ہر غم اسی سے وابستہ ہے، صحت وبیماری وہی دیتا ہے، تنگی میں ڈالنا اور کشادگی عطا کرنا، زندہ رکھنا اور موت دینا، سب کچھ اسی کے اشارے سے ہوتا ہے، صحابہ کرام نے اس مسئلہ کو سمجھا، انہوں نے اللہ کو راضی کرلیا، تو ان کی آخرت بھی درست ہوگئی، بڑی بڑی سلطنتیں ان کے قدموں میں آگئیں، حالانکہ اسلام میں داخل ہونے سے پہلے وہ بہت سی مصیبتوں میں مبتلا تھے، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، بدامنی کی زندگی گذار رہے تھے، کوئی چین نہیں تھا، کوئی خوش حالی نہیں تھی، لیکن جب اللہ کی اطاعت کرلی، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرلیا تو بدامنی امن میں بدل گئی، فاقہ کشی دولت مندی میں بدل گئی، بے نظامی حکومت سے بدل گئی، بے عزتی عزت سے بدل گئی، دنیا وآخرت کے معاملات درست ہوگئے۔

(۴۰) دین کی خدمت کے لیے تیار ہو جاو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اسلام بہت کمزوری کی حالت میں آیا، یعنی اجنبی بن کر آیا، کوئی اس کا پہچاننے والا نہیں تھا، کوئی اس کا استقبال کرنے والا نہیں تھا، کوئی اس کا چاہنے والا نہیں تھا، کوئی اس کا مددگار نہیں تھا، بلکہ ساری دنیا اس کی مخالف ہوگئی، لوگ دشمن بن گئے، لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ

وسلم نے ساری زندگی محنت کی اور ایک ایک کر کے لوگ مسلمان ہوتے گئے اور وہ بھی دین کی خدمت میں لگ گئے، سارے صحابہ نے اسی طرح اپنی زندگی کی بازی لگا کر اس دنیا میں اسلام کا بول بالا کیا، اسلام کا جھنڈا بلند کر کے چھوڑا۔

(۴۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے قریب ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ جب اسلام کا جھنڈا اور حامی و مددگار کوئی نہیں رہے گا، ہر ایک اپنے اپنے کام میں مست ہوگا، اور اسلام کی حالت بگڑتی جائے گی، اسلام کی ایک ایک شاخ توڑ دی جائے گی، ایک ایک درخت کٹے گا، اور مسلمان تماشہ دیکھتے رہیں گے، ان کی کوئی فکر نہ ہوگی، اور اسلام بالکل اجنبی بن کر رہ جائے گا۔

(۴۲) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں خوشخبری دیتا ہوں ان لوگوں کو جو اس زمانے میں اسلام کے مددگار بنیں گے، اسلام کا ہاتھ بٹائیں گے، اسلام کو دنیا میں مضبوط بنانے کے لیے محنت کریں گے، ان کے لیے آقائے دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشخبری دی ہے۔

(۴۳) آج دین کے احکام ہماری نگاہوں کے سامنے توڑے جا رہے ہیں، ہزاروں ایسے ہوں گے جو ہماری نگاہوں کے سامنے نماز سے بے پرواہ ہیں، روزے کا مذاق اڑاتے ہیں، لیکن اگر قیامت میں ہم سے سوال ہوگا تو ہمارا کیا جواب ہوگا۔

(۴۴) دنیا میں بہت سے لوگ یکساں عمل کرتے ہیں، لیکن ان کی کیفیتیں الگ الگ ہوتی ہیں، ثواب اور جزاء میں بہت فرق ہوتا ہے، حضرت ابو بکر صدیق کی دو رکعت کے بدلے حضرت عمرؓ اپنی زندگی بھر کے اعمال دینے پر راضی ہو گئے، حضراتِ صحابہ کرام کی دو رکعت کا مقابلہ ہم سب کی نمازیں نہیں کر سکتیں، یہ اہلیت اور اخلاص کی وجہ سے ہے۔

(۴۵) مسلمان اس دنیا میں اپنے اخلاص کے درجے کو اونچا سے اونچا بنائے،

جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا'' جواپنی زندگی اور موت کو آج بھی اللہ کے لیے وقف کردیتا ہے، اس کا مقام بہت اونچا ہو جاتا ہے۔

(۴۶) سارے انبیاء علیہم السلام دین کی دعوت کی جدو جہد میں مصروف رہے، خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن یہی دعوت کا عمل تھا، آج بھی یہ عمل مسلمانوں کو عروج کی طرف لے جا سکتا ہے۔

(۴۷) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو صفا کی پہاڑی پر جہنم میں لے جانے والے اعمال سے ڈرایا، ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیے، اپنی زندگی کے ہر عمل پر خدا تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے، انسان دنیا میں سانپ سے بھی ڈرتا ہے، بچھو سے بھی ڈرتا ہے ، شیر سے بھی ڈرتا ہے، یہاں تک کہ کھٹمل اور مچھر سے بھی ڈرتا ہے، مگر خوف کے درجات مختلف ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے، اللہ تعالیٰ ساری کائنات کا خالق ہے۔ سب سے زیادہ خوف اسی سے ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ کھلے عام جو عام عمل ہو اسے بھی جانتا ہے، اور بند کمرے میں جو برائی ہو، اس سے بھی خوب واقف ہے۔

(۴۸) حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے پسند ہے کہ میں اللہ کی راہ میں شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، یہ جذبہ عشق ہے، اللہ کی محبت ہے، وہی مردانِ خدا کے تیور ہوتے ہیں، یہی شیروں کے انداز ہوتے ہیں۔

(۴۹) مشورے اور اتفاق رائے سے معاملات طے ہوتے ہیں، چوں کہ آج کل یہ بات چھوٹ گئی ہے، اس لیے گھر گھر میں جھگڑے ہیں، اختلافات کی کثرت اتنی ہے کہ آپس میں ملاقات تک دشوار ہے۔

درخشاں ستارے

اس میں شک نہیں کہ دارالعلوم سبیل الرشاد ایک ایسا ادارہ ہے جسے جنوبِ ہند میں دینی فضاء پیدا کرنے اور خالص دینی علوم کی آبیاری کرنے میں اولیت کا شرف حاصل ہے اسی کے ساتھ ساتھ آج کے اس دور میں جب شہر گلستاں بنگلور کے ہر محلے میں، ہر گلی کوچے میں مدارس ومکاتب قائم ہیں، چھوٹے چھوٹے مکتبوں سے لے کر مکمل عالمیت وفضیلت اور افتاء کی تعلیم دینے والے ادارے اپنی اپنی بساط بھر دینی خدمات میں مشغول ہیں، دارالعلوم سبیل الرشاد اپنی ایک الگ پہچان اور منفرد شناخت رکھتا ہے۔

آج جب ہم اس تناور درخت کو دیکھتے ہیں تو ہمارا سینہ خوشی سے بھر جاتا ہے ۔اس میں دو رائے نہیں کہ دارالعلوم سبیل الرشاد کہ جس کی تاسیس کو ابھی نصف صدی ہی گذری ہے، اس کا فیض دنیا کے کونے کونے تک پہنچ چکا ہے۔ ایک وقت وہ تھا جب کرناٹک کی سرزمین دینی علوم کے اعتبار سے وادی غیر ذی زرع اور سنگلاخ چٹان کے مانند تھی، اللہ کے ایک بندے نے (جنہیں معتقدین ''حافظ، قاری، مفتی، علامہ، شاہ، امیر شریعت، بانی، مہتمم، رئیس العلماء، افضل العلما، منشی فاضل، وغیرہ کے القاب سے موصوف کرتے ہیں، مگر وہ تاحین حیات ان القابات سے بے نیاز ہر خرد وکلاں کے پاس'' بڑے حضرت'' کے لقب سے پہچانے جاتے رہے۔ ہر کوئی آپ کو بڑے حضرت ہی کہتا تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ یہ لفظ تمام القابات پر بھاری ہے) عزم مصمم کیا اور علوم دینیہ کی ترویج

واشاعت کے لیے کمر کس لی۔

یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ جب کوئی بندہ اللہ کا نام لے کر اخلاصِ نیت کے ساتھ دین کی کسی خدمت کے لیے اٹھتا ہے تو اسے معاونین ورفقائے کار بھی ایسے ہی ملتے ہیں جو مخلص، سعادت منداور محنتی ہوتے ہیں۔ یہی حال بڑے حضرت کا تھا، جب آپ نے دارالعلوم سبیل الرشاد کے نام سے ایک چھوٹے سے مدرسے کی بناء ڈالی، تو اس پودے کی آبیاری کرنے اور اسے پروان چڑھانے کے لیے آپ کو مخلص رفقائے کار کی ایک ایسی جماعت ملی جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

آج کے اس مبارک موقع پر جب کہ دارالعلوم اپنی تاسیس کے پچاس سال مکمل کرنے پر بارگاہِ ایزدی میں سجدۂ شکر بجالاتے ہوئے جشنِ زریں کا انعقاد کررہا ہے، آئندہ سطور میں دارالعلوم کے چند اساتذہ کا ذکر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جنھوں نے اس ادارے کو پروان چڑھانے میں اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے۔ دارالعلوم سبیل الرشاد کے تمام ہی اساتذہ خواہ انہوں نے تاحیات مدرسہ میں خدمت انجام دی ہو، یا ایک محدود عرصے تک دارالعلوم کی خدمت کی ہو، اس کے مستحق ہیں کہ ان پر ایک تحقیقی تصنیف قلمبند کی جائے، تاہم سرِ دست بعض اساتذہ کا نہایت مختصر تذکرہ درج ذیل ہے، لَعَلَّ اللّٰہُ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمراً

حضرت مولانا نیّر ربانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

میرے مشفق استاذ افضل العلماء حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب، المعروف بہ ''نیر ربانی صاحب'' دارالعلوم سبیل الرشاد کے ان عظیم المرتبت شخصیتوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی ساری زندگی اس مدرسے کو ترقی دینے میں وقف کردی۔ آپ اپنے لیے کم

اور طالبان علوم دین کے لیے زیادہ زندہ رہے۔ حضرت نیر ربانی صاحب بڑے حضرت کے شاگرد بھی تھے، آپ نے بڑے حضرت سے میل وشارم کے اسلامیہ ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی، جب بڑے حضرت نے دار العلوم سبیل الرشاد کی بناء ڈالی تو مولانا نیر ربانی صاحب کو تدریس کے لیے بلایا، بڑے حضرت کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے مولانا نیر ربانی صاحب سرکاری ملازمت کو چھوڑ کر دار العلوم سبیل الرشاد فروکش ہوئے اور پوری زندگی دار العلوم کی خدمت کرتے رہے۔

حضرت مولانا نیر ربانی صاحب دار العلوم سبیل الرشاد کے لیے ''وزیر خارجہ'' کی حیثیت رکھتے تھے، اللہ کے راستے میں تبلیغی جماعت لے کر آپ نے تقریباً ساری دنیا کا سفر کیا تھا، جس کی وجہ سے آپ کئی ایک زبانوں پر اہل زبان کا سا عبور رکھتے تھے۔ دار العلوم سبیل الرشاد کو غیر ممالک سے طلبہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے تو حضرت مولانا نیر ربانی صاحب کی زبان دانی کا انہی بڑا فائدہ ہوتا۔ انگریزی زبان میں تو حضرت یدطولیٰ رکھتے تھے، غیر ممالک کی جماعتیں دار العلوم کی زیارت کو آتیں تو ان کے بیانات کی ترجمانی حضرت ہی فرماتے۔

دار العلوم سبیل الرشاد کے ہر کام کو حضرت اپنا کام سمجھتے تھے، مدرسے میں کبھی مالی طور پر کچھ مشکلات پیش آتیں تو آپ کمر بستہ ہو کر نکل جاتے، اور مالی معاونت حاصل کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتے، آپ کا ہر ایک سے اس کے مناسب بات کرنے کا اور فرد شناسی میں ایک خاص اسلوب تھا، مدرسہ کی ضرورت موثر پیرائے میں معاونین کے سامنے پیش کرتے۔

طلبہ سے آپ کو ایک خاص قسم کا والہانہ لگاؤ تھا، ہمہ وقت ان کے اصلاح کی فکر

دامن گیر رہتی، الفت ومحبت ایسی کہ کوئی چھوٹا سا طالب چاہتا تو جاکر اپنی مشکل حضرت کو سنا سکتا تھا، ہمہ وقت طلبہ کے کام آنے کا ایک جذبہ آپ میں موجزن رہتا۔ کھلے ہاتھ اور کھلے دل کے مالک تھے، راقم نے کبھی آپ کو تنہا کھاتے نہیں دیکھا، جب بھی کھانا کھاتے کسی طالب علم کو اپنے خوانِ نعمت پر ضرور شریک کرتے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ کسی طالب علم کو معمولات مدرسہ کی کسی خلاف ورزی پر مطبخ سے کھانا بند کروادیتے، پھر کھانے کے وقت اسے اپنے کمرے میں بلاکر، اپنے دسترخوان پر کھانا کھلاتے۔ کھانا کھلانا ہی ہے تو پھر مطبخ سے کھانا بند کروانے کی کیا ضرورت؟ فرماتے: ''وہ ضابطہ کا تعلق ہے، یہ رابطہ کا تعلق ہے''۔

اردو ادب پر بھی حضرت کی گہری نگاہ تھی، آپ بذاتِ خود پایے کے ادیب تھے ہی، ساتھ ہی ساتھ طلبہ کو اردو کی نزاکتوں کی طرف خوب توجہ دلاتے۔ اردو املا، اردو قواعد اور الفاظ کے موقع استعمال سے طلبہ کو خوب واقف کراتے۔ نثر اور نظم پر کامل دسترس تھی، دارالعلوم سبیل الرشاد کے رسالے سلسبیل میں آپ کے متعدد مضامین اور منظومات قارئین کی نذر ہو چکے ہیں۔

وہ ۱۹۹۴ء کی ایک حسرت بھری رات تھی، جب آپ کسی سفر سے واپس ہوکر مدرسہ پہنچے، حسب عادت شعبہ حفظ کی درسگاہوں میں گئے، طلبہ کو سستی پر تنبیہ فرمائی اور اپنے کمرے کو لوٹ آئے پھر آناً فاناً ہمہ صفات سے متصف، متنوع خوبیوں سے آراستہ ہمارے حضرت ہم سب کو حیراں وپریشاں چھوڑ کر مالکِ حقیقی سے جاملے۔ اللہ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب مظاہریؒ

میرے استاذ محترم حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کا شمار مدرسہ کے اولین

اساتذہ میں ہوتا ہے۔آپ ''بڑے حضرت'' کے چھوٹے بھائی ہونے کی حیثیت سے ''چھوٹے حضرت'' کے نام سے جانے جاتے تھے،آپ نے ابتدائی تعلیم مدرسہ منبع العلوم لال پیٹ میں حاصل کی۔اس کے بعد مظاہر العلوم سہارنپور سے سند فراغت حاصل کی۔ پھر آپ نے اپنے مادر علمی مدرسہ منبع العلوم لال پیٹ میں سات سال تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ اور پھر دارالعلوم سبیل الرشاد بلائے گئے تو تا حیات دارالعلوم کے صدر المدرسین رہے۔افہام وتفہیم کا ملکہ خداداد تھا،آپ نے بلا کی ذہانت پائی تھی،درسِ نظامی میں معقولات ان فنون کو کہا جاتا ہے جو براہِ راست قرآن وسنت سے متعلق نہیں، بلکہ انسانی کدوکاوش کا اس میں بڑا دخل ہے۔چھوٹے حضرت معقولات میں کمال درجے کی مہارت رکھتے تھے۔منطق،ریاضی،فلسفہ،اور ہیئت پر حضرت کی گہری نگاہ تھی،فن ہندسہ سے طبعی وابستگی تھی،جس کا نتیجہ تھا کہ ایک آپ بذاتِ خود ایک ماہر انجینئر تھے اور تعمیراتی کاموں میں اپنے ذہانت کا لوہا منوانے والے۔دارالعلوم سبیل الرشاد کی عمارتیں اس کا زندہ ثبوت ہیں۔فن ہیئت میں مہارت کی بناء پر بیشتر مساجد کا سمتِ قبلہ آپ کی رہین منت ہے۔

آپ ساری عمر ''بڑے حضرت'' کا ساتھ دیتے رہے۔عمر میں ایک وقت وہ بھی آیا جب بڑے حضرت نے آپ کو کسی مصلحت کی بناء پر دارالعلوم سبیل الرشاد سے دور، بلکہ بنگلور سے دور مدرسہ داؤدیہ اریوڈ میں ذمہ داری سنبھالنے کے لیے کہا تو آپ نے ناموافقتِ طبع کے باوجود بلا چون وچرا حضرت کے حکم کو مان لیا۔''اطاعتِ امیر'' کا ایسا عملی نمونہ آپ نے پیش کیا ہے جو بعد والوں کے لیے بہت مشکل ہے۔

آپ مدرسے کے امور میں ''وزیر داخلہ'' جیسی شان رکھتے تھے،طلبہ کے امور،

اساتذہ کے دروس وغیرہ آپ کی اجازت سے طے ہوتے۔ ایک دفعہ مدرسے کے طلبہ میں آپس میں کسی بات پر سخت جھگڑا ہو گیا اور سارا ماحول گرم ہو گیا۔ منتظمین پریشان تھے کہ اس معاملے کو کیسے سلجھائیں، ایسے نازک وقت میں ''چھوٹے حضرت'' نے ہمتِ مردانہ سے کام لیتے ہوئے، دونوں متحارب گروپ طلبہ کو بلایا، اور ایک ہنگامی مجلس طے کر کے دونوں فریق کو اپنے اپنے دلائل پیش کرنے کا موقع دیتے ہوئے معاملہ کو حل فرمایا اور مصالحت کرا کر ہی دم لیا۔ ممکن ہے آج یہ بات کسی کی سمجھ میں نہ آئے مگر جو لوگ اس وقت موجود تھے یا جنہیں ایسے حالات سے سابقہ پڑا ہو وہ ان الفاظ کا وزن ضرور محسوس کریں گے۔

طلبہ کے ساتھ آپ کا تعلق ایک شفیق باپ جیسا تھا۔ طلبہ کو تعلیم کے ساتھ ساتھ بدن کی تندرستی کی طرف خاص توجہ دلاتے، بعضوں کو لاٹھی چلانا بھی سکھایا، اللہ نے آپ کو دولت وثروت سے بھی نوازا تھا، اسی کے ساتھ ساتھ آپ جود وسخا میں حاتمِ وقت تھے۔ طلبہ پر ہمیشہ مہربان رہتے اور ان کی مدد فرمایا کرتے، خصوصاً عاشورے کے دن طلبہ کی دعوت کرنا آپ کا عمر بھر کا معمول رہا، الحمد اللہ آپ کے فرزند نے آپ کے بعد بھی اس سلسلہ کو جاری رکھا ہے۔

اخیر عمر میں جب کہ بدن بھاری ہو گیا تھا اور چلنے پھرنے میں کافی دقت محسوس کرتے تھے، اس کے باوجود پابندی وقت کے ساتھ مدرسہ تشریف لاتے اور متعلقہ کتابوں کا نصاب مکمل فرماتے۔ انگریزی دواؤں کے مقابل آپ یونانی دواؤں کو زیادہ ترجیح دیتے ۔آپ خود یونانی طب کے ماہر اور حکیم تھے۔ پریشان حال طلبہ کبھی حاضر ہوتے تو آپ ان کی تشخیص کرتے ہوئے دوائیں دیتے تھے۔ الحمد للہ طلبہ کو ہمیشہ فائدہ ہوا۔

بالآخر ایک دیڑھ ماہ کی مختصر علالت کے بعد مورخہ چوبیس اگست ۲۰۰۴ء کو جب

کہ تمام طلبہ اور اہالیانِ مدرسہ اس امید میں تھے کہ حضرت آج مدرسہ تشریف لائیں گے، کل مدرسہ تشریف لائیں گے آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور ساری زندگی جس مدرسے میں خدمت کی تھی، اپنی جوانی وکہولت کی ساری توانائیاں جس کی ترقی وتعمیر میں صرف کی تھی اسی کی آغوش میں سپردِ خاک ہوئے۔ رحمه الله رحمة واسعة

حضرت مولانا قاری محمد امداد اللہ انجم رشادی رحمہ اللہ

میرے مشفق ومربی استاذ حضرت مولانا قاری امداد اللہ انجم سعودی رشادی، دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور کی ان جامع الصفات اور جامع الکمالات شخصیتوں میں سے ہیں جن کے بارے میں کچھ تحریر کرنے میں بہت خوف محسوس ہوتا ہے۔ آخر ایک دو اوصاف ہوں تو کیوں زیرِ بیان بھی لائے، آپ ہمہ جہت بزرگوں میں سے تھے، آپ ایک ماہر مدرس، بہترین استاذ، مشفق مربی، صاحبِ طرز ادیب، ماہر مصنف، فی البدیہہ شاعر بلکہ نعت گو، عالمی سطح پر شہرت یافتہ قاری ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دلِ دردمند کے مالک تھے، اور یہ وہ جنسِ گراں مایہ ہے جو اب خال خال ہی ملتی ہے۔

طلبہ کے ساتھ آپ کا رویہ نہایت مشفقانہ ہوتا، طلبہ کے ساتھ حسن سلوک ہم نے آپ ہی سے سیکھا ہے، بسا اوقات چھٹیوں کے دنوں میں آپ اپنے فرزندوں کے ساتھ چند طلبہ کو بھی سیر وتفریح کے لیے لے جاتے، مدرسے کے دنوں میں کسی طالب علم کو کہیں ساتھ لے جاتے تو باوجود اس کے کہ راستے ہی میں خوب کھلا پلا چکے ہوتے، مدرسہ پہنچ کر فرماتے، ”میاں، مطبخ بند ہوگیا ہو تو میرے گھر آکر کھالو“

شعر وشاعری سے آپ کو طبعی مناسبت تھی، خود بلند پایہ شاعر تھے، نعت گوئی میں خصوصی ملکہ رکھتے تھے، اسی کے ساتھ ساتھ آپ شاعر گر بھی تھے، طلبہ میں جو شعر وشاعری

سے ہلکی سے مناسبت رکھتے، حضرت انہیں اپنے گھر میں بلا کر جہاں ماہانہ مشاعرہ ہوتا تھا ہمت افزائی کرتے تھے۔ حضرت نیر ربانی صاحب کے انتقال کے بعد آپ نے اپنے مکا ن میں ''بزم ربانی'' کے نام سے ایک ماہانہ محفل مشاعرہ کی بناء ڈالی تھی، بعد میں احباب کے اصرار پر اس بزم کا نام بزمِ انجم رکھا گیا۔

اپنی زندگی کے آخری ایام آپ نے ایک مرض کی بناء پر نہایت تکلیف سے گزارے، بے انتہاء تکلیف کے باوجود زندگی بھر کبھی آپ نے اپنی زبان پر حرفِ شکایت آنے نہ دیا۔ صبر وشکر کے ساتھ گزارا کرتے رہے۔ احقر کا حضرت سے طالبعلمی کے زمانے ہی سے خادمانہ تعلق تھا، اس کے بعد بھی جب کبھی بندہ حاضر خدمت ہوتا تمام اہل خانہ کا نام لے لے کر خیریت دریافت کرتے ۲۰۰۱ء کی بقرعید کا دوسرا دن تھا کہ شدتِ مرض سے نبرد آزما یہ اللہ کا مخلص بندہ ہزاروں طلبہ و متعلقین کو روتا بلکتا چھوڑ کر خداوند قدوس کی جوارِ رحمت میں جا بیٹھا۔

احقر کی زندگی میں بہت مواقع ایسے آئے جب حضرت قاری محمد امداد اللہ انجم صاحب کی دردمندی، خلوص، اور شفقت ومہربانیاں اسے رہ رہ کر یاد آتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ اپنے اس مخلص بندے کی تقصیرات کو معاف فرما جیسا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں مجھ جیسے نالائق طالب علموں کی غلطیوں سے ہمیشہ درگذر کیا تھا اور انہی کروٹ کروٹ جنت نصیب فرما آمین۔

حضرت مولانا محمد میران صاحب باقویؒ

میرے استاذ و محسن حضرت مولانا محمد میران صاحب باقوی ایک مرد باصفا اور ولی صفت بزرگ تھے، آپ کا درس نہایت 'شیرینی' لیے ہوتا، اور میں سمجھتا ہوں یہ لفظ

’شیرینی‘ ان لوگوں کو اور میٹھا محسوس ہوگا جنہوں نے حضرت کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے درس لیا ہے۔ یہ ’شیرینی‘ کئی اعتبار سے تھی، شیرینی اس اعتبار سے بھی کہ حضرت متعلقہ کتاب کا مضمون اس آسانی سے طلبہ کے ذہن نشین کرا دیتے کہ کند ذہن سے کند ذہن طالب علم بھی سبق بآسانی سمجھ جاتا اور شیرینی اس اعتبار سے بھی کہ حضرت دورانِ درس اپنے عجیب وغریب واقعات سناتے، جس سے درس کی لذت دو چند ہو جاتی، شیرینی اس اعتبار سے بھی کہ حضرت طلبہ سے ہفتہ میں ایک بار ایک ہزار بار درود شریف **جَزَا اللّٰهُ عَنَّا مُحَمداً بِمَا هُوَ اَهْلُهُ** پڑھوا کر اپنے صرفہ سے بہترین ’شیرینی‘ تقسیم فرماتے، تقسیم شیرینی سے قبل حضرت اجتماعی دعا فرماتے، آپ کی دعا کا ایک خاص انداز تھا، آپ خدا سے ایسا مانگتے جیسے کوئی شخص اپنے سامنے موجود دوست سے اپنی ضرورت کی چیزیں بلا تکلف مانگتا ہے۔ فرماتے ”اے اللہ مجھے یہ چاہیے، یہ چاہیے، جلدی بھیجو، دیری مت کرو، جلدی بھیجو“ ہم طلبہ کو کبھی حضرت کے اس طرز دعا سے ہنسی بھی آتی مگر حضرت کسی کی ہنسی کی پرواہ کیے بغیر استغراق کے عالم میں اپنے خدا سے بے تکلفانہ مانگتے چلے جاتے۔

آپ کی ذات ایک مرنجاں مرنج صفات کی حامل تھی، آپ ایک ماہر مدرس تھے، خصوصاً جن شاگردوں نے آپ کے پاس تقسیم ترکہ کی کتاب ”سراجی“ پڑھی ہے وہ تقسیمِ ترکہ کے شرعی حسابات بآسانی حل کر لیتے ہیں۔ یہاں یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ حضرت کا ”سراجی“ پڑھانے کا ایک منفرد انداز تھا۔ حضرت نے اپنے ذاتی تجارب اور شب وروز کی محنت سے ایک کاپی تیار کی تھی جس میں تقسیم میراث کی فرضی مثالیں جمع کی تھیں، آپ پہلے اپنی کاپی طلبہ کو دے کر انہی اس کی مثالیں اپنی کاپیوں میں ہو بہو نقل کرنے کو کہتے، جب طلبہ حضرت کی کاپی سے ساری مثالیں اپنی کاپیوں میں نقل کر چکے ہوتے تو حضرت اب

کتاب پڑھانا شروع کرتے اور کتاب کی عبارت کو کاپی کی مثالوں سے اس طرح سمجھاتے کہ بات سیدھی دل میں گھستی چلی جاتی۔

اسی کے ساتھ آپ ایک متدین عامل بھی تھے۔ ہندو بیرونِ ہند آپ نے قرآنی عملیات کے ذریعے سے بہت سے پریشان حالوں کو اطمینان دلایا، نیز بہت سے خواہش مندوں نے آپ سے عملیات کی تعلیم حاصل کی ہے ۔عملیات کے سلسلے میں آپ احکامِ شرع کا خاص لحاظ کرتے ،نمونے کے طور پر ایک چھوٹا سا واقعہ جسے خود آپ نے بیان کیا تھا نقل کرتا ہوں کہ ایک دفعہ ایک عورت حاضر ہوئی اور کہنے لگی کہ میرے شوہر نے دوسری شادی کرلی ہے، آپ جو فیس لینا ہے لیجیے مگر ایسا عمل کریں کہ اس عورت کی محبت میرے شوہر کے دل سے نکل جائے۔حضرت نے فرمایا ''ایسے ہم نہیں کرتے، البتہ اگر چاہو تو ایسا عمل کریں کہ تمہارے شوہر تم کو بھی چاہنے لگیں اور تمہارے حقوق بھی ادا کرنے لگیں''۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت میران صاحب کو روپیوں پیسوں سے خوب نوازا تھا۔ مدرسے سے ملنے والی تنخواہ آپ کی ماہانہ آمدنی کا عشرِ عشیر بھی نہ ہوگی۔لیکن آپ کے دل میں ہمیشہ یہ احساس رہتا جس کا آپ نے کسی موقع سے اظہار بھی کیا تھا کہ مدرسہ اور مدرسہ کی تنخواہ ہی اصل ہے۔ اللہ نے جو کچھ دیا ہے اسی مدرسے کی برکت سے دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وصولِ مشاہرہ کے وقت آپ ہمیشہ اول نمبر پر حاضر رہتے۔

یہ سن ۲۰۰۲ کی بات ہے، حضرت میران صاحب نے رمضان کی چھٹیوں میں بیرونی ممالک کے دورہ اور واپسی میں عمرے کے ارادے سے نکلے۔ دورہ مکمل کرکے آپ نے عمرہ فرمایا، مطاف میں آپ یادِ الٰہی میں مصروف بیٹھے تھے کہ اچانک فرشتۂ اجل آپہنچا اور آپ خوشی خوشی بارگاہِ ایزدی میں حاضر ہوگئے۔آپ کی حیاتِ طیبہ بھی نہایت مبارک تھی، موت بھی نہایت

مبارک۔ سلف صالحین کے پہلو میں جنت المعلیٰ میں آپ دائمی استراحت فرما رہے ہیں۔

حضرت مولانا قاضی خطیب محمد یوسف باقویؒ

سادگی کا پیکر، اپنے کام سے کام رکھنے کا مزاج، باطنی خوبیوں سے آراستہ مگر بظاہر ایک معمولی انسان، یہ تھے ہمارے ہر دلعزیز استاذ حضرت مولانا حضرت مولانا قاضی خطیب محمد یوسف صاحب باقوی رحمہ اللہ۔

آپ کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ ابھی آپ جامعہ باقیات صالحات ویلور میں طالب علم ہی تھے کہ آپ کے اساتذہ نے آپ کو چھوٹی جماعت میں پڑھانے کا موقع عنایت فرمایا۔ یہ آپ کی قابلیت کی ایک انوکھی مثال ہے۔ آپ نے پختگی کے ساتھ درس نظامی کی تکمیل فرمائی تھی۔ جس کا اثر یہ تھا کہ کبرِ سنی کے باوجو آپ کو مغلق عبارتوں کے حل کرنے میں کچھ دشواری نہ ہوتی، مدرسے کے جوان اساتذہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر پیچیدہ عبارتیں حل فرما لیا کرتے۔ خود راقم الحروف نے یہ کئی بار دیکھا کہ جلسہ دستار بندی سے پیشتر کوئی طالب علم حاضر ہوتا کہ حضرت مجھے فارسی زبان میں تقریر کرنے کا حکم دیا گیا ہے، آپ تقریر تحریر فرما کر عنایت فرمایئے تو حضرت اسی وقت کاغذ قلم لے کر فی البدیہہ ایک عمدہ تقریر فارسی زبان میں تحریر کر کے دے دیتے۔

آپ ایک متبحر عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر ڈاکٹر بھی تھے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک طالب علمی کے زمانے میں ایک دفعہ میں بیمار ہوا، اس وقت یہاں قریب میں کوئی دواخانہ بھی نہ تھا، ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ حضرت قاضی صاحب کے پاس چلے جاؤ، حضرت کے پاس حاضر ہو کر احوال سنایا تو حضرت نے فوراً چند گولیاں کھانے کے لیے دیں، الحمدللہ فوراً مرض دور ہو گیا۔

آپ کا شمار دار العلوم سبیل الرشاد کے اولین اساتذہ میں ہوتا ہے، ۱۹۶۰ سے ۱۹۶۶ تک آپ دار العلوم سبیل الرشاد میں بحیثیت مدرس خدمت انجام دیتے رہے، پھر کچھ حالات کی بناء پر آپ مدرسہ ضیاء العلوم بسونگڈھی تشریف لے گئے، اسی دوران ۱۹۷۲ سے بارہ سال تک آپ مدرسہ رحمانیہ کمبی پور میں بھی صدر مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، ناظمِ تعلیمات کے منصب پر فائز تھے۔ اس کے بعد ۱۹۸۴ میں آپ کو بڑے حضرت کی دعوت پر دوبارہ دار العلوم سبیل الرشاد میں تدریس کی ذمہ داری سنبھالی، آپ کے سینکڑوں شاگرد ملک اور بیرونِ ملک مختلف دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ دار العلوم سبیل الرشاد میں استاذ ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے حضرت قبلہ کے ساتھ مرکزی دار القضاء میں معین قاضی کی حیثیت سے بھی خدمت انجام دیتے رہے، اور پھر بڑے حضرت کے وصال کے بعد آپ کو قاضی شریعت کا منصب تفویض کیا گیا، پھر آپ تا حیات مرکزی دار القضاء کے قاضی رہے۔ ''قاضی صاحب'' کا لفظ آپ کے ساتھ ایسا پیوست ہوگیا تھا جیسے یہ آپ کا پیدائشی نام ہو۔ اور حق تو یہ ہے کہ آپ نے اس منصب کا حق ادا کردیا، آپ وقت کے بڑے پابند تھے، کمبی پور سے جو کہ مدرسے سے تقریبا چالیس کلومیٹر دور ہے، حضرت کو روزانہ صبح نو بجے دار القضاء آنا ہوتا، ذاتی سواری بھی نہ تھی، لیکن حضرت سرکاری بسوں کے ذریعے وقتِ مقررہ پر مدرسہ حاضر ہوجاتے۔ کبھی اس سلسلے میں حضرت سے تاخیر نہ ہوئی۔ آپ نے دار القضاء کو کبھی اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال نہیں کیا، اس سلسلے میں اس درجہ احتیاط فرماتے کہ دار القضاء سے واپسی کے وقت مقدمے کے کسی فریق کی سواری پر شہر جانا آپ نے کبھی گوارا نہ کیا۔ لوگوں کے اصرار کے باوجود معذرت کرتے ہوئے سرکاری بس میں چلے جاتے۔ دار القضاء میں ہمیشہ متفکر بیٹھتے تھے اور کل ہونے

والے مقدمے کے سارے پہلوؤں کو آج ہی سے سوچ کر رکھتے۔ اللہ تعالیٰ نے راقم الحروف کو حضرت کی معیت میں دارالقضاء میں کام کرنے کا موقع دیا ہے۔ بندہ نے قضاء کے تعلق سے جو کچھ سیکھا ہے وہ حضرت ہی کی توجہات کا ثمرہ ہے۔

حضرت اپنے باطنی کمالات اور فنی عبور کے ساتھ ساتھ مزاجاً خاصے بذلہ سنج بھی تھے، کبھی کبھار دارالقضاء میں بیٹھے بیٹھے ایسی ظریفانہ باتیں کرتے کہ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلتا۔ اسی کے ساتھ ساتھ آپ بڑے فردشناس بھی تھے، اور یہ فردشناسی ایسا جوہر ہے جس کی دارالقضاء میں قدم قدم پر ضرورت پڑتی ہے۔

آپ نہایت کفایت شعار تھے، سادہ زندگی گزارتے، اپنا کام اپنے ہاتھوں کرتے، آپ کو کسی سے اپنی خدمت لینا طبعاً پسند نہیں تھا۔ جفاکشی اور محنت سے آپ نے زندگی گزاری، تیراکی کا بھی آپ بڑا شوق رکھتے تھے۔

۱۲۶ کتوبر ۲۰۰۴ء کو رمضان المبارک کے دوسرے عشرے (عشرۂ مغفرت) کے پہلے دن آپ نے اس دارِ فانی کو الوداع کہا اور سادگی، جفاکشی، عزم مصمم، علوم وفنون میں گہرائی وگیرائی رکھنے والا ایک کوہِ ہمالہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اللہ غریقِ رحمت فرمائے، آمین۔

حضرت مولانا حافظ عبدالمالک صاحبؒ

حضرت مولانا حافظ عبدالمالک صاحب ان برگزیدہ شخصیات میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی قرآن کی خدمت میں صرف کردی اور حدیث نبوی خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ ''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے'' کے مصداق جوانی سے بڑھاپے کی ساری منزلوں تک اسی خدمتِ قرآن کو اپنا

اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ ۱۹۶۶ سے آپ نے دارالعلوم سبیل الرشاد کے شعبہ حفظ کی کمان سنبھالی، اور ساری جوانی بچوں کو حافظ قرآن بنانے میں گزار دی۔ آپ طلبہ سے قرآن سنتے تو اس طرح سنتے کہ آپ کا سارا بدن کان بن جاتا، کیا مجال کہ کوئی طالب علم ایک لفظ غلط پڑھ کر آگے بڑھ جائے۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد ہزار سے متجاوز ہے، جو ملک اور بیرونِ ملک دینی خدمات میں مشغول ہیں، مثال کے طور پر حضرت مولانا محمد سیف الدین صاحب رشادی اور مولانا حنیف افسر عزیزی صاحب کا نام لیا جاسکتا ہے۔

جب تک ہمت نے ساتھ دیا آپ برابر مدرسے کو وقت مقررہ پر حاضر ہوتے رہے، اور شعبہ حفظ کی ذمہ داری کو نبھاتے رہے، اخیر اخیر عمر میں جب قویٰ مضمحل ہو گئے تو آپ نے اپنی ذمہ داریوں سے معذرت کر لی اور استعفیٰ پیش کر دیا۔ اس کے باوجود آپ کا قرآن سے لگاؤ کم نہ ہوا تھا، ضعف ونقاہت کے باوجود آپ اپنے محلے کی مسجد مسجد بدر میں نماز میں حاضر ہوتے اور نماز کے بعد تلاوتِ قرآن فرماتے، آپ کا یہ معمول تاحیات جاری رہا۔

۲۰۰۸ کے مارچ کی سولہ تاریخ کو قرآن کا یہ مخلص خادم ہزاروں ہزار شاگردوں کو داغِ مفارقت دیتے ہوئے قرآن کے اتارنے والے الہ العالمین کے دربار میں حاضر ہوگیا۔ دارالعلوم سبیل الرشاد میں شاگردوں اور متعلقین کے ایک جمِ غفیر نے نماز جنازہ ادا کی ،اور عمر بن الخطاب کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ اللہ حضرت کے ہزاروں ہزار حافظ شاگردوں کی تلاوتِ قرآن کا ثواب انہی پہنچا کر اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

اسم بامسمیٰ مردمجاہد قاضی مجاہدالاسلام صاحب

ابھی بین الاقوامی شہرت یافتہ حضرت مولانا امدادالقرا حضرت قاری امداداللہ صاحبؒ رشادی کا غم بھی دور ہونے نہیں پایا تھا کہ حضرت فقیہ العصر قاضی القضاۃ مردِمجاہد حضرت مجاہد الاسلام صاحب ُدام اقبالہٗ سے ُرحمہ اللہٗ ہوگئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) آپ کا دارِفانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر جانا، امت کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے، کیونکہ آج امت بڑے ہی نازک موڑ پر کھڑی ہوئی ہے، ایک طرف مدارس کو دہشت گردوں کا اڈہ کہا جارہا ہے تو دوسری طرف ہر ڈاڑھی والے کو طالبان کا چیلا سمجھا جارہا ہے۔ اسی طرح گجرات میں وزیرِاعلیٰ کی سرپرستی میں قوم کی دوشیزاؤں کی عزت وعصمت سے کھیلا جارہا ہے اور مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جارہی ہے، تو ایک طرف دشمنان اسلام مسجد کی جگہ پر مندر بنانے کی کوشش کررہے ہیں۔ ان سارے حالات میں حضرت قاضی مجاہدالاسلام صاحب کو رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہوئے قلم چلنے کو تیار نہیں۔ ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عجیب وغریب ملکہ سے نوازا تھا، چاہے وہ فقہی وعلمی میدان ہو چاہے ملی وسیاسی یا کوئی اور میدان۔ آپ ہر میدان کے غازی تھے۔

آپ کے اندر امت کا غم اور تڑپ اللہ تعالیٰ نے کوٹ کوٹ کر رکھا تھا۔ جس کسی جلسے میں آپ خطاب فرماتے تو کہتے کہ ایک ہوجاؤ، نیک ہوجاؤ۔ آپ نے جب آل انڈیا ملی کونسل کا تاسیسی اجلاس میسور میں ہوا تھا تو اپنے قیمتی خطاب میں امت کو اتحاد کی طرف آنے کے لیے بہترین مثال دے کر فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اے جماعتیو، اے قاسمیو، اے بدعتیو، اس طرح کہہ کر نہیں پکاریں گے۔ بس یا رب امتی امتی کہیں گے۔ اس لیے آپ حضرات بھی اپنے اپنے مسلک کو بالائے طاق رکھ کر متحد ہوجاؤ۔

آپ کو جب آل انڈیا مسلم پرنسل لاء بورڈ کا صدر منتخب کیا گیا تو آپ نے بورڈ میں سارے مسلکوں کے علماء کو جمع کر کے ملک کے پیچیدہ حالات کا جائزہ لیا اور شہر گلستان بنگلور میں جب آل انڈیا مسلم پرنسل لاء بورڈ کا جب جلسہ ہوا تو آپ نے بذریعہ میڈیا آر ایس ایس کے سربراہ سدرشن کو بڑے پیارے انداز میں اسلام کی دعوت دی۔

قاضی صاحب جب بھی دارالسرور بنگلور تشریف لاتے تو مادر علمی دارالعلوم سبیل الرشاد میں آپ کا قیام رہتا تھا۔ راقم الحروف حضرت کی خدمت میں جا کر دارالقضاء سے متعلق جو کوئی اشکال پیش کرتا، حضرت چٹکیوں میں اس کا حل بتا دیتے۔ آپ کا قوتِ حافظہ بڑے غضب کا تھا، کتب فقہ کی عبارتیں اس طرح از بر تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ دیکھ کر پڑھ رہے ہیں۔ آپ کو رئیس العلماء شاہ ابوالسعود احمد صاحب نوراللہ ضریحہ سے بڑی والہانہ عقیدت ومحبت تھی۔ آپؒ کی بڑی عزت فرماتے، اسی طرح مادرِ علمی دارالعلوم سبیل الرشاد کے فارغین سے بھی آپ کو بڑی محبت تھی۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ قاضی صاحب دارالعلوم سبیل الرشاد آئے ہوئے تھے، اور کافی علیل تھے۔ فارغین میں سے کسی نے حضرت قاضی صاحب کی خدمت میں حضرت امیر شریعتؒ کی وہیل چیئر پیش کی تو آپ نے اس پر بیٹھنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ حضرت امیر شریعت جس کرسی پر بیٹھتے تھے، اس پر میں کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔ اس طرح کہہ کر بیٹھنے سے بالکل معذرت کر لیے۔

آپ اپنے بیرونی اسفار میں رشادی علماء سے ملاقات ہو جاتی تو بڑی مسرت کا اظہار کرتے اور مختلف جلسوں میں برملا اس کا اظہار کرتے۔ آپ کی ظاہری شخصیت کو کوئی اجنبی دیکھتا تو یوں سمجھتا کہ شاید کوئی طالب علم ہیں یا عام آدمی ہیں، مگر جب آپ بولنے

لگتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ علم کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے، ہمارے طالب علمی کے دور میں حضرت قاضی صاحب جب طلبہ سے خطاب کرتے تو اکثر کہتے تھے کہ کسی بھی فن میں ہو، غواص بنو۔ کتابوں کے کیڑے بن جاؤ۔

حضرت قاضی صاحب کا ایسے نازک موڑ پر دنیا سے اٹھ جانے سے ہم نے نہ صرف ایک مقتدر جید عالم کو کھودیا ہے بلکہ ملت کا حقیقی درد رکھنے والے اور سیاسی بصیرت رکھنے والے ایک مردِ کامل کو کھودیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ساری امت کو صبر جمیل عطا فرمائے، سارے عالم کے مسلمانوں کو، ریاست کرناٹک کے مسلمانوں کو، خاص طور پر شہریانِ بنگلور کو اور ابنائے سبیل کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائے اور اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور اعلیٰ علیین میں اونچا مقام عطا فرمائے اور سارے مسلمانوں کا متحدہ پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ذمہ داروں کو اور سارے مسلمانوں کو آپ کی طرح اتحاد و اتفاق کی فکر نصیب فرمائے اور حضرت مردِ مجاہد مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ کے تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے

مطبوعہ

روزنامہ سیاست 16/04/2002

روزنامہ سالار 21/04/2002،

روزنامہ پاسبان 19/04/2002

بھلا سکے گی کہاں ان کی خدمتیں دنیا

حضرت الاستاذ مولانا نیر ربانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت پر قلم برداشتہ لکھا گیا مضمون

ناچیز رات آرام کررہا تھا کہ اچانک ساتھیوں نے بیدار کیا کہ اٹھو جلد اٹھو، حضرت نیر ربانی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ میں پریشان ہوکر بیدار ہوا اور مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ فوراً حضرت کے کمرے کی طرف دوڑا، وہاں دیکھتا ہوں کہ تمام طلبہ حضرت کے کمرے میں اور باہر کھڑے ہوئے ہیں، کمرے کے اندر داخل ہوا تو ایسا محسوس ہوا کہ حضرت گویا آرام کررہے ہیں۔ مجھے بالکل یقین نہیں آرہا تھا کہ حضرتِ والا کی روح پرواز کرچکی ہے۔

حضرت اتنے مشفق اور مربی تھے کہ اگر میں ان کے اوصاف بیان کروں تو ان کا احاطہ ناممکن ہے۔ کبھی ہم غلطی کرتے تو حضرت مطبخ سے کھانا موقوف کرادیتے اور فرماتے تھے کہ ضابطہ کے تحت آپ کا کھانا موقوف ہے، رابطہ کے تحت آپ میرے کمرے میں آکر میرے ساتھ کھانا کھالیں۔ حضرت کو برداشت نہیں ہوتا کہ ایک مہمانِ رسول کا کھانا موقوف ہو۔ اسی طرح ہماری غلطیوں پر حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم کھانا موقوف کرتے تو جہاں تک ہوسکے جتنا جلد ہوسکے حضرت مہتمم صاحب کے پاس سفارش کرکے کھانا جاری کرادیتے۔ حضرت کو ہم کبھی تنہا کھانا کھاتے ہوئے نہیں دیکھے۔ حضرت کے دسترخوان میں ہمیشہ مہمان ہوتے تھے، حضرت جب بھی شہر سے آتے تو کچھ نہ کچھ ساتھ لاتے تھے اور ہم طلباء کو ساتھ

کھانے میں بٹھا کر ہم کو بھی دیتے تھے چاہے وہ مٹھائی ہو یا پھل۔ آپ کے کھلانے کا انداز بہت لطیف ہوتا۔ کوئی حقیقی باپ بھی اپنے بچوں کو اتنی محبت سے نہیں کھلاتا ہوگا جتنا میرے یہ روحانی باپ کھلاتے تھے، اخیر میں حضرت فرماتے ''رے جلدی کھا کرڈ کان بند کرورے''

حضرت طلبہ کی ادبی انجمن جمعیۃ الارشاد کے نگراں بھی تھے، حضرت کے پاس جب کوئی درخواست لے کر جاتا اور اس درخواست میں کوئی غلطی ہوتی تو حضرت فرماتے کہ اردو قاعدے کے مطابق اس طرح لکھنا چاہیے۔ حضرت کے پاس کوئی اپنا ذاتی کام لے کر جاتا تو حضرت کبھی بھی نہ نہیں فرماتے۔ چاہے وہ کام اپنا ہو یا غیر کا ہو جہاں تک ہو سکے اس کو پورا کرتے تھے۔ خود یہ نا کارۂ علم وعمل حضرتؒ کے پاس اپنا ایک ذاتی کام لے کر گیا تو حضرت نے اپنی اہم مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر میرے کام کو پورا کیا۔ جب بھی میں حضرت کے کمرے میں کسی مہمان کو دیکھتا کہ وہ اپنی فریاد لے کر آیا ہے، حضرت حتی الامکان اس کے کام کو پورا کر دیتے تھے۔ جو بھی کام کرتے صرف اور صرف رضائے الٰہی کے لیے کرتے، کبھی حضرتؒ نے اپنے لیے کچھ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ صحت کا بھی خیال نہ رکھا۔

آپؒ حضرت امیر شریعت دامت برکاتہم کے دستِ راست تھے۔ حضرتِ مرحوم کے اندر اللہ تعالیٰ نے اتنی صلاحیت دی تھی کہ بڑے سے بڑے کام کو بھی آسانی سے نمٹا دیتے تھے، اور علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنا ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس کا بیان مشکل ہے۔ آپ کثیر اللسان تھے، بہت ساری زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ جب مدرسہ میں کوئی انگریزی داں آتا تو اس کے ساتھ ایسا گفتگو کرتے تھے کہ خود مخاطب پریشان رہ جاتا تھا۔ صرف انگریزی ہی نہیں جانتے تھے بلکہ بہت تامل، کنڑی وغیرہ سے بھی کامل واقفیت رکھتے تھے۔ حضرت امیر شریعت دامت برکاتہم کے پاس جب کبھی انگریزی خطوط آتے

تو آپ، حضرتؒ کو بلا کر پڑھواتے تھے اور اس کا جواب لکھنے کی ذمہ داری بھی مرحوم ہی کی ہوتی۔ حضرت کے اچانک وصال سے ہمیں ایسا محسوس ہو رہا ہے گویا حضرت حسبِ معمول اپنے وطن گئے ہوئے ہیں، ابھی واپس آجائیں گے۔

حضرتؒ میں اتنی عاجزی، انکساری، خاطر تواضع تھی کہ اس کو الفاظ کا جامہ پہنانا دشوار ہے۔ ایک مرتبہ حضرت مرحوم کے کمرے میں بیٹھا تھا، حضرت نے مجھ سے پوچھا کہ کیا بات ہے تو میں نے حضرت سے کہا کہ آپ میری اس ڈائری میں کچھ نصیحت کے جملے لکھ دیجئے۔ تو حضرت نے اس وقت فرمایا کہ ''رے، اس کی کیا ضرورت ہے، میں تو اس لائق نہیں ہوں، میں تو بس تم لوگوں کی دعاؤں کے طفیل جنت میں جاؤں گا'' حضرت کے وہ جملے رہ رہ کر آج بھی کانوں میں گونج رہے ہیں۔ خدا رب العزت ہم کو اس طرح کی عاجزی وانکساری اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرتِ والا جہاں طلبہ کے ساتھ شفقت ومہربانی سے پیش آتے تھے، اسی طرح باہر کے ہر خاص وعام سے پیش آتے تھے، حضرت اپنے آبائی وطن شہر میل وشارم کے قاضی بھی تھے۔ مدرسہ کی مصروفیات کے ساتھ اپنے گاؤں میں قضاوت بھی کرتے تھے۔ جب کبھی حضرت کے پاس کوئی جھگڑا کر کے مقدمہ لے کر آتا تو آپ بہت نرم لہجہ میں دونوں فریقین کو ملا کر بھیجتے تھے، دونوں فریقین کو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ دونوں حضرت کے فیصلے سے پہلے آپس میں دشمن تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کی زبان میں اتنی تاثیر دی تھی کہ سخت سے سخت دل انسان بھی حضرت کی بات کو آسانی سے مان جاتا تھا۔ مدرسہ کو ہی حضرت نے اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ دن ورات مدرسے ہی کی فکر رہتی تھی۔ ہمہ تن مصروف رہتے، کبھی کسی لائر کے پاس جانا ہوتا، کبھی کسی منسٹر کے پاس جانا ہوتا، مدرسہ

کے سلسلہ میں بات کرنے کے لیے اور شب وروز مدرسے کی ترقی کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ تدریس کے ساتھ ساتھ حضرت مرحومؒ مدرسہ کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔

حضرت والا کا معمول تھا کہ جب کبھی سفر میں ہوتے، منگل کی شام ضرور مدرسہ آجاتے اور چہارشنبہ کی صبح نماز فجر میں قرآن خوانی کراتے، پورے ہفتہ میں جتنے خطوط آئے ہوتے، جن میں قرآن خوانی کی درخواست ہوتی یا کوئی ایسے ہی زبانی حضرت کو کہا ہوتا تو اس کا نام نوٹ کرلیتے۔ اور طلبہ دورانِ قرآن خوانی حضرت سے اپنے رشتے داروں کے انتقال کی خبر دیتے تو حضرتؒ اس کو بھی نوٹ فرمالیتے، پھر ہر ایک کے لیے نام لے لے کر دعائے مغفرت فرماتے۔

حضرتؒ کی دعا بڑی رقت آمیز ہوتی، جس میں دینی ودنیوی تمام امور شامل ہوتے، وہیں اکابرین کی صحت کے لیے بھی دعا فرماتے۔ خصوصاً امیر شریعت دامت برکاتہم کی صحت اور مدرسہ کی ترقی کے لیے دعا فرماتے۔ حضرت کے انتقال کے بعد چہارشنبہ کو تمام طلبہ گویا منتظر تھے کہ حضرت نماز فجر کے بعد آئیں گے اور قرآن خوانی کرائیں گے، لیکن ہائے افسوس۔ اب حضرتؒ کبھی آنے والے نہیں۔ اب تو ہم خود حضرت کے لیے قرآن خوانی کررہے ہیں۔ سوچے تھے کہ حضرت والا دعا کے لیے تشریف لائیں گے، لیکن اب ہم خود دعا کررہے ہیں اس محسن کے لیے جو تمام کے درد بانٹ لیا کرتا تھا، آنکھیں اشکبار ہیں، دل غم میں ڈوبے ہوئے ہیں، بے چینی بے کیفی کا عالم ہے۔

زندگی انسان کی مانندِ مرغِ خوشنوا
شاخ پر بیٹھا تھا کوئی چہچہاتا اڑگیا

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ مرحوم کو غریقِ رحمت فرمائے۔ جملہ متعلقین کو، رشتہ داروں کو اور دارالعلوم کے اساتذہ وطلبہ کو بھی صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

حضرت مولانا ریاض الرحمٰن صاحب رشادیؒ،

یادوں کے جھروکے سے

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

اس میں شک نہیں کہ یہ دنیا باکمالوں سے بھری پڑی ہے۔ ایک سے ایک باکمال اور ایک سے ایک صلاحیت مند فرد یہاں موجود ہے۔ آنکھیں دیکھنے کے لیے تیار ہوں تو ایک سے ایک حسین پری رو چہرہ اپنے حسن کی رعنائیاں بکھیرنے کو تیار ہے، ناک سونگھنے کو تیار ہو تو ایک سے ایک عطر فروش اپنا سامانِ تجارت لیے کھڑا ہے۔ کان سننے کو تیار ہوں تو ایک سے ایک گویا، ایک سے ایک مترنم، اپنی آواز کا جادو جگانے کو تیار بیٹھا ہے۔ بس سامعین کی بھیڑ جمع ہونے کی دیر ہے، کوئی گا گا کر اپنا لوہا منوانا چاہتا ہے۔ کوئی چہک چہک کر اپنی بولی سنوانا چاہتا ہے، کوئی گھن گرج کر کے لوگوں پر اپنے زورِ خطابت کی دھاک بٹھانا چاہتا ہے۔

ایسے باکمالوں کی نہ دنیا میں پہلے کوئی کمی تھی نہ آج ہے۔ لیکن فلاح انسانی کے لیے، نجاتِ انسانی کے لیے، انسان کو مادی علائق سے دور کر کے بام عروج پر پہنچانے کے لیے ایسے کسی گویے، شاعر یا خطیبِ بے دھڑک کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ضرورت ہوتی ہے ایک دلِ درد مند رکھنے والے آدمی کی، ضرورت ہوتی ہے ایک سوز مند آواز کی، ضرورت

ہوتی ہے ایک باعمل عالم کی، ضرورت ہوتی ہے ایک داعیِ مخلص کی۔

اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے حضرت مولانا ریاض الرحمٰن صاحب رشادی علیہ الرحمہ کو کہ آپ کے اندر یہ ساری خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھی، آپ ایک بے مثال خطیب بھی تھے اور دلِ دردمند کے مالک بھی۔ آپ لسانی قوت سے بھی آراستہ تھے اور عملی طاقت سے بھی پیراستہ۔

بڑی مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستورِ میخانہ

بہر کیف جب سے بندہ کو شعور اور آگہی ہوئی اسکول پڑھنے کے زمانے سے جلسوں کے اشتہاروں اور اعلانات میں حضرت کا نام پڑھتا تھا دراں حالیکہ رشادی کیا ہے ؟ کس کو کہتے ہیں؟ سے واقف نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے مولانا کے بیانات سننے کے بعد سمجھ میں آگیا کہ رشادی رشد سے ماخوذ ہے یعنی ہدایت کی طرف رہنمائی کرنے والے، لوگوں کو صحیح راہ بتانے والے، بھلائی کی دعوت دینے والے۔ واقعی حضرتؒ اپنے مادر علمی اور بڑے حضرتؒ نیز ہمارے اساتذۂ کرام خصوصا حضرت حکیم الملت امیر شریعت کرناٹک دامت برکاتہم کی شاگردی کا حق ادا کیا۔ اور کتنے ہی گمراہ لوگوں کو راہ راست پر لے آئے۔

اسکول کے زمانے سے ہی حضرت مولانا کے بیانات سننے کا عادی تھا، میرے بڑے بھائی جناب لیس محمد یوسف صاحب آپ کے چاہنے والوں میں سے ہیں اکثر اپنے کمرے میں مولانا موصوف کے بیانات سنتے تھے میں بھی آپ کے بیانات کا عاشق ہوگیا ۔اُن کے بیان کی عجیب خصوصیت اور تاثیر اس لئے بھی ہے کہ آپؒ ہفتہ بھر جمعہ کے بعد

سے ہی آئندہ جمعہ کی تیاری اور مواد کی ترتیب و تنقیح میں مصروف رہتے تھے نیز آپ کی خطابت اور تقریر کی سب سے ممتاز اور انوکھی اور نرالی خصوصیت یہ تھی کہ شہر گلستان میں حالات کشیدہ ہوں یا حسب معمول حالات میں تناؤ ہو یا خوشگوار ہمیشہ مفصل و مدلل تقریر فرماتے۔ حدیث پیش کرتے تو اس کے پورے عربی الفاظ جوں کے توں نقل فرماتے۔ یہ نہ ہوتا کہ ''حدیث میں آتا ہے'' کہہ کر اردو میں حدیث کا خلاصہ پیش کر دیں۔ کہنے کو تو یہ چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن منبر و محراب سے وابستگی رکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ الفاظ حدیث کو جوں کا توں یاد کر کے پیش کرنا کس قوتِ حافظہ کا متقاضی ہے۔

شہر میں کبھی بریلوی حضرات کا کبھی غیر مقلدین کا کبھی کچھ کبھی کچھ اکثر مساجد میں خطیب۔ حضرات ایک دوسرے پر برس رہے ہوتے ہیں مگر حضرتؒ قرآن پاک کی ایک آیت کی تفسیر فرماتے حدیث پاک (مکمل باحوالہ عربی عبارت کے ساتھ تلاوت کرتے ہوئے) کی دلنشین تشریح فرماتے تھے۔ تقریر و خطابت ایسی ممتاز تھی کہ سامعین کے دلوں میں آپ کی بات اثر کر جاتی تھی اور حاضرین کے قلوب میں نقش چھوڑ جاتی تھی ''او راز دل خیز د بر دل ریزد'' کا مکمل مصداق تھی۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

حضرت کبھی مسجد میں چیخنا چلانا اور مسجد میں تقریر میں شور و شغب کرنے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ مکمل سکون اور طمانینت کے ساتھ تقریر رواں دواں رہتی تھی۔ اول تا آخر ہر لفظ کے تلفظ کا دل کش انداز ہوتا۔ آواز میں ایسا جذب کہ سامع کے دل میں گویا ہر حرف کا یکساں عمدہ اثر قلوب پر مرتسم ہوتا۔ کئی آفیسروں کو میں نے دیکھا کہ جب تک وہ جامع مسجد

سٹی مارکیٹ بنگلور میں نماز جمعہ ادانہیں کرتے اس وقت تک ان کوسکون نہیں ملتا۔آفیسر یہ کہتے تھے کہ گویاہماری جمعہ ہی نہیں ہوئی اس وقت جب ہم جامع مسجد میں جمعہ نہ پڑھیں۔

ہمارے ایک ساتھی نے کہا کہ اکثر قریوں اور دیہاتوں میں ہوٹلوں میں حضرت کے بیانات چلتے رہتے ہیں،حضرت کی تقریر کو سننے کے لئے ہم لوگ ہمارے خرچ کے لئے پیسے جمع کر کے چھٹی لے کر جمعہ کا بیان سننے کے لئے بنگلور آتے تھےاور آپ کی زبان میں اللہ تعالٰی نے عجیب حلاوت ومٹھاس اور تاثیر ودیعت فرمائی تھی۔اسی لئے لوگ جوق در جوق جامع مسجد کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔

آپؒ بڑے حضرت کے اصول وضوابط پر عمل کرتے تھے۔اور مادر علمی کے جلسوں میں بڑے حضرت کو یاد کیے بغیر تقریر نہیں کرتے تھے۔آپؒ حضرت حکیم الملت کے خصوصی شاگردوں میں سے تھے،اور حضرت کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں شروع کرتے تھے۔

آپؒ کبھی بھی دنیا کی طلب اور خواہشات نفس کی اتباع میں اور اس کی تکمیل میں مصروف نہیں تھے۔اسی وجہ سے ملت وامت اور مسلمانوں کی ملی رفاہی دینی اور علمی خدمات میں مشغول رہے جس کی زندہ جاوید جیتی جاگتی مثال جامع مسجد،جامع العلوم بنی کپہ اور دیگر ادارے ہمارے سامنے اس کے شاہد ہیں۔

آپؒ نے جامع مسجد میں مدرسہ اور اسکول شروع کر کے دیگر مساجد والوں کے لئے رہنمائی کے ساتھ ساتھ راہ ہموار کر دی اور لوگوں کو یہ بتادیا کہ مسجد صرف نماز کے لئے نہیں بلکہ ہم تمام مساجد کو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی مانند بنانا ہے کہ ہر وقت مساجد میں تعلیم وتعلم،سیکھنا اور سکھانا نیز مسجد کو مرکز بنا کر سارے ہی لوگ اسی کی طرف رجوع کریں

۔اور تمام مسائل مسجد کے امام وخطیب کی ہدایات کی روشنی میں اور ان کی رہبری میں حل کریں۔لڑکوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تعلیم کا منفرد نظام قائم فرمایا۔قوانین شرع اور حدود شریعت کی پابندی اور اس پر مکمل مضبوطی سے عمل پیرا ہوتے ہوئے لڑکیوں کو علوم دینیہ اور دنیویہ سے آراستہ اور پیراستہ کیا۔

میں کہاں رکتا ہوں عرش وفرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حدِ پرواز سے

آپ کے اندر غریبوں کا درد تھا اور ان کی فکر لگی رہتی تھی اسی فکر اور تڑپ کا نتیجہ ہے کہ جامع العلوم اسکول اور بنی کپہ میں حضرتؒ کی سفارش سے کتنے غریب بچے وہاں پڑھ رہے ہیں،اس کی تعداد کا کسی کو علم نہیں نیز اسی کڑھن اور تڑپ کا نتیجہ ہے کہ آپؒ نے شہر کے متمول حضرات کو اپنے ساتھ لیکر ان کا مال صحیح اور نیک مصرف میں خرچ ہونے کے ذرائع بتائے۔ان میں سے ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ہر ماہ غرباء کی اجتماعی شادیوں کا نظم اور اہتمام کیا جائے جس سے شہر اور ریاست کے دیگر مساجد کے ذمہ داران کو بھی ایک سبق اور درس حاصل ہوا کہ مسجد کے ذمہ داران اگر امام صاحب کی رہنمائی اور ان کی قیادت میں کام کا آغاز کریں اور ان کے مشوروں پر عمل پیرا ہوتے ہوئے مسجد کو محلے کا مرکز بنائیں تو بہت سے امور خیر کی انجام دہی بسہولت ہوتی رہے گی۔

مولائے محترم واقعتاً علامہ اقبال کے اس شعر کا مصداق تھے

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند وتیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

آپؒ مسجد کے اماموں کے لئے ایک نمونہ تھے۔عملی طور پر ترغیب کی صورت اختیار فرماتے تھے،بہت کم بولتے تھے،عمل سے ترغیب دیتے تھے جو کہ بہت زیادہ مؤثر

ہوتی ہے۔جیسا کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل خیر کی طرف رہنمائی کرنے والے کے مقام ومرتبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشادفرمایامَنْ دَلَّ عَلٰی خَیْرٍ فَلَه مِثْلُ اَجْرِ فَاعِلِه (رواہ مسلم رقم الحدیث ۳۵۰۹)۔خیر کی طرف رہنمائی کرنے والے کو بھی عمل کرنے والے کے برابر ثواب حاصل ہوتا ہے۔آپ نے بہت سے اماموں کو دیکھا ہوگا جو صرف منبر ومحراب کی زینت بڑھاتے ہیں۔صاف الفاظ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ منبر ومحراب کی ذمہ داری کو تو خوب نبھاتے ہیں مگر مصلے سے غافل رہتے ہیں۔ظہر کی نماز کا وقت ہوا۔گھڑی کا کانٹا وقتِ میعاد پر پہنچا،موذن صاحب حیران وپریشان ہیں کہ کیا کریں،کیونکہ ابھی تک امام صاحب نہیں آئے۔معلوم ہوا کہ موصوف نے ذریعہ معاش کے اتنے واسطے بڑھا لیے ہیں کہ نماز میں وقت پر پہنچنے کا وقت نہیں ملتا۔

حضرت مولانا ریاض الرحمٰن صاحب رشادی علیہ الرحمہ کی شانِ انفرادیت تھی کہ آپ منبر ومحراب کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ مصلے کی ذمہ داری سے غافل نہیں تھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ راتوں میں آپ کو دینی جلسوں میں دیر دیر تک شرکت کرنی ہوتی۔۔ لیکن مولانا ریاض الرحمٰن صاحبؒ حسب معمول فجر کی نماز کو وقت پر تشریف لاتے۔کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مولانا نے یہ ذمہ داری نائب امام پر ڈالی ہو۔پابندیٔ جماعت پر دھواں دھار تقریر کرنے والے تو اس زمانے میں بہت مل جائیں گے،مگر اپنے خاموش عمل سے اس کی دعوت دینے والا اب مشکل سے ملے گا۔

نرم دمِ گفتگو ، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو ، پاک دل وپاک باز

آپ قوم وملت کی اصلاح اور خیر خواہی میں ہمیشہ مشغول ومنہمک رہتے تھے

اس لئے کہ دین مکمل خیرخواہی کا نام ہے(اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ (رواہ مسلم رقم الحدیث ۱۸۴۹)رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مبارک ارشاد پر عمل پیرا ہوتے ہوئے دینی ملی رفاہی قومی کاموں میں بھی شریک ہوتے تھے اسی سلسلے میں جب القلم ایجوکیشنل اینڈ چاریٹیبل ٹرسٹ کے افتتاح کا موقع آیا تو آپ نے بلا چون و چرا ہماری دعوت کو قبول فرما کر تشریف ارزانی فرمائی اور اپنے قیمتی نصائح ومواعظ سے ہم سب کو نوازا اس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ دیگر امور میں کام کرنے کے لئے بہت سے ادارے ہیں لیکن تین چیزوں کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی اور اپنی فکریں اس طرف موڑنے کی ضروورت ہے ا۔تعلیم ۲۔معیشت ۳۔صحت ۔خصوصا گردوں کی بیماری میں مبتلا اشخاص کی طرف توجہ دیں کیونکہ میں اسی سے گذر رہاہوں۔

بقول عتیق الرحمٰن صاحب شاھد (ابن مولانا ریاض الرحمٰن صاحب) حضرت ماہانہ سولہ لوگوں کی امداد فرماتے تھے اپنے جیب سے سولہ لوگوں کی معاونت اور نصرت کرنا یہ اللہ والوں اور بزرگوں کا عمل ہے یعنی جن لوگوں کو اللہ توفیق دے وہی باہمت لوگ یہ کام کرتے ہیں۔

بحمد اللہ میرے بڑے بھائی سلیم احمد صاحب کی کوششوں سے بندہ مادر علمی میں سند عالمیت کے ساتھ ساتھ سند فضیلت سے بھی نوازا گیا مذکور بھائی حضرتؒ کے ہم سبق بھی تھے اور دونوں میں بڑی بے تکلفی بھی تھی۔ برادر نے کہا کہ وہ جب بھی آپؒ سے ملتے بڑی سادگی اور متانت کے ساتھ بے تکلفی سے بات کرتے ،وہی انداز گفتگو تھا جو دوران طالب علمی میں ہوا کرتا۔آپ اتنے بلند مقام پر فائز ہونے کے باوجود تکبر اور غرور کی بیماری کو اپنے اندر آنے نہیں دیا (اللہ تعالیٰ نے اس سے محفوظ رکھا) اور والد صاحب کی خیریت دریافت کیے بغیر ملاقات مکمل نہیں ہوتی تھی۔ ہمیشہ بڑوں اور بزرگوں سے محبت اور ان

کے ساتھ نرمی اور سادگی سے ملنا بات کرنا حسن سلوک کرنا آپ کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

نیز آپ کو قرآن سے بھی گہرا تعلق تھا۔ میں نے استاذ الاساتذہ حضرت مولانا صغیر احمد خاں صاحب عمت فیوضہم سے سنا کہ طالب علمی کے دور میں جب بھی مسابقۂ قرأت ہوتا اس میں حضرت دامت برکاتہم اول نمبر پر آتے اور ریاض الرحمٰن صاحبؒ دوم نمبر میں کامیاب ہوتے تھے۔

خود بہترین قاری قرآن ہونے کے باوجود جمعہ کی نماز کی امامت کے لئے حافظ عبدالغفور صاحب کو بلاتے تھے اور قاری صاحب اپنی مخصوص آواز میں امام حرم کے طرز پر جمعہ کی امامت کرتے تھے۔ مکہ کے اماموں سے والہانہ تعلق تھا اسی وجہ سے مذکورہ قاری صاحب کو جمعہ کی نماز کے لئے بلاتے۔ یہ عمل اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کو ابتداء ہی سے حرمین شریفین (زادہا اللہ شرفا) اور مدینہ منورہ زادہا اللہ کرامۃ سے سچی اور پکی محبت تھی جس کا نتیجہ تھا کہ اللہ نے آپؒ کا آخری مرقد اور مسکن مکہ مکرمہ کی ارض مبارکہ کو بنا دیا۔

کہتے ہیں ذوقؔ آج جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

۲۰ نومبر کی صبح مولوی مقصود عالم صاحب کا ایس ایم ایس آیا کہ مولانا ریاض الرحمٰن صاحب مکہ میں سخت علیل ہیں دعا کی درخواست ہے۔ میں نے یہ ایس ایم ایس میرے دوست واحباب کے حلقے میں عام کیا۔ اس میں مولانا شبیر احمد ندوی کے نام بھی وہ پیغام روانہ کیا تو اس کے جواب میں مولانا موصوف محترم کا فون آیا کہ ابھی میں مکہ مکرمہ کو فون کیا، شفیق الرحمٰن صاحب سے بات ہوئی تو پتہ چلا کہ ابھی ابھی مولانا ریاض الرحمٰن صاحب رشادی کا انتقال ہوگیا۔ جیسے ہی میں نے یہ خبر سنی میرے اوسان خطا کر گئے اور مجھے بالکل یقین نہیں آرہا تھا کہ میں کیا سن رہا ہوں؟...... گذشتہ ماہ شہر کے مشہور خطاط

میرے دوست کاتب فہیم کے وصال کے صدمہ سے باہر نہ ہوا کہ یہ خبر ملی......

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

بہر کیف مولاناؒ کی وفات کی خبر سارے شہر ہی میں نہیں بلکہ ساری ریاست اور پورے ملک اور اس سے بھی آگے بڑھکر پوری دنیا میں جنگل کے آگ کی طرح پھیل گئی اور مجھے ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی کہ میں یہ خبر دوسروں تک کیسے پہنچاؤں لیکن میری ذمہ داری بھی تھی کہ میں یہ خبر مدارس کے ذمہ داروں تک پہنچاؤں۔ لہذا میں نے یہ خبر سب کو پہنچائی اور مجھے بھی حضرت مولانا ریاض الرحمٰن صاحب رشادیؒ کے انتقال پر ملال کی اطلاع کے ایس ایم ایس آنے شروع ہو گئے ...اب مولانا دامت برکاتہم کے بجائے رحمۃ اللہ علیہ ہو گئے۔ مولوی محمد اشرف علی رشادی زادعلمہ نے کہا کہ حضرتؒ پر ایک روزہ سیمینار منعقد ہونے والا ہے اس پر آپ کا بھی ایک مقالہ ضرور ہونا چاہئے۔

حضرت والا کی ذاتِ ستودہ صفات کو بیان کرنا مجھ کم علم وکم فہم کی طاقت سے باہر ہے۔ دو چار باتیں جو ذہن میں فوری طور پر جمع ہوئیں اسے میں نے ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے، ورنہ حقیقت تو یہ کہ مولانا کی ذاتِ عالی اس لائق ہے کہ آپ کی زندگی کے مختلف گوشوں پر باقاعدہ کسی اسلامی یونیورسٹی سے ماہرین اسکالرس سے تحقیق کرائی جائے اور آپ کی حیاتِ مبارکہ کے مختلف گوشوں پر پی ایچ ڈی کرائی جائے۔

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

مدتوں رویا کریں گے اہلِ مے خانہ تجھے

حافظ و قاری حضرت نظام الدین خان صاحبؒ

اس میں شک نہیں کہ قرآن اللہ کا کلام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر تئیس سال کے عرصے میں نازل کیا، یہ قرآن مجید رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا معجزہ ہے جو رہتی دنیا تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی گواہی دیتا رہے گا۔ ساڑھے چودہ سو برس پہلے قرآن مجید نے جو چیلنج کیا تھا کہ ''اگر تم سچے ہو تو اس جیسا قرآن لا کر دکھا دو''۔ قرآن کا یہ چیلنج اس وقت کے لیے خاص نہیں تھا جب دنیا میں علم کی کمی تھی، جب انتقالِ علم کے ذرائع محدود تھے، جب پڑھنے پڑھانے کا رواج عام نہیں تھا، بلکہ یہ چیلنج رہتی دنیا تک کے لیے باقی ہے۔ آج کے اس دور میں جو آگاہی اور شعور کا دور کہلاتا ہے، جس میں تحقیق و تفتیش کے ذرائع بہت وسیع اور پھیلے ہوئے ہیں، انسان علم کی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ آج بھی قرآن کریم کا یہ چیلنج جوں کا توں موجود ہے۔ البتہ بات سمجھنے کی یہ ہے کہ ''اس جیسا قرآن'' سے مراد کیا ہے۔

علمائے کرام نے اس کی بیشمار تفسیریں کی ہیں۔ کسی نے فصاحت و بلاغت کو قرآن کا سب سے بڑا اعجاز بتایا ہے۔ کسی نے حسنِ نظم کو، کسی نے تاثیر بالفور کو، کسی نے اس کے یاد ہو جانے کو، کسی نے قرآن کی پیش گوئیوں کو۔ غرض ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ علماء کرام کے اس قول سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن کا اعجاز بھی ایک اعجاز

ہے کہ اس کلامِ الٰہی کے اتنے امتیازات وخصائص اور اتنے اعجازات ہیں کہ جن کا شمار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی ہم یہ بھی نہیں سمجھ سکتے کہ قرآن کن کن معنوں میں معجز ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد خاکسار یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ قرآن کریم کے دیگر معجزوں میں سے ایک بڑا عجیب معجزہ یہ بھی ہے کہ یہ کلام ''رجال ساز'' بھی ہے۔ جی ہاں، افراد سازی اور کردار سازی میں یہ کتابِ الٰہی اپنی نظیر آپ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے علماء سے جب ان کتابوں کا نام پوچھا گیا جنہوں نے ان کی کردار سازی کی، تو انہوں نے بے ساختہ جس کتاب کا نام لیا وہ کتابِ الٰہی تھی، یعنی قرآن مجید۔

اسی قرآن مجید کی رجال سازی کا ایک نمونہ تھے میرے دیرینہ رفیق، ہمدم وغمگسار، مشفق ومربی، خادمِ قرآن، میدانی حافظ، قاریِ خوش الحان، واعظِ باعمل، مدرسِ بے مثال، خوش خیال وخوش مزاج، بذلہ سنج ودقیقہ رس، معاملہ فہم وسنجیدہ گو، قناعت پسند وشکر گزار، زہد صفت وصدق مقال، الحاج نظام الدین خان صاحب۔ نور اللہ مرقدہ وبرد مضجعہ

قرآن کریم سے حافظ صاحب کو ایسا لگاؤ تھا کہ ساری زندگی اس کی خدمت میں گزاردی۔ آپ کی شناخت ہی ہوگئی تھی حافظ صاحب کے لفظ سے۔ اور سچ بھی یہی ہے کہ ''حافظ'' تو ہر سال سینکڑوں بچے ہوتے ہیں، برِصغیر میں جتنے علماء کرام ہیں تقریباً سبھی حافظ بھی ہیں، اور بہت سے ہیں جو صرف رمضانی حافظ نہیں بلکہ میدانی حافظ ہیں۔ لیکن ''حافظ صاحب'' کے نام سے مشہور نہیں ہوتے۔ حافظ نظام الدین خان صاحب کا یہ خصوصی امتیاز ہے کہ عوام وخواص میں جتنا وہ اپنے نام سے نہیں جانے جاتے تھے اتنا'' حافظ صاحب'' کے نام سے جانے جاتے تھے۔ یشونت پور کے مدرسے میں آپ نے جب قرآن مجید کی تعلیم دینی شروع کی تو ایسا بیٹھے کہ حوادثِ زمانہ، گرانیِ وقت، برق رفتاریٔ

دوراں، معاشی مشکلات، غرض کوئی چیز انہیں اس مسند سے اٹھا نہ سکی، یہاں تک کہ وہ اپنے خالق کی جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔

حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے

آپ کی زندگی کا صرف یہی ایک امتیاز کیا کچھ کم ہے کہ آپ نے ایک طویل عرصہ ایک ہی مسجد اور ایک ہی مدرسے میں خدمت کرتے گزارا ہے، اس پر مستزاد یہ کہ آپ کی تربیت سے سینکڑوں لوگوں نے اپنے احوال کی اصلاح کی، آپ کے مواعظ اور اس پر آپ کو پہلے خود کاربند ہونا، ہزاروں ہزار بندگانِ خدا کے لیے اصلاحِ حال کا موجب بنا۔ اسی طرح سینکڑوں طلبہ نے جن میں اس ناچیز کے بھائی جناب محمد اسماعیل صاحب بھی شامل ہیں، آپ سے قرآن مجید پڑھنا سیکھا، اور بالکل درست پڑھنا سیکھا۔ قواعد وضوابط کے ساتھ، تجوید وترتیل کے ساتھ، قرآنی آہنگ ولہجہ کے ساتھ۔ آپ کی آمد سے جامع مسجد پشونت پور درحقیقت ''جامع'' مسجد بنی، اور آپ کی مخلصانہ کوششوں سے مدرسہ زینبیہ قادریہ، مایہ ناز دینی مدرسہ بنا۔ بلاشبہ آپ کی ذات مسجد کے لیے رونق تھی اور مدرسے کے لیے منبعِ انوار۔

رند جو ظرف اٹھا لے وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لے وہی میخانہ بنے

قناعت پسندی کو مومن کی ڈھال کہا گیا ہے۔ دنیائے رنگ وبو کی رنگا رنگ تمنائیں، قسمہا قسم کی آرزوئیں مختلف پیرایوں میں جب مردِ مومن پر حملہ آور ہوتی ہیں اور اس کی تیاریٔ آخرت میں رکاوٹ ڈالنا چاہتی ہیں تو مومن اسی ''قناعت'' کی ڈھال سے ان تمام مہلک آرزؤں اور جاں گسل تمناؤں کے ہتھیاروں کا وار روکتا ہے۔ حافظ صاحب کے

پاس یہ ڈھال تھی، اور بہت مضبوط تھی، اتنی مضبوط کہ میٹروسٹی بنگلور کے زرخیز علاقے یشونت پور میں آپ نے تقریباً چوتھائی صدی گزاردی، مگر اپنے لیے ایک ذاتی مکان نہیں بننے دیا۔

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو بزم ہو پاک دل و پاکباز

قناعت پسندی کے ساتھ ساتھ شکر کا جذبہ ہو تو سونے پر سہاگہ کا کام دیتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حافظ صاحب کو اس وصفِ خاص سے بھی بہت نوازا تھا۔ ایک چھوٹے سے واقعہ سے اس پر روشنی ڈالنا چاہوں گا، کہنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے مگر اپنے اندر شکر گزاری کی ایک پوری دنیا رکھتا ہے۔

حافظ صاحب ایک مرتبہ میرے پاس آئے، اور بہت خوشی سے اس بات کی خبر دی کہ قاضی صاحب، میں نے ایک اچھی ٹی وی ایس موٹر سائیکل خریدی ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے مجھے اپنی خوبصورت سی ٹی وی ایس دکھائی۔ میں حد درجہ متاثر ہوا کہ اللہ کا یہ بندہ اس چھوٹی سی نعمت پر کس قدر خوش اور شکر گزار ہے، اور کتنے ''حافظ صاحبان''، ''مولوی صاحبان''، ''خطیب صاحبان'' وغیرہ وغیرہ ہیں اس جہاں میں کہ خدا کی ہر نعمت کو شیرِ مادر کی طرح نوش کیے جارہے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ ھل من مزید کا نعرہ بلند کیے رہتے ہیں۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فلک میں
شاہیں کا جہاں اور ہے کرگس کا جہاں اور

حافظ صاحب یشونت پور جامع مسجد کے امام تھے، اور عام اماموں کی طرح ایسے امام نہ تھے کہ نماز کی تکبیر تحریمہ سے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنے تک مقتدیوں کے امام رہتے

ہوں اور سلام پھیرنے کے بعد مقتدی حضرات امام بن جاتے ہوں اور امام صاحب مقتدی ۔افسوس کہ آج کل اکثر مسجدوں کا یہی حال ہے مگر آپؒ کی امامت صحیح معنوں میں ''امامت'' تھی، آپ نماز میں بھی لوگوں کی امامت فرماتے اور نماز سے باہر بھی لوگوں کو دینی رہنمائی دیتے۔نہایت معاملہ فہم تھے،خود اس ناچیز کو بہت بار تجربہ ہوا، دارالقضاء کے متعلق کوئی مقدمہ ہوتا تو اپنے علاقے کے فریقین (مدعی، یا مدعا علیہ) کے ساتھ بذاتِ خود دارالقضاء تشریف لاتے۔ دارالقضاء سے متعلق دستاویزات تیار کرنے میں فریقین کی مدد کرتے ۔دارالقضاء کے آداب سے لوگوں کو واقف کراتے،شرعی قوانین کی باریکیاں فریقین کو سمجھاتے ۔غرض ہر طرح سے دارالقضاء کا شرعی تعاون فرماتے ۔اگر ہر مسجد کا امام ایسا احساس رکھنے والا ہوتو مسلمانوں کے آدھے سے زیادہ مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

سبق پڑھ پھر صداقت کا، امانت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی 'امامت' کا

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہوگئی انجمن سونی، فضا ہے سوگوار

مقصود علی خانؒ ایڈیٹر روزنامہ سالار کی
پہلی برسی کے موقع پر لکھا گیا مضمون

یہ دنیا ایک گذرگاہ ہے، یہاں روزانہ پتا نہیں کتنے لوگ پیدا ہوتے ہیں اور کتنے اس عالم رنگ وبو کو خیر آباد کہہ کر عالم جاودانی کی طرف کوچ کر جاتے ہیں، مگر کسی کے جانے کا غم صرف اس کے گھر والوں کو ہوتا ہے تو کسی کا غم پورے خاندان کو۔ مگر ایسی ہستیاں بہت کم ہوتی ہیں جن کے جانے کا غم ایک عالم کو ہوتا ہے اور زمانہ دراز تک دلوں کو تڑپاتا رہتا ہے۔ ایسی ہی آفاق اور عالم گیر ہستی ہے الحاج جناب میر مقصود علی خان صاحب علیہ الرحمہ کی۔ یہ دل گذار خبراب تو پرانی بھی ہوچکی کہ جناب میر مقصود علی خان صاحب ہمیں داغ مفارقت دے کر اپنے مالک حقیقی سے جاملے، لیکن اس سانحہ کی ٹھیس نہ جانے کب تک دلوں میں تازہ رہے گی، اس لیے کہ یہ صرف ایک شخص کی وفات نہیں، یہ ایک پورے عہد کا اس کے مزاج ومذاق کا اور اس کے دل آویز خصوصیات کا خاتمہ ہے۔

وَمَا كَانَ قَيْسٌ هَلْكُهُ هَلْكٌ وَاحِدٌ
وَلٰكِنَّهُ بُنْيَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

بندہ اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک میرے ایک عزیز دوست (مولانا احمد معاذ صاحب رشادی) نے فون پر اطلاع دی کہ حضرت مقصود علی خان صاحب، رحمۃ اللہ علیہ ہوگئے۔ یہ خبر سننا ہی تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے اپنا قائد اور بزرگ مربی اور

محسن کھودیا ہے۔ حضرت خانؒ کے اگر اوصاف کو شمار کیا جائے تو سینکڑوں صفحات سیاہ ہو جائیں گے۔ انہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں مثال قائم کی۔ سماجی، صحافتی، سیاسی خدمات میں، ان کا کوئی ثانی نہیں ملے گا۔ آپ جب رکن راجیہ سبھا تھے جو اپنی ریاست سے جب کوئی دلی جاتا تو خان صاحبؒ بنگلور سے فون کر کے وہاں کہہ دیتے کہ اپنی ریاست کا آدمی آرہا ہے، اس کی ہر طرح سے مہمان نوازی کرنا۔ اس کی بہت ساری مثالیں موجود ہیں۔

راقم الحروف اپنے عزیز کے ہمراہ ایک مرتبہ خان صاحبؒ کی خدمت میں روزنامہ سالار کے دفتر حاضر ہوا، ہم دونوں کے پاس اپنے اپنے مضامین تھے، الیکشن کا زمانہ تھا، اخبار میں جگہ کی قلت تھی، مگر آپ نے بڑی ہی حکمت سے کام لیا، ہم دونوں کا دل رکھتے ہوئے فرمایا، دونوں مضامین کی تو گنجائش نہیں، دونوں میں سے ایک آپ دونوں ہی طے کرلیں، انشاءاللہ میں شائع کرادوں گا، پھر آپ نے ایک مضمون شائع فرمادیا۔

قحط الرجال کے اس دور میں جب کہ رسوخ فی العلم کے ساتھ حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر رکھنے والے حضرات ناپید ہو رہے ہیں، جناب مقصود علی خان صاحب کی حیثیت یقیناً ایک چراغ کی سی تھی۔ جس کے تصور سے بھی دل کو اطمینان اور تسلی کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ افسوس کہ یہ چراغ گل ہو گیا اور ملتِ اسلامیہ اپنے ایک عظیم علمی و معلوماتی سہارے سے محروم ہوگئی۔ یہ حقیقت ہے کہ خان صاحبؒ کی شخصیت میں علم و معلومات کا ایک خزانہ اور آگہی کا ایک بحرِ بیکراں موجزن تھا۔ آپ کے وسعتِ مطالعہ اور تاریخ پر گہری نظر اور واقفیت اور حالاتِ حاضرہ پر عمیق نظر اور آپ کے اوصاف و کمالات کا ٹھیک ٹھیک ادراک بھی ہم جیسوں کے لیے مشکل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جناب خان صاحبؒ کے پیکر

میں معصومیت، حسن اخلاق، اور علم وعمل کے جونمونے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں، ان کے نقوش دل ودماغ سے محو نہیں ہو سکتے۔ خان صاحبؒ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی مختصر ملاقات میں بھی ذہن ودل پر دیرپا نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔

صحافت کی دنیا سے وابسطہ ہونے کے ناطے آپ کی تحریروں میں عجیب سحر انگیزی تو تھی ہی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خطابت کا بھی دل کش اسلوب بخشا تھا۔ آپ کی تقریریں بڑی مقبول ہوتی تھیں، گویا آپ کے الفاظ علم کے سمندر کے موتی ہیں جو ڈھل ڈھل کر آپ کے سینے سے نکل رہے ہیں، یا ایک ابرِ کرم ہے جو برس کر سامعین کو سیراب کر رہا ہے۔

آپ جس مجلس میں بیٹھتے اسے باغ وبہار بنا دیتے۔ خان صاحبؒ کے تبحر علمی پر غور کریں تو ذہن مسحور ہو جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سارا علم وفضل اور ساری ذہانت وذکاوت اسی ایک شخص کے حصے میں آ گئی ہے۔ علوِ استعداد اور علوِ ہمت جناب خان صاحب کی شخصیت کی خصوصیت تھی۔ اور انہی دو چیزوں نے آپ کو ایسا شرف وامتیاز عطا کیا تھا اور علمی جامعیت کی وہ شان عطا کی جس کی نظیر نہیں ملتی۔

ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جنہیں فنا فی العلم کہا جا سکے۔ اور جن کی نشست وبرخاست سے لے کر سوچ بچار تک کا محور علم ہی علم ہو۔ جناب خان صاحبؒ کا شمار ایسے ہی افراد میں ہوتا تھا۔ برصغیر کی علمی ادبی اور سیاسی تاریخ آپ کے مطالعہ اور تحقیق کا خاص موضوع تھا، اور اللہ تعالیٰ نے اس موضوع پر آپ کو بے مثال عبور عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ آپ کے سامنے علم وادب سے تعلق رکھنے والی برصغیر کی کسی بھی ایسی شخصیت کا نام لیجئے، جس نے کوئی معمولی سا بھی کام کیا ہو، وہ شخصیت چاہے کتنی ہی غیر

معروف کیوں نہ ہو، آپ ان کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچا دیتے۔

ادارے کا ایک فرد یوم آزادی کے موقع پر آزادی کے تعلق سے ایک 'نظم' لے کر حاضر ہوا تو خان صاحبؒ نے فرمایا ''یہ نظم پڑوسی ملک کے شاعر نے لکھا ہے، پھر آپ نے شاعر کا نام اور اس کی کتاب کا حوالہ بھی دیا، اور فرمایا کہ یہ نظم ہندوستان کی آزادی پر نہیں بلکہ پاکستان کی آزادی پر لکھی گئی ہے۔ یہ سنتے ہی ہم لوگوں کے اوسان خطا ہو گئے۔

حضرت خان صاحب کو علماء سے بڑا گہرا تعلق تھا، ان بزرگوں کی صحبت کا نتیجہ ہی کہئے کہ آپ جب بولتے تو قرآن کی آیتوں اور احادیث کا حوالہ بھی دیتے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ ایک صحافی اور ادیب نہیں بول رہا ہے، بلکہ ایک مفسر اور ایک محدث بول رہا ہے۔ افسوس کہ ایسی عظیم علمی ہستی آج ہمارے درمیان نہیں۔ علمی ایوانوں میں اب چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا ہے۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

علم کی فضیلت

اللہ نے ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے جو دین عطا فرمایا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک اللہ کا جو پیغام سینکڑوں سال کے بعد سب سے پہلے پہنچا اور جس سے اس دین کی بنیاد پڑی، اساس قائم ہوئی، قصر اسلامی کی تعمیر کی بنیاد رکھی گئی کیا آپ جانتے ہیں وہ پیغام کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلی وحی کیا نازل فرمائی؟

اللہ کا جو پیغام اولین جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہے وہ اقراء کا پیغام تھا، پڑھنے پڑھانے کا، تعلیم وتعلم کا، سیکھنے سکھانے کا پیغام تھا، یہی وہ پہلی وحی تھی جو جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں لےکر آئے تھے۔

رسول اللہ ﷺ سے جبرئیل علیہ السلام نے آکر کیا عرض کیا، اقــرا رسول اللہ ﷺ پڑھنے میں تامل کا اظہار فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ مَـا اَنَـا بِـقَارِیٍ میں پڑھ نہیں سکتا یہاں غور کیا جانا چاہیے کہ جبرئیل علیہ السلام تو یہ عرض کر رہے تھے کہ جو آیتیں میں آپ کو سنانے والا ہوں، جن کا پہلا جملہ اقراء ہے، ان آیتوں کو آپ دہرایے، اپنی زبان مبارک سے یہ آیتیں پڑھئے، ان آیتوں کی تلاوت کیجئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں (مـا انـا بقـاریٔ) میں پڑھ نہیں سکتا ان آیتوں کو، ! کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربی زبان کے بولنے پر عربی کلمات کے ادا کرنے پر قدرت نہیں رکھتے تھے؟

شارحین حدیث فرماتے ہیں اور ہم نے اپنے استاذ حکیم الملت امیر شریعت قبلہ کی زبانی بار ہا سنا ہے کہ یہ اقراء کا لفظ بھی اللہ کے کلام کا حصہ تھا، اور جتنی آیتیں لے کر آئے تھے جبرئیل، وہ سب اللہ کا کلام ہے اور اللہ کے کلام میں جو عظمت تھی، جو وزن تھا، جو وقار تھا، جو ثقل تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ احساس فرمایا کہ میں اپنی زبان سے ان کلمات کو ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، اسی لیے جبرئیل سے فرمایا کہ میں پڑھ نہیں سکتا۔ جبرئیل علیہ السلام نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عبدیت کا غلبہ ہے، اور اپنے کمالات کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ نہیں ہے اور حضور یہ سمجھ رہے ہیں کہ آپ اسے پڑھ نہیں سکتے سینے سے لگا کر دبایا، ایک بار، دو بار، تین بار، اور رسول اللہ کے کمالات کی طرف متوجہ کرانے کی جبرئیل نے کوشش کی کہ پیغمبر یہ کلام آپ ہی پڑھ سکتے ہیں، آپ کے سواء کوئی اسے نہیں لے سکتا، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ آیات تلاوت کیں۔

بہر حال خلاصۂ کلام یہ کہ سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جو وحی پہنچی، اس میں پڑھنے کا حکم ہے، کتاب اور قلم کا تذکرہ ہے، تو یہ اسلام کی سب سے پہلی بنیاد ہے۔ اس میں پڑھنے پڑھانے، سیکھنے سکھانے، قرطاس وقلم، لکھنے لکھانے کی تعلیم دی گئی اور پیغام سنایا گیا، تو ہمارا اور آپ کا دین اسلام، پڑھنے پڑھانے کا دین ہے، قرأت کا دین ہے، تلاوت کا دین ہے، لکھنے لکھانے کا دین ہے، تصنیف وتالیف کا دین ہے، کتابوں کا دین ہے، مدرسوں کا دین ہے، جامعات کا دین ہے، دار العلوموں کا دین ہے، مکاتب کا دین ہے اور اسلام یہ چاہتا ہے کہ اس مذہب کے ماننے والے اپنی بنیاد پڑھنے پڑھانے پر، لکھنے لکھانے پر رکھیں، پڑھیں، پڑھائیں، سیکھیں، سکھائیں، درس وتدریس، تعلیم وتعلم کا یہ دین ہے، اس لیے اسلامی معاشرہ میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جگہ جگہ مدارس قائم

ہیں، مکاتب قائم ہیں، اسکول چلائے جارہے ہیں، بڑے بڑے کالج اور بلکہ یونیورسٹیاں قائم ہورہی ہیں۔ لوگ پڑھ رہے ہیں، پڑھا رہے ہیں، سیکھ رہے ہیں، سکھارہے ہیں، تعلیم دے رہے ہیں، تعلیم حاصل کر رہے ہیں، مدارس کھولے جارہے ہیں، مجلس منتظمہ قائم ہوتی ہے، اوران پڑھنے پڑھانے والوں کے لیے جتنی ضرورتیں ہیں ان ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اورایک طرف دین کی حفاظت کے لیے علماء، حفاظ، قراء کودین کا علم رکھنے والے، دین کی سمجھ رکھنے والے، دین کا تفقہ رکھنے والے پیدا کیے جارہے ہیں۔ تو دوسری طرف عصری علوم کے ماہرین، بہترین ڈاکٹرس، انجیئرس اور مختلف عصری شعبوں کے لیے درکار افراد کی کھیپ کی کھیپ تیار کی جارہی ہے۔

علم کی فضلیت اس واقعہ سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے مسجد نبوی میں، دیکھا کہ صحابہ کا ایک حلقہ بیٹھا ہوا ہے اور اللہ کا نام لے رہا ہے، اللہ کا ذکر کر رہا ہے، خدا کی یاد میں منہمک ہے، اوراس کے تذکرے میں مشغول ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت کی نگاہ ڈالی، شفقت کی نظر سے دیکھا انہیں، اور پھر ایک دوسرے حلقے پر نظر پڑی آپ کی، دیکھا کہ اس میں کچھ صحابہ بیٹھے ہیں، اور سیکھ رہے ہیں، سکھارہے ہیں، کچھ مسائل بتائے جارہے ہیں، لوگ سمجھ رہے ہیں، اوراس طرح تعلیم وتعلم کا سلسلہ جاری ہے۔ فرمایا: یہ دونوں بھلائی پر ہیں، دونوں حلقے خیر پر ہیں، لیکن مجھے اس حلقے میں بیٹھنا ہے جو تعلیم وتعلم میں لگا ہے، اس لیے کہ مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے **اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّماً**۔

آج کا دور تعلیمی بیداری کا دور ہے۔ ایک زمانے میں شاعر نے جو سادہ سا شعر کہا تھا

پڑھو گے لکھو گے تو ہوگے نواب
صرف کھیلو کودو گے، ہوگے خراب

آج ہمارے اس دور میں اپنے تمام مفاہیم کے ساتھ جلوہ گر ہے۔گرچہ ہمارے اس دور میں کھیل کود نے بھی پروفیشن کی راہ اختیار کرلی ہے اوراس زہریلے سچ سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک پروفیشنل کھلاڑی ایک کھیل میں جتنا کمالیتا ہے، ایک اچھا پڑھا لکھا آدمی پورا مہینہ محنت کر کے بھی اتنا مشاہرہ نہیں پاتا۔لیکن درست بات یہی ہے کہ اس دنیا کو اپنی بقا کے لیے بھی اور اپنی ترقی کے لیے بھی پڑھے لکھے لوگوں کی ضرورت ہے۔کھلاڑیوں کی ضرورت نہیں۔اور یہ بھی عام مشاہدہ ہے کہ ہزاروں لڑکے کھیل میں اپنی قسمت آزمائی کرتے ہیں،موقع کسی ایک یا دو کو ہی ملتا ہے باقی سب اپنی بہترین عمر ضائع کرنے کے بعد کفِ افسوس ملتے رہ جاتے ہیں۔جب کہ تعلیم کے شعبوں سے وابستہ افراد ایک منظم زندگی گزارتے ہیں۔امتحان میں اچھے نتائج پا کر بہترین ملازمتوں کے لیے اپلائی کرتے ہیں، یہاں بھی یہ ہوتا ہے کہ اکا دکا کوئی گر جاتا ہے، لیکن اکثر ایجوکیٹیڈ افراد کو بہترین ملازمتیں مل ہی جاتی ہیں، اور جو خود اپنا بزنس کرتے ہیں وہ بھی کامیاب زندگی گزارتے ہیں۔گویا کھیل کود میں کامیاب زندگی کی شرح ہزار میں ایک ہے تو پڑھنے پڑھانے میں کامیاب زندگی کی شرح ہزار میں نوسو ننانوے۔اب یہ ہمارے اختیار کی بات ہے کہ ہم کس ڈگر پر چلتے ہیں۔

ایک عالم دین کا طلبہ کو ڈاپٹ کرنا

شاہراہ عمل......

گزشتہ ہفتہ الامین کمبل پوش میں ایک جلسہ ہوا جس میں مسلم اور غیر مسلم بچوں نے کچھ علمی پروگرام پیش کیے اور معصوم بچے جو کہ قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں ان کے دلوں میں بچپن ہی سے اللہ اور اس کے رسول کی عظمت کو بٹھائیں گے تو بڑے ہو کر بھی ان کی زندگیوں میں اللہ اور اس کے رسول کے احکامات آئیں گے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اسکول کے سارے ذمہ داروں کو صوبے کے دوسرے مدارس کے ذمہ داروں سے گزارش ہے کہ وہ بھی اپنے اسکولوں میں اس طرح کا تعلیمی نصاب متعین کریں، دینی اور اخلاقی تعلیمات سے بھی بچوں کو آراستہ کریں۔ اس سے انشاء اللہ قوم کا مستقبل روشن ہوگا۔

الامین کمبل پوش کے جلسے میں حضرت مولانا قاری محمد حنیف افسر عزیزی صاحب، امام وخطیب مسجد بیوپاریاں شیواجی نگر بنگلور، جو نہ کہ صرف ایک نوجوان عالم دین ہیں بلکہ قوم کا درد رکھنے والے سماجی کارکن بھی ہیں، سیاسی، سماجی، معاشرتی کسی بھی قسم کا مسئلہ کیوں نہ ہو، پوری دلسوزی کے ساتھ آپ اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور امت کے پریشان حال لوگوں کے مسائل حل کرنے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت ساری خوبیوں سے نوازا ہے۔ آپ نے بڑا ذمہ اپنے سر لیا اور بچوں کی تعلیمی سرگرمیوں کو

بڑھانے کے لیے انہیں اڈاپٹ کیا۔

یہ اقدام مولانا کی علم دوستی کے علاوہ دینی حمیت کا بھی غماز ہے۔ آج الحمدللہ شہر میں اکثر اسکولوں اور کالجوں میں جلسے ہوتے رہتے ہیں، بڑے لوگ آتے ہیں اور تقریر کر کے چلے جاتے ہیں۔ اگر اسکولوں کے ہر جلسے میں آنے والے بڑے بڑے سیاسی حضرات، تاجر حضرات اپنی طرف سے ایک بچے کو بھی اڈاپٹ کرائیں اور اس کے تعلیمی اخراجات برداشت کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ قوم کا یہ سرمایہ، یہ طلبہ ضائع نہیں ہوں گے، اور یہی بچے آگے چل کر قوم کے لیے بہت کچھ کر کے بتائیں گے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے ذہین بچے (طلبہ) معاشی حالات کی مجبوری میں پریشان ہو کر تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر کسبِ معاش میں لگ جاتے ہیں اور ان معصوم بچوں کے والدین کے پاس پڑھانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے میری شہر کے ہر صاحب استطاعت سے ادباً گزارش ہے کہ وہ اسکولوں اور مدارس میں جا کر استاذ یا اسکول کے ذمہ داروں سے مل کر حالات کا جائزہ لیں اور کسی ایک طالب علم کی تعلیم کا ذمہ اپنے سر لیں۔ جب ایک عالم یہ کام کر سکتا ہے تو شہر کے بڑے بڑے تاجر حضرات اور صاحب استطاعت حضرات کیا یہ کام نہیں کر سکتے؟؟

(مطبوعہ)

روزنامہ سالار بنگلور31/07/2001

روزنامہ سیاست31/07/2001

روزنامہ سلطان01/08/2001

بچوں کی تعلیم میں ماں باپ کا کردار

الامین تعلیمی ہفتہ ۲۸ مئی تا ۳ جون ۲۰۰۳ء

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اپنی فطرت اور جبلت کے اعتبار سے مسلمان پیدا کیا ہے اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ ہر بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا تو نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر بچہ پیدائش کے وقت فطری اعتبار سے مسلمان ہی رہتا ہے۔ اس کے بعد گھریلو ماحول اور گرد و پیش کے احوال میں جب وہ گھل مل جاتا ہے اور کوئی اسے خراب کرنے والی چیز مل جاتی ہے تو وہ خراب ہو جاتا ہے اور بچے کو اس کے فطری مذہب سے ہٹانے میں سب سے بڑا ہاتھ چونکہ ماں باپ کا ہوتا ہے کہ بعض اوقات چونکہ اسلام کے خلاف چیزیں اسے سکھا دیتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ اسلامی تہذیب سے دور بلکہ متنفر ہو جاتا ہے اور کسی دوسرے مذہب کی چھاپ اس پر پڑ جاتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلامی گھرانے میں پیدا ہونے اور پرورش پانے کے باوجود مسلمان باقی نہیں رہتا۔

ماں باپ ذمہ دار ہیں

ماں باپ کی ذمہ داری صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ بچے کی پیدائش کے بعد وہ ان کی روٹی بوٹی کا انتظام کر دیں اور ان کے لیے چند کپڑے مہیا کر دیں یا ان کی تعلیم کا بندوبست کر دیں بلکہ والدین کی ذمہ داری اس سے وسیع تر ہے کہ وہ اس بات کے بھی

جوابدہ اور ذمہ دار ہیں کہ انہوں نے اپنے ان بچوں کو اپنے مذہب سے واقف کروایا ہے یا نہیں؟ جہاں ان کی جسمانی نگہداشت کی ذمہ داری ان پر واجب ہے وہیں ان کی ایمانی نگہداشت کی ذمہ داری بھی ان پر واجب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ** تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اپنے ماتحتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ گھر کے ذمہ دار شخص کو اس کی بیوی بچوں کے بارے میں یقیناً کل قیامت کے دن پوچھا جائے گا کہ اس نے اپنی بیوی اور بچوں کو اپنے مذہب کے احکامات کے دائرے میں رکھا تھا یا انہیں ایسے راستے پر ڈال دیا جس راستے میں اسلام سے نفرت سکھائی جاتی ہے۔

دو دشمن

یوں تو اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے مختلف باطل تحریکیں کام کر رہی ہیں، مگر آج کے دور میں مسلمان بچوں کو گمراہ کرنے اور انہیں اپنے مذہب سے بیزار کرنے کی خاطر ملکی اور قومی سطح پر وہ تحریک و تنظیم کام کر رہی ہے جس کی اس سرگرمی کا آغاز مسجد کے انہدام سے ہوا اور جس نے مسلمان بچوں کو اسکولوں میں اپنے مذہب کا مرثیہ پڑھنے کو لازم قرار دیا۔ یہ ملکی اور قومی سطح پر اپنا کام کر رہی ہے اور اللہ ہزاروں رحمتیں بھیجے اس عظیم بین الاقوامی شخصیت پر جس نے اپنی ریاست کے سارے ہی مسلمان ضمیروں کو جگایا اور انہیں للکارا کہ وہ اپنے بچوں کو ایسے اسکولوں سے نکال لیں جن اسکولوں میں کفر و شرک کا حلف لیا جا رہا ہے۔ یہ اسلام کی پہلی ایسی دشمن ہے، جس نے اپنی اسلام دشمنی کے لیے اسکولوں اور مدارس کو بھی نشانہ بنایا ہے اور خصوصاً دینی مدارس کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے

کا اہل وطن کو عادی بنایا ہے اور اسلام کی دوسری دشمن تنظیم عیسائی مشنری ہے جو دو چور دروازوں سے مسلمانوں کو اپنا شکار بنالیتی ہے۔

ایک باغیرت مسلمان

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر حال میں مسلمان کی نگاہ میں سب سے اعلیٰ تہذیب وہی تہذیب ہے جس کو نبی آخرالزماں تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری دنیا کے سامنے پیش فرمایا اور آفاقی پیغام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اسوۂ حسنہ قرار دیا۔ صدیاں گزر جائیں گی، اقوام بدل جائیں گے، حالات کا رخ پلٹ جائے گا، حکومتوں کی کایا پلٹ جائے گی، احوال متغیر ہو جائیں گے، مگر اس احساس اور غیرت مند مسلمان کا دل اس یقین سے سرشار ہوگا کہ اس کا اپنا مذہب اور اس کے رسول کی لائی ہوئی شریعت اور آفاقی پیغام نہیں بدل سکتی۔ ایک مسلمان اپنی زندگی کو زمانے کے حالات کے حوالے ہرگز نہیں کرسکتا۔ اور نہ ہی وہ کسی فانی اور باطل مذہب کی پیروی کرسکتا ہے اور نہ ہی اپنی اولاد کو اس آگ میں جھونک سکتا ہے، بلکہ وہ اپنی اسلامی تہذیب پر عمل کرنے کا بہر حال پابند ہوتا ہے۔

انگریزی سیکھیں مگر......

جس طرح کسی زبان کو کسی مقام یا علاقے کے ساتھ مخصوص کر دینا نامناسب ہوگا بالکل اسی طرح کسی زبان کو بظاہر اس زبان سے متعلق تہذیب سے جوڑنا اور اس زبان کو سیکھتے ہوئے اس سے متعلقہ یا مروجہ تہذیب کو بھی اختیار کر لینے کو بھی ضروری سمجھنا بھی نہ مناسب ہوگا۔ اگر کوئی انگریزی زبان سیکھتا ہے اور اس زبان کے ساتھ اپنے اندر انگریزی تہذیب پیدا کر لیتا ہے تو گویا وہ اپنے مذہب سے بغاوت کر رہا ہے، انگریزی

زبان ضرور سیکھئے مگر اس زبان کو سیکھنے کے لیے مذہب کو قربان نہ کیجئے۔ ایک حساس اور ذی شعور مسلمان اسلام کی خاطر قربانی تو دے سکتا ہے مگر اپنے مذہب کو قربان نہیں کر سکتا۔

وقت کی اہم ضرورت

جب بین الاقوامی زبان انگریزی کا سیکھنا بھی ضروری ہو نیز اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کی حفاظت بھی ضروری ہو تو ظاہر ہے کہ یہ دونوں مقصد اس صورت میں حاصل نہیں ہو سکتے، جب کہ موجودہ نوعیت کے عام اسکولوں میں اپنی اولاد کو پڑھایا جائے۔ جس اسکولوں کی مشنری یا تو عیسائی اسکولوں کو حاصل ہے، یا کفار و مشرکین ان اسکولوں پر مسلط ہیں۔ یا ایسے مسلمانوں کے ہاتھوں میں وہ اسکول ہیں جن میں صرف تعلیم کی اہمیت ہے مذہب کی اہمیت نہیں۔ موجودہ اسکولوں کی صورتحال کو دیکھنے اور ان کے نتائج سے آگاہ ہونے کے بعد ایک ہی صورت و شکل ایسی ہے جس کے ذریعے ہم ایک حد تک اپنی اولاد کو دین سے بھی آگاہ کر سکتے ہیں اور انگریزی زبان سے بھی قریب تر کر سکتے ہیں، اسکولوں کی وہ صورت ایک ہی ہے جس کا نام یہ دیا جا سکتا ہے۔ انگلش میڈیم اسکول، (عربی اردو ضروری)

اپنی اولاد کے ایمان کی حفاظت کے لیے جس تیزی کے ساتھ عیسائی مشنری اسکول قائم کئے جا رہے ہیں، اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ ایسے اسکول قائم کرنے کی سخت ضرورت ہے، جن اسکولوں میں ہمارے مذہب اور ہماری تہذیب کی تعلیم دی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی اولاد کو انگریزی زبان میں بھی ماہر بنایا جائے۔ اس طرح ہماری اولاد دنیوی اعتبار سے بھی مشنری اسکولوں میں تعلیم پانے والے دوسرے بچوں کے ہم پلہ ہوگی۔ اور ان کی طرح یہ بچے بھی علم و ہنر میں ماہر زمانہ ہوں گے اور دینی اعتبار سے

اپنی حالت بھی مستحکم ہوگی اوران کا ایمان بھی قوی تر ہوگا۔اورآگے چل کر یہ جہاں کسی علم وہنر کے معلم ہوں گے وہیں دین کے داعی،اپنے مذہب کے علمبردار اور اسلامی تہذیب کے دلدادہ بھی ہوں گے۔

(مطبوعہ روزنامہ سالار 29/05/2003)

شبِ برأت کی فضیلت اور احکام

اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کے افراد کو عمر مختصر عطا فرمائی ہے۔اس مختصر مدت میں مختصر عمل پر ثوابِ عظیم اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں۔ یہ امتِ مسلمہ کی خصوصیات وامتیازات میں سے ہے کہ عمل قلیل اور تھوڑا ہوتا ہے،مگر اس کا اجر اور جزا اللہ تعالیٰ وافر مقدار میں عطا فرماتے ہیں۔ جب کہ سابقہ امتوں کے افراد لمبی لمبی عمر پاتے تھے اور کئی ہزار سال تک اعمال صالحہ میں مشغول رہتے تھے،مگر ان کو ثواب اتنا ہی دیا جاتا، جتنا ان کا عمل ہوتا۔ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے ایک ایسے آدمی کا تذکرہ فرمایا جو ایک ہزار مہینے تک اللہ کے راستے میں جہاد کرتا رہا ہے۔ صحابہؓ کو اس پر رشک آیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تلافی کے لیے سورۂ قدر نازل فرمائی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی امتوں کی عمروں کو دیکھا کہ ان کی عمریں طویل ہوتی تھیں اور آپؐ کی امت کی عمریں بہت تھوڑی ہیں۔ اگر وہ نیک اعمال میں ان کی برابری کرنا چاہیں تو ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔اس سے اللہ تعالیٰ کے حبیب کو رنج ہوا۔اس کی تلافی میں اللہ تعالیٰ نے شبِ قدر مرحمت فرمائی۔

سورۂ قدر کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو مختصر عمر عطا فرمائی ہے۔ لیکن کچھ ایام ، کچھ راتیں ، کچھ شب وروز ایسے عنایت فرمائے جو کئی ہزار برس کی عبادتوں اور اطاعتوں پر بھاری ہیں۔ مثلاً شبِ قدر ہے، شبِ برات ہے ۔ رمضان کے شب وروز ہیں۔ جمعہ کے دن ورات ہیں۔ الغرض انہی متبرک ومقدس راتوں میں سے ایک ’’شب برات‘‘ ہے۔ جس کے معنی ہیں ایسی رات، جس میں اللہ تعالیٰ مومن کو جہنم سے آزادی اور

خلاصی عطا فرماتے ہیں۔ شبِ برات کے بارے میں قرآن مجید میں کیا ہے اس پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں انا انزلنه في ليلة مباركة ہم نے قرآن مجید کو ایک مبارک رات میں اتارا۔ اب یہاں مبارک رات سے مراد بعض مفسرین جیسے حضرتِ عکرمہ وغیرہ حضرات کے نزدیک شبِ برات ہے، [ہر زمانے کے مشہور ومعروف مفسرین اپنی تفسیروں میں حضرتِ عکرمہ کا قول نقل کرتے آئے ہیں] جب کہ اکثر مفسرین کے نزدیک شبِ قدر۔ اس لیے کہ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں اِنَّا اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ اس اعتبار سے یہ طے شدہ امر ہے کہ قرآن کا نزول تو شبِ قدر میں ہوا لیکن اِنَّا اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَکَةٍ کے بعد فِیۡهَا یُفۡرَقُ کُلُّ اَمۡرٍ حَکِیۡمٍ والی آیت ہے۔ اس سے حضراتِ مفسرین نے استدلال فرمایا کہ یہاں لیلۃِ مبارکہ سے مراد شبِ برات ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تمام اہم فیصلے، حکمت والے فیصلے، قضا قدر کے فیصلے اسی رات میں فرماتے ہیں۔ نیز یہ فیصلے بھی ہوتے ہیں کہ کس کو کتنی عمر دینی ہے اور کس کی زندگی باقی ہے۔ کس کو کتنا رزق دینا ہے اور کتنا رزق ابھی باقی ہے وغیرہ وغیرہ۔

حضراتِ مفسرین کرام ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے اس کو دور کرتے ہوئے اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ اِنَّا اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَکَةٍ کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے شبِ برأت میں قرآن مجید کو اتارنے کا فیصلہ کیا۔ اس لیے کہ تمام اہم فیصلے شبِ برأت میں ہوتے ہیں تو تمام اہم فیصلوں کے ساتھ یہ اہم اور مہتم بالشان فیصلہ بھی ہوا کہ رمضان کے مہینے میں شبِ قدر میں قرآن مجید کو اتارا جائے گا۔ اور اِنَّا اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے شبِ قدر میں قرآن مجید کو اتار دیا۔ بعض علماء نے شبِ قدر اور شبِ برأت میں نزولِ قرآن کی تطبیق اس طرح دی ہے کہ شبِ برأت میں پورا

قرآن مجید آسمانِ دنیا پر نازل ہوا۔ اور شبِ قدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعۂ وحی اترنا شروع ہوا۔ جس کا سلسلہ ۲۳ سال میں مکمل ہوا۔

شبِ برأت کا دوسرا نام لیلۃ الصک (چیک دینے کی رات) ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ رزق اور موت وحیات وغیرہ تمام مہتم بالشان امور کے فیصلے شبِ برأت میں فرماتے ہیں، اور شبِ قدر میں فرشتوں کے حوالے کیے جاتے ہیں۔ رُوِیَ اَبُو الضُّحٰی عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا اِنَّ اللّٰہَ یَقْضِی الْاَقْضِیَۃَ فِی لَیْلَۃِ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ وَیُسَلِّمُھَا اِلٰی اَرْبَابِھَا فِی لَیْلَۃِ الْقَدْرِ [مظھری]

شبِ برأت کے اور بھی نام ہیں، مثلاً لیلۃ الرحمۃ، لیلۃ المبارکۃ بھی منقول ہیں۔ اس لیے کہ اس میں بیشمار اللہ کی رحمتیں، برکتیں سورج کے غروب سے لے کر صبح صادق تک نازل ہوتی رہتی ہیں۔ اس کی فضیلت کے سلسلے میں تقریباً ۱۷ اصحابہ کرامؓ سے احادیث منقول ہیں۔ نیز امتِ مسلمہ کا شروع سے اس پر تعامل ہے۔ ان احادیث سے شبِ برأت میں کسی خاص عمل کو ثابت نہیں کیا گیا ہے بلکہ مطلق اعمالِ صالحہ [بقدر توفیق نوافل، خصوصاً تہجد کی نماز پڑھنا، قرآن کریم کی تلاوت، اللہ کا ذکر استغفار وغیرہ کی ادائیگی] کے کرنے کی ترغیب دی جارہی ہے۔ چند احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ پندرہویں شبِ شعبان میں تمام مخلوق کی طرف تجلی فرماتے ہیں اور ساری مخلوق کی مغفرت فرماتے ہیں۔ البتہ مشرک اور کینہ رکھنے والے کی مغفرت نہیں ہوتی۔ [صحیح ابن حبان] اسی مضمون کی روایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، اس میں قاتل اور بغض رکھنے والے کے علاوہ تمام مخلوق کی مغفرت کا ذکر ہے۔ نیز حضرت

ابوموسی اشعریؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوثعلبہ الخشنیؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عوف بن مالکؓ وغیرہ سے بھی اسی مضمون کی روایات نقل کی گئیں ہیں۔ نیز یہی روایت حضرت کثیر ابن مرہؓ سے مرسلاً منقول ہے۔

حضرت عثمان بن ابی العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پندرہویں شبِ شعبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز لگائی جاتی ہے کہ ہے کوئی مغفرت کی دعا مانگنے والا کہ میں اس کے گناہ معاف کروں۔ ہے کوئی سوال کرنے والا کہ میں عطا کروں، ہر سوال کرنے والے کو میں عطا کرتا ہوں سوائے مشرک اور زنا کار کے۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ میں نے ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بستر پر نہ پایا تو میں آپ کی تلاش میں نکل پڑی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بقیع الغرقد (مدینہ کا قبرستان) میں تشریف فرماتے تھے۔ آپ نے فرمایا: اے عائشہ، کیا تمہیں ڈر تھا کہ اللہ اور اس کے رسول تم پر ظلم کریں گے۔ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ مجھے گمان ہوا کہ آپ دیگر ازواجِ مطہرات کے پاس تشریف لے گئے ہوں گے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ پندرہویں شبِ شعبان کو آسمانِ دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور قبیلۂ کلب کی بکریوں کے بالوں سے زیادہ لوگوں کی مغفرت کی جاتی ہے۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں قبیلۂ کلب کا تذکرہ اس لیے فرمایا کہ مدینے کے قبائل میں سب سے زیادہ بکریاں قبیلۂ کلب کے پاس تھیں۔) مگر مشرک، عداوت کرنے والے اور رشتہ ناطہ توڑنے والے، تکبرانہ طور پر ٹخنوں سے نیچے کپڑا پہننے والے، والدین کی نافرمانی کرنے والے، شراب پینے والے کی طرف اللہ تعالیٰ نظرِ کرم نہیں فرماتے۔ [مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ]

حضرت علی بن ابی طالبؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا کہ جب شعبان کی پندرہویں شب ہو تو اس شب میں قیام کرو اور اس دن روزہ رکھو۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ غروبِ آفتاب کے وقت سے آسمانِ دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ کوئی مغفرت طلب کرنے والا ہے کہ میں مغفرت کروں، کیا کوئی رزق کا متلاشی ہے کہ اسے میں رزق عطا کروں۔کیا کوئی مصیبت کا مارا ہوا ہے کہ میں اس کی مصیبت دور کروں وغیرہ وغیرہ۔صبح صادق کے وقت تک ایسا اعلان ہوتا رہتا ہے۔[ابن ماجہ، بیہقی فی شعب الایمان] اس روایت میں شعبان کی پندرہویں تاریخ کو روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔اس دن روزہ رکھنا مستحب ہے واجب نہیں۔

مطلق ماہِ شعبان میں رسول اللہ ﷺ کا زیادہ روزے رکھنا بیشمار احادیث میں منقول ہے۔اس لیے ماہ شعبان میں کثرت سے روزہ رکھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔لیکن ماہِ رمضان سے پندرہ دن پہلے روزہ رکھنے سے منع کیا گیا ہے تاکہ رمضان کا استقبال مکمل نشاط وانبساط اور چستی اور تیاری کے ساتھ کیا جائے۔کمزوری اور ضعف واضمحلال کے ساتھ نہیں۔

جن گنہگاروں کی اس بابرکت رات میں بھی مغفرت نہیں ہوتی وہ یہ ہیں: مشرک، قاتل، والدین کا نافرمان، بغض وعداوت رکھنے والا، رشتہ ناطہ توڑنے والا۔ تکبرانہ طور پر ٹخنوں سے نیچے کپڑا پہننے والا، شرابی، زانی۔اگر مذکورہ افراد اپنے ان برے اعمال سے سچی توبہ کرلیں اور اپنے اوپر بندوں کے جو حقوق لازم ہیں ان کو ادا کریں یا ان سے معافی مانگ لیں تو ان کی مغفرت کی بھی امید کی جاسکتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک ارشاد ہے کہ رمضان کی ہر رات میں ایک منادی کو حکم ہوتا ہے کہ تین مرتبہ یہ آواز دے کہ ہے کوئی مانگنے والا جس کو میں عطا کروں ۔ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ میں اس کی توبہ قبول کروں، ہے کوئی مغفرت چاہنے والا کہ میں

اس کی مغفرت کروں۔کون ہے جوغنی کوقرض دے،ایسا غنی جو نادارنہیں، بلکہ ایسا پورا پورا ادا کرنے والا ہے جو ذرا بھی کمی نہیں کرتا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رمضان میں روزہ افطار کے وقت ایسے دس لاکھ آدمیوں کو جہنم سے خلاصی مرحمت فرماتے ہیں جو جہنم کے مستحق ہو چکے تھے اور جب رمضان کا آخری دن ہوتا ہے تو یکم رمضان سے آج تک جس قدر لوگ جہنم سے آزاد کئے گئے ان کے برابر اس ایک دن میں آزاد فرماتے ہیں،اور جس رات شبِ قدر ہوتی ہے اللہ جل شانہ فرشتوں کو حکم فرماتے ہیں،فرشتے ایک بڑے لشکر کے ساتھ زمین پر اترتے ہیں،ان کے ساتھ ایک سبز جھنڈا ہوتا ہے جس کو کعبہ کے پاس کھڑا کرتے ہیں،اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کے سو بازو ہیں ،جن میں سے دو باز و صرف اسی رات کو کھولتے ہیں،جن کو مشرق سے مغرب تک پھیلا دیتے ہیں ،پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کو تقاضہ فرماتے ہیں کہ جو آج کی رات کھڑا ہو یا بیٹھا ہو اور نماز پڑھ رہا ہو یا ذکر کر رہا ہو اس کو سلام کریں،اور مصافحہ کریں،اور ان کی دعاؤں پر آمین کہیں،صبح تک یہی حالت رہتی ہے، جب صبح ہوجاتی ہے تو جبرئیل آواز دیتے ہیں کہ اے فرشتوں کی جماعت اب کوچ کرو۔فرشتے حضرت جبرئیل سے پوچھتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے مومنوں کی حاجتوں اور ضرورتوں کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا۔وہ جواب دیتے ہیں،اللہ جل شانہ نے ان پر توجہ فرمائی اور چار شخصوں کے علاوہ سب کو معاف کردیا، صحابہ نے پوچھا،یارسول اللہ وہ چار شخص کون ہیں۔ارشاد ہوا کہ ایک وہ شخص جو شراب کا عادی ہو، دوسرا وہ شخص جو والدین کی نافرمانی کرنے والا ہو،تیسرا وہ جو قطع رحمی کرنے والا ہو،اور ناطہ توڑنے والا ہو،اور چوتھا وہ شخص جو کینہ رکھنے والا ہو،اور آپس میں قطع تعلق کرنے والا ہو۔(بیہقی)

مطبوعہ: روزنامہ سالار 23/12/2000

قربانی

ایک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

اقوام و ملل کی تاریخ میں شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو گا کہ کسی باپ نے اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ اپنے ہی گھر کے چشم و چراغ بلکہ اکلوتے بیٹے کو ایک خواب کی وجہ سے اپنے ہی ہاتھوں ذبح کرنے کا ارادہ کیا ہو۔ یہ بات بظاہر ناممکنات میں سے نظر آتی ہے، لیکن قربان جایئے اللہ کے پیارے نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر کہ آپ نے خواب میں دیکھا کہ آپ اپنے لخت جگر کو ذبح کر رہے ہیں،

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

''منشاءِ خداوندی'' کو بھانپتے ہوئے آپ نے فوراً اپنے ارادے کا اظہار اپنے بیٹے سے کیا تو '' اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ '' کے مصداق بیٹے نے فوراً حامی بھر لی اور اپنی جان جان آفریں کے حوالے کرنے تیار ہو گیا۔

غالب تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

کے مصداق باپ بیٹا دونوں قربان گاہ کی طرف چل دیے، خیر، القصہ مختصر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا، ایک بہشتی دنبہ کی قربانی ہو گئی اور اس کے بعد سے تمام امتوں کے لیے قربانی کا

عمل ہمیشہ کے لیے مشروع ہوگیا اور یہی عمل امتِ محمدیہ کے لیے بھی قابل عمل قرار پایا۔

قربانی ایک اہم عبادت ہے اور شعائر اسلام میں سے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی اس کو عبادت سمجھا جاتا تھا۔ مگر بتوں کے نام پر قربانی کرتے تھے، آج تک بھی اسی طرح اور اسی نہج پر دوسرے مذاہب اور دیگر قوموں میں قربانی مذہبی رسم کے طور پر ادا کی جاتی ہے۔ ہندوستان کی قوم ہنود اپنے معبودوں کے نام پر قربانی کرتے ہیں، قوم نصاریٰ مسیح کے نام پر قربانی کرتے ہیں لیکن ہم کو اللہ کے بندے ہونے اور امت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والتسلیم میں رہنے کا شرف حاصل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحر (ترجمہ: آپ اپنے رب کے لئے نماز ادا کیجئے اور قربانی کیجئے) ۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن پاک میں محبوب دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ جس طرح نماز اللہ کے علاوہ کسی کی نہیں ہوسکتی اسی طرح قربانی بھی اسی کے نام پر ہونی ء چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں اسی مفہوم کو دوسرے عنوان سے اس طرح بیان فرمایا ہے اِنَّ صَلاتِی وَنُسُکِیُ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۔ترجمہ یقیناً میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کے لئے ہے جو دونوں جہاں کا پالنہار ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں تیرہ سال قیام پذیر تھے پھر جب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمائے تو بعد ہجرت دس سال مدینہ منورہ میں قیام فرمایا، ہر سال برابر قربانی کرتے تھے۔ اس سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ قربانی کا مبارک عمل ہر سال ادا کرنا واجب ہے جبکہ اس کے وجوب کے شرائط پائے جائیں۔

قربانی کا یہ عمل اپنے اندر بہت سا خیر لیے ہوئے ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قربانی کے دن اللہ تعالیٰ کو قربانی سے زیادہ کوئی اور عمل محبوب نہیں۔ لسانِ نبوت کے اس اظہار کا تقاضہ تو یہی تھا کہ اس دن ساری امت محمدیہ اپنی طرف سے بھی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی قربانی ادا کرے تاہم شریعت کی طرف سے اس میں امت کے لیے یہ سہولت رکھی گئی ہے کہ قربانی ہر شخص پر واجب نہیں، صرف اسی شخص پر قربانی واجب ہے جو صاحب نصاب ہو، یعنی موجودہ موزونات کے حساب سے جس کے پاس چھ سو بارہ گرام چاندی یا اس کی قیمت یا اس کے بقدر ساز و سامان اپنی حاجاتِ اصلیہ سے زائد ہو۔ ہاں اگر کسی کم پیسے والے یعنی فقیر شخص نے بھی ایام قربانی (۱۰، ۱۱، ۱۲ ذی الحجہ) میں کوئی جانور قربان کرنے کی نیت سے خرید لیا تو اب اس جانور کی قربانی واجب ہو جائے گی کہ یہ جانور بہر حال اللہ کے نام پر قربان ہونے کے لیے متعین ہو گیا ہے۔ اب اسے دوسرے مصرف میں صرف نہیں کیا جا سکتا۔

نیز احادیث میں یہ بھی ہے کہ جانور کے بدن پر جتنے بال ہوتے ہیں اتنی ہی نیکیاں قربانی کرنے والے کے نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہیں۔ اب ذرا سوچئے کہ اس دورِ جدید میں اور انٹرنیٹ ٹکنالوجی کے دور میں بھی کیا ایسی کوئی مشین دریافت ہوئی ہے جو ایک جانور کے مکمل بال (نہ ایک کم نہ ایک زیادہ) گن کر بتا دے۔ پس ارشادِ خداوندی کا ظاہری مفہوم یہی ہوسکتا ہے قربانی کی نیکیاں اتنی ہیں کہ ہمارے لیے ان کو گننا ہی ممکن نہیں۔ اتنی زیادہ نیکیاں کمانے کے لیے اگر ایک چھوٹا سا عمل کرنا پڑے اور تھوڑے سے مال کے ساتھ تھوڑی سے وقت و جان کی قربانی دینا ہو تو اس سے زیادہ نفع کا سودا اور کیا ہوگا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو قربانی کی

تاکید فرماتے تھے اور نہ کرنے والوں کے لئے سخت زجر وتوبیخ بیان فرماتے تھے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مَنْ كَانَ لَهُ سَعَةٌ وَلَمْ يُضَحِّ فَلا يَقْرِبَنَّ مُصَلَّانَا یعنی جس شخص کے پاس وسعت اور گنجائش ہو اس کے باوجود وہ قربانی نہ کرے تو وہ ہمارے عید گاہ کے قریب نہ آئے۔ پوری امت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والتسلیم دین وشریعت کے ایک اہم حکم کو بجالا رہی ہے اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی یادگار کو بنانے میں مصروف ہے تو انہی میں ایک شخص جسے خدا تعالیٰ نے وسعتوں سے نوازا ہے اور وہ سہولت اور آسانی سے اس اہم سنت مبارکہ اور شعار اسلام میں حصہ لے سکتا ہے لیکن اس کے باوجود بے پرواہی برت رہا ہے تو اس کا کیا حق بنتا ہے کہ وہ سب مسلمانوں کے ساتھ مل کر عید منائے؟ اسی لئے تمام علماء کے نزدیک قربانی واجب ہے۔ حضرت حکیم الامت تھانویؒ اپنی مشہور کتاب اغلاط العوام میں تحریر فرماتے ہیں ”بہت سے لوگ باوجود وسعت کے قربانی نہیں کرتے خاص کر دیہات کے لوگ اس میں بہت غفلت کرتے ہیں حلانکہ حدیث شریف میں ہے جو صاحب وسعت قربانی نہ کرے وہ ہمارے عید گاہ کے قریب نہ آئے اور یہ معلوم ہے کہ عید گاہ میں وہ لوگ جاتے ہیں جو مسلمان ہیں اور عید گاہ سے بے تعلقی اور بعد (دوری) انہیں کو ہے جو کافر ہیں۔ اب غور کرنا چاہئے کہ حدیث شریف میں قربانی نہ کرنے والوں کے لئے کس قدر تہدید اور وعید شدید ہے (اغلاط العوام)۔

شہروں میں اپنی مصروفیات کی بناء پر عموماً لوگوں کا یہ مزاج بنا ہوا ہے کہ قربانی کے لئے کسی ایک کو پیسے دیدیتے ہیں اور یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ وہ قربانی کے تمام فرائض انجام دے لے گا حالانکہ فقہاء کرام نے تحریر فرمایا ہے کہ اپنی قربانی کو خود اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا

افضل ہے۔اگر خود ذبح کرنا نہیں جانتا تو دوسرے سے ذبح کرا سکتا ہے مگر ذبح کے وقت وہاں خود بھی حاضر رہنا افضل ہے اسی سلسلے میں ترغیب وترہیب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ فاطمہ! اٹھو اور اپنی قربانی کے پاس رہو (اور اسے ذبح کرتے ہوئے دیکھو) کیونکہ اس کے خون کا پہلا قطرہ جو زمین پر گرے گا اس کے ساتھ ہی تمہارے تمام گذشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔

عید قرباں کے تعلق سے ایک ضمنی بات بھی یہاں ذکر کردوں کہ آج کل ہمارے شہر میں ایک نئی وبا پھوٹ پڑی ہے کہ اکثر ذمہ دارانِ مساجد یہ چاہنے لگے ہیں کہ اگر فلاں فلاں مسجد میں عید کی نماز ہوتی ہے تو ہماری مسجد میں کیوں نہ ہو۔ یہ مرض اب اتنا بڑھ گیا ہے کہ مرضِ لا علاج کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اتحاد اسلامی کا اصلی مظاہرہ تو اس صورت میں ہوتا کہ (جس طرح تبلیغی بڑے اجماعات کے موقع پر سارا شہر کسی ایک جگہ جمع ہو جاتا ہے) عید کے موقع پر بھی تمام اہلیانِ شہر کسی بہت بڑی میدان میں جمع ہوتے اور سارے اسلامی بھائی ایک امام کی اقتداء میں نماز عید ادا کرتے۔لیکن شہر بنگلور اور اس جیسے دوسرے بڑے شہروں میں اب یہ بات ممکن نہیں رہی۔لیکن احقر کی رائے میں کم از کم اتنا تو ہو ہی سکتا ہے کہ شہر کے جو معروف عیدگاہ اور میدانات ہیں وہیں پر نماز عید ادا کی جائے، اور اس سلسلے میں چھوٹے موٹے اعذار (راستوں کی خرابی، موسم کا رونا، عیدگاہ کی دوری) کو بہانا نہ بنایا جائے۔

عیدِ قرباں نہ رائیگاں جائے

عیدِ قرباں کی آمد آمد پر ایک خصوصی پیشکش

عیدِ قرباں کی آمد آمد ہے۔ ہزاروں سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزندِ اکبر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حکمِ خداوندی پر قربان کرنے کا تہیہ کر کے جو انوکھا نمونہ تعمیلِ ارشاد کا پیش فرمایا، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بغیر چون وچرا کیے سرِ تسلیم خم کر کے جو نادر نمونہ اطاعت وفرمانبرداری کا پیش فرمایا، عیدِ قرباں اسی کی یاد برقرار رکھنے کا ذریعہ ہے اور الحمدللہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اس عید میں اپنی طرف سے اور اپنے آقا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے، نیز مرحوم رشتے داروں وغیرہ کی جانب سے قربانی ادا کرتا ہے، اور اس موقع پر وہی فرحت اور ویسی ہی خوشی پاتا ہے، جیسی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حکمِ خداندی پر عمل کرتے ہوئے حضرت اسماعیل کو ذبح کرنے کی کوشش کرتے وقت اور پھر جنتی دنبے کو ذبح کرتے وقت پائی ہوگی۔ شاید اسی موقع کے لیے علامہ اقبال نے کہا تھا وہ مصرعہ

مسلمانی میں طاقت خوں بہانے ہی سے آتی ہے

بہر کیف ! قربانی جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے، وہیں آقائے مدنی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تعمیل بھی ہے۔ احادیث مبارکہ کی تمام مشہور کتب متداولہ میں یہ حدیث موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو موٹے تازے مینڈھے ذبح فرمائے تھے ایک اپنی طرف سے اور ایک اپنی امت کی طرف سے

۔نیز جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی ازواجِ مطہرات کی جانب سے گائے ذبح کرنا خود بخاری شریف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے (رقم الحدیث ۵۱۲۲) قربانی کی فضیلت کا ہلکا سا اندازہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث مبارکہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپؐ نے فرمایا'' قربانی کے دن اللہ تعالیٰ کو قربانی سے زیادہ کوئی اور عمل محبوب نہیں''۔نیز یہ بھی کہ'' جانور کے بدن پر جتنے بال ہوتے ہیں اتنی ہی نیکیاں قربانی کرنے والے کے نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہیں''۔

ان احادیث مبارکہ کا مقتضاء تو یہ ہے کہ تمام مسلمان خواہ وہ امیر ہوں یا غریب، اپنی تمام تر مصروفیات کو چھوڑ کر، اس دن کو قربانی کے لیے خاص کرلیں اور بہر صورت قربانی کا عمل اپنے ہاتھوں انجام دیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک ہاتھوں سے ہی یہ عمل انجام دیا تھا،اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ فرمایا تھا کہ قربانی کے وقت سامنے حاضر رہیں۔لیکن شریعت مطہرہ میں جہاں دیگر بہت ساری آسانیاں ہیں وہیں یہ بھی ہے کہ قربانی صرف صاحبِ نصاب پر واجب ہے،(صاحب نصاب اسے کہتے ہیں کہ جس کے پاس چھ سو بارہ گرام 612 چاندی یا اس کی قیمت یا اس کے بقدر ساز وسامان اپنی حاجاتِ اصلیہ سے زائد ہو) اور یہ بھی لازمی نہیں کہ بکرا ہی ذبح کیا جائے، بلکہ اگر گائے، بیل، بھینس، اونٹ بھی ذبح کرے تو بھی جائز ہے۔اور ان بڑے جانوروں میں ایک سے لے کر سات افراد تک شریک ہوسکتے ہیں جب کہ سب کی نیت قربانی ہی کی ہو، محض گوشت کھانے کی نہ ہو۔اب اس پر بھی مسلمان اپنی کاہلی، بے توجہی، غفلت اور تساہل وتغافل کی بناء پر مزید آسانیاں تلاش کرنے لگیں، کہ گائے کو خریدا ہی نہ جائے، بازار کا رخ ہی نہ کیا جائے، گائے کی رسی کو بھی ہاتھ نہ لگنے پائیں کہ ہاتھ میلے

ہوجاتے ہیں ۔بس اتنا کیا کہ شہر کے مختلف علاقوں میں پھر کر بڑے بڑے ہورڈنگس بورڈوں میں دیکھ لیا کہ فلاں جگہ پر مشترکہ قربانی کا حصہ کتنے میں دیا جارہا ہے، کہیں 2050، کہیں 2000، کہیں 1950 اور کہیں اس سے بھی کم تو جو اپنے کو مناسب لگا، یا جس میں اپنا مفاد زیادہ نظر آیا وہیں جا کر نام لکھا دیے، ایک پرچہ ہاتھ میں لے لیے اور سمجھے کہ بس ہماری تو قربانی ادا ہوگئی۔

قارئین کرام! راقم الحروف کو معاف فرمائیں۔مشترکہ قربانی کے سلسلے میں آج کل شہر بنگلور میں جو کچھ لاپرواہی کے مظاہرے ہورہے ہیں، چندایک امور کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں ۔ایک دفعہ یہ شکایت بھی سننے کو ملی ہے کہ مشترکہ قربانی کے فلاں منتظمین نے اس خیال سے کہ صبح عید کی نماز کے بعد قربانی شروع کریں تو گائے کو ذبح کرنے اور پھر تقسیم گوشت کے لیے وقت بہت کم بچتا ہے، اور کام زیادہ ہے، اس لیے قربانی سے پہلے والی رات ہی کو گائے ذبح کردیے اور اس طرح عید کے دن اوروں سے پہلے اپنے کام سے فارغ ہوگئے اور زیادہ نفع کمالیا۔جب کہ بچہ بچہ یہ مسئلہ جانتا ہے کہ قربانی عید کی نماز کے بعد ہی ادا ہوسکتی ہے، اس سے پہلے جائز نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ عیدالاضحیٰ کی نماز پڑھائی، اس کے بعد آپ کو معلوم ہوا کہ کسی نے (ناواقفیت کی بناء پر) نماز سے پہلے ہی اپنے جانوروں کو ذبح کردیا ہے، آپ نے فرمایا مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلاةِ فَاِنَّمَا ذَبَحَ لِنَفْسِهِ وَمَنْ ذَبَحَ بَعْدَ الصلاةِ فَقَدْ تَمَّ نُسُكَهُ وَ اَصَابَ سُنَّةَ الْمُسْلِمِيْنَ (رواہ مسلم) کہ جس نے نماز سے پہلے ذبح کردیا، یہ ایسا ہے گویا اس نے اپنے (کھانے) کے لیے ذبح کیا ہے، یعنی اس کی قربانی ادا نہیں ہوئی۔اور جس نے نمازِ عید کے بعد ذبح کیا تو ٹھیک ہے، اس کی قربانی ادا ہوگئی اور اس نے مسلمانوں والا عمل کیا۔

اسی طرح یہ شکایت تو بہت عام ہے کہ مشترکہ قربانی کے منتظمین اس قدر فربہ اور

موٹی، گایوں کا انتظام کرتے ہیں اگر وہ ایک دوسرے کے ساتھ سہارا لگا کر نہ کھڑی کی جائیں تو اپنے پیروں پر کھڑ بھی نہ سکیں۔ ان کی ہڈیاں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرندوں کی ہڈیاں ہیں جن میں گد نہیں ہوتا۔ اور پسلیوں کو گننے کے لیے ایکسرے مشین کی ضرورت نہیں، یونہی سادہ نگاہوں سے گنی جاسکتی ہیں۔ گوشت ہر گائے میں ہوتا ہے مگر ہڈیوں سے کم وزنی۔ معلوم نہیں ہوتا کہ ایسی دبلی پتلی گائیں ہمارے اس ہرے بھرے ہندوستان میں پائی کہاں جاتی ہیں۔ ممکن ہے بنگلہ دیش وغیرہ سے امپورٹ کی جاتی ہوں بادبانی جہاز میں۔

مگر سارا الزام مشترکہ قربانی کے منتظمین پر دھرنا بھی صحیح نہیں۔ ہماری اپنی بھی بہت کچھ کوتاہیاں ہیں۔ سب سے بنیادی بات تو یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی قربانی کا انتظام اپنے ہاتھوں خود کرنا چاہیے۔ خود جا کر بازار سے نرخ معلوم کرے، چھوٹا یا بڑا جانور جو بھی خریدے، خوب دیکھ بھال کر خریدے۔ زیادہ کچھ نہ ہوسکے تو کم از کم عید سے ایک دو روز پہلے لاکر اپنے مکان پر باندھ دے، اپنے ہاتھوں چارہ پانی دے۔ اپنے بچوں کو جانور سے مانوس کرائے، جانور کی دیکھ بھال میں وقت لگائے، پھر نماز عید کے بعد جلد از جلد اپنا جانور اپنے ہاتھوں ذبح کرے۔ قصائی سے معاملہ طے کر کے جانور کے ٹکڑے کرائے۔ بات چیت میں جو اجرت طے ہو ادائیگی کے وقت اس سے کچھ بڑھ کر اجرت دے (کہ اجرت بڑھا کر دینا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت ہے جو آج کل مفقود ہوتی جارہی ہے) لیکن جانور کے اعضاء مثلاً چمڑا، سرا، یا پائے بوٹی وغیرہ اجرت میں نہ دے۔ پھر گوشت کے تین حصے کر کے ایک حصہ اپنے لیے اور ایک حصہ فقراء و مساکین کے لیے اور ایک حصہ اپنے رشتے دار و احباب کے لیے دیدے۔

یہ نہ ہوسکے تو اس سے تو مفر ہی نہیں کہ کم از کم اپنے خاص احباب و متعلقین میں دو چار لوگ اس طور پر جمع ہوجائیں کہ سب مل کر ایک بڑا جانور خرید لیں اور ان میں سے کسی کا حصہ ساتویں

حصے سے کم نہ ہو، پھر سب مل کر کسی ایک صاحب کو اس کے ذبح وغیرہ کی ذمہ داری سونپ دیں، اس طرح اشتراک کے ساتھ قربانی کا عمل انجام پائے۔ پھر نہایت ٹھیک طریقے سے ناپ تول کر ہر ایک اپنے حصہ کا گوشت لے لے اور مذکور طریق پر تین حصوں میں تقسیم کر کے بانٹ دے۔

اب اس سے بھی کم درجے میں اترنا کہ مختلف ہورڈنگ بورڈس پر نظر ڈال کر دیکھ لیے کہ کہاں حصہ کم قیمت میں مل رہا ہے، اور وہاں جا کر حصہ لکھوا دیے اور پرچہ ہاتھ میں لے کر یہ سمجھ گئے کہ میری تو قربانی ادا ہوگئی۔ اب رہا گوشت تو دیکھیں گے، وقت ملا تو جا کر لے آئیں گے، دبلی پتلی گایوں کا گوشت بھی کہاں اچھا ہوتا ہے اور ہم تو مٹن کھاتے ہیں، بیف کہاں..........؟ تو اس کے جواز اور عدمِ جواز سے قطع نظر......، اور اس طرح کرنے سے قربانی ادا ہوتی بھی ہے یا نہیں؟ اس کو دیکھے بغیر...... یہ تو صاف ظاہر ہے اس عمل میں قربانی کی روح فنا ہوتی نظر آرہی ہے۔ یہ عمل ''خون بہانا'' کہاں ہے۔ یہ تو صرف پیسے کی قربانی ہوئی۔

پھر اس میں یہ خیال بھی پیش نظر رہتا ہے کہ جب ''خون بہانا'' نہیں ہے، صرف پیسے ہی دینا ہے تو کیوں نہ بہار میں دیں، آسام میں دیں، یا شمالی ہند کے فلاں غریبوں میں بانٹ دیں۔ اب یہ منتظمین کے سر ہے کہ چاہے وہ وہاں قربانی کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں، وہ جانے اور ان کا خدا، ہم نے تو قربانی کے حصے کی رقم دیدی۔ بس ہمارا کام ختم۔

یہاں بین السطور کے طور پر ایک بات وضاحت سے کہہ دوں کہ آسام، بہار اور شمالی ہند کے غریب مسلمانوں کو گوشت کھلانے کی نیت سے جو درد مند علماء مختلف جماعتوں سے اس سلسلے میں کوشش کر رہے ہیں، اور ان علاقوں میں قربانی کرنے کی اپیل کر رہے ہیں، ان کا یہ عمل بھی اپنی جگہ پر بالکل درست اور مناسب ہے، جس کی نظیر ہمیں خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں بھی ملتی ہے۔ جیسا کہ بخاری

شریف کی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے موقع پر ایک دفعہ فرمایا ''تم میں سے جو شخص قربانی کرے تو چاہیے کہ تیسرے دن کی صبح وہ اس حالت میں نہ کرے کہ اس کے پاس اپنی قربانی کا کچھ گوشت وغیرہ باقی ہو۔ (چنانچہ لوگوں نے ایسا ہی کیا، اور تین دن کے اندر تمام گوشت تقسیم کر دیا گیا،) پھر جب دوسرے سال قربانی کا موقع آیا تو لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا کہ اے اللہ کے رسول، کیا ہم اس سال بھی ویسا ہی کریں جیسا ہم نے گذشتہ سال کیا تھا، (کہ قربانی کا گوشت فوری تقسیم کر دیا تھا)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں، بلکہ اب تم خود بھی گوشت کھاؤ ،لوگوں کو بھی کھلاؤ اور چاہو تو ذخیرہ کر کے بھی رکھ سکتے ہو، گذشتہ سال چونکہ عام لوگ بہت تکلیف میں تھے تو میں نے چاہا کہ تم (قربانی کرنے والے) ان کی مدد کرو (قربانی کا گوشت وغیرہ دے کر) (بخاری، کتاب الاضاحی، رقم الحدیث: ۵۱۴۳)۔ یہ واقعہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اگر کبھی مسلمانوں پر کچھ آفت آجائے اور لوگ کھانے کو محتاج ہوں تو صاحب ثروت احباب اپنی قربانیوں میں سے بھی ان کے لیے زیادہ سے زیادہ مدد کر کے ثواب پا سکتے ہیں۔

لیکن ہمارے اس شہر میں آنے آنے ایسا مزاج بنتا جا رہا ہے کہ قربانی کی جھنجھٹ سے نجات پانے کے لیے اور دوسری طرف اپنے پیسے بچانے کے لیے لوگ دور دراز کے علاقوں میں قربانی کرا رہے ہیں۔ بہت دھیان سے اس بات کو سمجھ جانا چاہیے کہ اگر کسی وجہ سے ان دور دراز جگہوں پر قربانی نہ ہو سکی، یا مثلاً زید کا حصہ ذبح نہ ہو سکا تو شرعاً قربانی زید کے ذمہ باقی رہتی ہے اور قربانی کے ایام گذرنے کے بعد قربانی کی رقم صدقہ کرنا واجب ہو جاتا ہے، ایک حصہ کی رقم کا صدقہ کرنا نہیں، بلکہ پوری ایک جان کا۔ مثلاً

ایک بکرا سات ہزار میں ملتا ہے تو سات ہزار روپے صدقہ کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اب وہ حضرات جو اپنی عبادت کا بوجھ دوسروں کے کندھے پر ڈال کر ''سبکدوش'' ہو جانا چاہتے ہیں۔ خوب غور کرلیں کہ ذرا سی بے احتیاطی سے وہ کس قدر ''گراں بار'' ہو رہے ہیں۔

ختنہ کی شرعی حیثیت

ختنہ تمام انبیاء کی مشترکہ سنت اور امور فطرت میں سے ہے۔اس کا شمار شعائر اسلام میں ہوتا ہے اسی لیے فقہائے کرام نے وضاحت فرمائی ہے کہ اگر کسی بستی کے لوگ متفقہ طور پر ختنہ کے عمل کو ترک کردیں تو امام ان کو اس عمل پر مجبور کرے گا اور نہ ماننے کی صورت میں ان سے قتال بھی کرے گا، لہٰذا عام حالات میں کسی بھی مسلم معاشرے میں ختنہ کے ترک کی گنجائش نہیں ہے۔کئی احادیث مبارکہ میں مختلف طریق سے ختنہ کا ذکر، اس کا امورِ فطرت میں ہونا اور انبیاء کے طریق میں سے ہونا مذکور ہے۔

بعض احادیث میں اس کو حکم اور تاکید بھی آئی ہے، حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ پانچ باتیں فطری امور کے قبیل سے ہیں، ختنہ کرنا، زیر ناف بال کا مونڈھنا، مونچھ تراشنا اور بغل کے بال صاف کرنا۔(بخاری) یہی حدیث حضرت عمار بن یاسر کی روایت سے ابوداؤد میں اور حضرت ابوایوب انصاریؓ کی روایت سے ترمذی نے بھی نقل کی ہے۔حضرت کلیبؓ اسلام قبول کرنے کے بعد جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو اپنے مسلمان ہونے کی اطلاع دی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ سر کے بال کٹاؤ اور ختنہ کرو۔(فتح الباری) حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ غیر مختون کی گواہی، نماز اور اس کا ذبیحہ قابل قبول نہیں۔(مرقاۃ)

ختنہ انبیاء کی سنت

اس بات پر تمام علمائے امت کا اتفاق ہے کہ ختنہ تمام انبیاء کی سنت ہے۔البتہ

اس میں اختلاف ہے کہ تمام انبیاء مختون ہی پیدا ہوئے یا ان کا دنیا میں ختنہ کیا گیا۔ صاحب شرعۃ الاسلام نے یہ لکھا ہے کہ تمام انبیاء مختون ہی پیدا ہوئے ہیں، کسی نبی کا ختنہ دنیا میں نہیں ہوا۔ اس کا مقصد ایک تو ان کا اعزاز و اکرام تھا اور دوسرا یہ کہ کوئی انسان ان کی شرمگاہ کو اس عمل کے انجام کی خاطر بھی نہ دیکھ سکے۔ البتہ حضرت ابراہیم غیر مختون پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے اپنا ختنہ خود کیا تھا کہ ان کا یہ عمل تا قیامِ قیامت جاری ہو جائے، لیکن دوسرے حضرات نے اس کا انکار کیا ہے اور تمام انبیاء کے مختون ہونے کی حالت میں پیدا ہونے کو تسلیم نہیں کیا ہے۔

علامہ سیوطیؒ نے مختون پیدا ہونے والے انبیاء کی تعداد اٹھارہ لکھی ہے اور ان کے ناموں کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے: زکریاؑ، شیثؑ، ادریسؑ، یوسفؑ، حنظلہؑ، عیسیٰؑ، موسیٰؑ، آدمؑ، نوحؑ، شعیبؑ، سامؑ، لوطؑ، صالحؑ، سلیمانؑ، یحییٰؑ، ہودؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ جب کہ زین العرب کے حوالے سے ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ مختون پیدا ہونے والے انبیاء کی تعداد صرف چودہ ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: آدمؑ، شیثؑ، نوحؑ، صالحؑ، شعیبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، زکریاؑ، سلیمانؑ، عیسیٰؑ، حنظلہؑ بن صفوان، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ لیکن خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مختون پیدا ہونے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، اس سلسلے میں کئی اقوال ملتے ہیں، پہلا قول یہی ہے کہ آپ مختون پیدا ہوئے۔ صاحب شرعۃ الاسلام، علامہ سیوطی، اور زین العرب، وغیرہ نے یہی لکھا ہے، لیکن ابن جوزی نے کتاب الموضوعات میں لکھا ہے کہ اس سلسلے میں جو حدیث نقل کی جاتی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

علامہ شامی کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مختون پیدا ہونا کچھ آپ کی خصوصیت نہیں کہ آپ کو اس کے ذریعے کچھ فضیلت حاصل ہو، خود عرب میں آپ

سے پہلے بھی مختون پیدا ہوتے رہے ہیں، اور جو آپ ﷺ کے مختون پیدا ہونے کے قائل ہیں وہ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ آپ کی خصوصیات میں سے نہیں ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ پیدائش کے ساتویں دن آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کا ختنہ کرایا تھا، ابن قیم کا رجحان بھی یہی ہے کہ آپ کا ختنہ عام دستور کے مطابق ہوا تھا۔

ختنہ کی ابتداء

صحیح روایت کے مطابق ختنہ کی مشروعیت حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی ہے۔ حضرت ابراہیم کی عمر جب اسی یا ایک سوبیس سال کی ہوئی تو آپ کو ختنہ کرنے کا حکم دیا گیا، آپ نے حکم خداوندی کو بجالانے کے لیے کلہاڑی سے فوراً اپنا ختنہ کرلیا۔ ختنہ کے بعد جب تکلیف زیادہ ہوئی تو اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی تکلیف کو بیان کیا، جواب آیا آپ نے ختنہ کرنے میں جلدی کی، میری طرف سے آلہ ختنہ کی تعیین سے پہلے ہی ایک تکلیف دہ آلہ (کلہاڑی) سے ختنہ کرلیا، تو اب شکایت کس بات کی؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا اے اللہ میں نے اس نیت سے جلدی کی کہ تیری اطاعت میں تاخیر نہ ہوجائے اور جو حکم آپ نے دیا تھا اس کی بجا آوری میں تساہل کا شائبہ تک نہ ہو۔ (فتح الباری)

حضرت سعید بن المسیب فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم نے ہی سب سے پہلے مہمان نوازی کی تھی اور سب سے پہلے انہوں نے ہی ختنہ کیا تھا، گویا ختنہ کرنے کا رواج حضرت ابراہیم سے ہوا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو چونکہ امت ابراہیم کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے، لہٰذا اسلام میں بھی تا قیامت ملت ابراہیمی کے اس عمل (ختنہ) کو مشروع قرار دیا گیا۔

ختنہ کی مشروعیت کی وجوہ

حضرات علمائے کرام نے ختنہ کی مشروعیت کے کئی اسباب بیان کئے ہیں۔

تورات میں ہے کہ ختنہ اللہ پاک کا داغ ہے، جس طرح شاہی گھوڑوں پر داغ ہوتا ہے، اسی طرح اللہ پاک نے اپنے خلیل اوران کی اولاد کے لیے ختنہ کا داغ تجویز فرمایا اور قوت شہویہ اور بہیمیہ کے محل پر ختنہ کے داغ سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ عضو سرکاری داغ سے داغا گیا ہے، بغیر سرکاری اجازت کے کسی مصرف میں اس کا استعمال جائز نہیں۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ حضرت ابراہیم کو اپنے عزیز ترین بیٹے حضرت اسماعیل کو ذبح کرنے کا خواب میں اشارہ ملا تو انسان ہونے کے ناطے حضرت ابراہیم کے دل میں ایک قسم کا خوف پیدا ہوگیا، اگر چہ یہ خوف حکم الٰہی کے بجالانے میں مانع نہ بن سکا اور آپ دل وجان سے حکم خداوندی کو انجام دینے کے لیے تیار ہو گئے، آپ کا یہ عمل اللہ پاک کو بہت پسند آیا اور آپ کو اس خوف کو امت محمدیہ میں ختنہ کی صورت میں برقرار رکھا گیا تا کہ ان کو بھی عضو مخصوص کے کاٹنے سے جو خون بہے اس سے خوف پیدا ہو اور پھر وہ اس پر صبر کا مظاہرہ کریں اور اس طرح اسوۂ ابراہیمی پر عمل ہو جائے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں قلفہ (سپاری کی اوپری کھال جو ختنہ میں کاٹ دی جاتی ہے) ایک زائد عضو ہے، جب تک اس کے اندر حشفہ (سپاری) چھپا رہتا ہے، انسان کی قوتِ شہویہ کمزور رہتی ہے اور جماع میں اسے خاص لذت نہیں ملتی۔ اس لیے اللہ پاک کی حکیم ذات نے اس زائد عضو کو کاٹ کر جدا کرنے کا حکم دیا تا کہ انسان جماع سے پورا لطف اٹھا سکے۔

لیکن امام رازی کے نزدیک ختنہ کی وجہ اس سے بالکل مختلف ہے، وہ فرماتے

ہیں کہ مشروعیتِ ختنہ کی وجہ درحقیقت یہ ہے کہ حشفہ میں قوتِ حس زیادہ ہوتی ہے وہ جب تک قلفہ کے اندر رہتا ہے اس وقت تک جماع کے وقت غیر معمولی لذت محسوس ہوتی ہے لیکن جب قلفہ کو کاٹ کر جدا کردیا جاتا ہے تو حشفہ میں قدرے سختی آجاتی ہے، جس سے لذت کم ہوجاتی ہے، یہی شریعت اسلامی کے مناسب ہے کہ اس نے لذت کو بالکلیہ ختم نہیں کیا بلکہ اس میں اعتدال پیدا کیا۔

ختنہ کی شرعی حیثیت

احناف ومالکیہ کے نزدیک ختنہ سنت مؤکدہ اور شعار اسلام ہے۔ جسے عام حالات میں چھوڑا نہیں جاسکتا۔ حضرت اوسؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ ختنہ مردوں کے لیے سنت ہے اور عورتوں کے خوبی اور شرافت کی بات ہے۔ (شامی)

اس حدیث میں ختنہ کے سنت ہونے کی صراحت ہے، جس سے دین میں ختنہ کے مسنون ہونے کا حکم معلوم ہوتا ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب درمختار میں ہے کہ حدیث کی روشنی میں ختنہ کرنا سنت مؤکدہ ہے اور شعائر اسلام میں داخل ہے۔ اسی وجہ سے فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر کسی بستی والے متفقہ طور پر اس اہم سنت پر عمل نہ کریں تو امام وقت کی ذمہ داری ہے کہ ان کو اس عمل پر مجبور کرے اور نہ ماننے کی صورت میں ان سے جنگ بھی کرسکتا ہے۔ شوافع وحنابلہ ختنہ کے واجب ہونے کے قائل ہیں لیکن بقول علامہ شوکانیؒ صحیح بات یہ ہے کہ ختنہ کے دلائل ناکافی ہیں اور فطرت والی حدیث کی روشنی میں ختنہ کا سنت ہونا معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حق بات یہ ہے کہ ختنہ کے واجب ہونے پر کوئی دلیل قائم نہیں ہے اور خمس من الفطرۃ اور اس جیسی دوسری احادیث کی روشنی میں ختنہ کا سنت ہونا یقینی ہے۔

ختنہ کب کرائیں

ختنہ کس عمر میں کرانا چاہیے اس کے متعلق کوئی حتمی تحدید منقول نہیں ہے۔ اور اس سلسلے میں عمل بھی مختلف رہا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ختنہ کا حکم مشہور قول کے مطابق ایک سو بیس سال کی عمر میں ہوا، اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ختنہ تیرہ سال کی عمر میں کیا گیا تھا، البتہ ان کے بھائی حضرت اسحاق علیہ السلام کا ختنہ ساتویں دن ہوا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے حسن وحسین کا ختنہ بھی ساتویں دن ہی کیا گیا تھا، جب کہ حضرت ابن عباس کے مطابق اہل عرب کا معمول یہ تھا کہ وہ حضرات بالغ ہونے کے بعد ختنہ کیا کرتے تھے، امام مالکؒ اہل مدینہ کا عام معمول نقل کرتے ہیں کہ جب بچہ کے سامنے کے دانت ٹوٹنے کا وقت ہو جاتا تھا تب ختنہ کرایا جاتا تھا۔ احناف کے یہاں ختنہ سے متعلق تحدید وقت میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس تعلق سے کتب فقہ میں مشائخ کے اقوال بہت مختلف ملتے ہیں ، مثلاً ساتواں دن، ساتواں سال، دسواں سال، بارھواں سال، بلوغ کے قریب اور بلوغ کے بعد۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ بچے کی صحت اور قوتِ برداشت کو دیکھ کر ختنہ کیا جائے اور یہی درست بات ہے کہ وقت کے بارے میں کوئی تحدید نہیں۔ (درمع شامی) اگر بچے میں قوت برداشت ہو تو جتنی جلدی ممکن ہو سکے اس کا ختنہ کرادیا جائے تا کہ تاخیر کی وجہ سے اس کے زخم مندمل ہونے میں دیر نہ لگے، کیونکہ جتنی تاخیر ہوگی اتنا ہی زخم ٹھیک ہونے میں وقت لگے گا۔

ختنہ میں بلوغ تک تاخیر

ختنہ کرتے وقت بچہ کی سکت اور اس کی قوت برداشت کو مدنظر رکھنا چاہیے، اگر اس میں ایسی قوت نہ ہو کہ وہ ختنہ کے زخم کو برداشت کر سکے تو ختنہ کرنے میں جلدی نہ کرنا چاہیے بلکہ اس میں قوت برداشت کے آنے کا انتظار کرنا چاہیے ، جب اس میں تحمل

وبرداشت کی صلاحیت پیدا ہو جائے تب ختنہ کرنا چاہیے۔صحت کی کمزوری اور دیگر عوارض کی وجہ سے اگر جان کی ہلاکت کا اندیشہ ہو تو پھر ختنہ میں بلوغ تک تاخیر جائز ہے، لیکن ترک ختنہ کسی حال میں جائز نہیں۔عزیز الفتاویٰ میں ہے کہ ایک شخص نے اپنے تین بچوں کو یکے بعد دیگرے ختنہ کرایا اور تینوں بچے دو تین دن کے بعد یکے بعد دیگرے تپ وبخار میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئے، اب وہ شخص اپنے چوتھے بچے کی ختنہ کرانے کے سلسلے میں متردد تھا اور مفتی عزیز الرحمٰن صاحب سے اس سلسلے میں استفسار کیا تو انہوں نے جواباً تحریر فرمایا ''صورت مسئولہ میں ترک ختنہ جائز نہیں ہے، لیکن تاخیر بلوغ تک درست ہے، اچھے موسم میں اور جب کہ وہ لڑکا متحمل اس کا ہو سکے، ہوشیار شخص سے ختنہ کرائی جائے۔

غیر مختون بالغ کا حکم

کسی عذر کی بناء پر اگر کوئی بالغ ختنہ نہ کرا سکا ہو یا ابھی ابھی اسلام میں داخل ہوا ہو اور وہ مرض وغیرہ کی وجہ سے ضعیف وناتوان ہو تو ختنہ کا تحمل آجانے تک انتظار کیا جائے اور اس کے بعد اس کا ختنہ کیا جائے اور اگر اسے تحمل وبرداشت نہ ہو تو یونہی چھوڑ دیا جائے، ختنہ کرانا ضروری نہیں، لیکن بلا کسی عذر کے بلوغ کے بعد بھی ختنہ نہ کرنے پر اصرار جائز نہیں۔اگر کوئی شخص ختنہ کے سنت ہونے کا قائل ہے اور اسے شعارِ اسلام میں سے ہونا جانتا ہے، خیر ختنہ کرانے میں جان یا عضو کے تلف ہو جانے کا اندیشہ بھی نہیں ہے۔پھر بھی وہ لاپرواہی، مستی اور غفلت کی بناء پر ختنہ سے گریز کرتا ہے تو اس کا یہ فعل چونکہ گناہ پر اصرار کرنے کے مرادف ہے، اس لیے وہ شرعاً فاسق شمار ہوگا، مجمع البحرین میں ہے ''اگر کوئی شخص وجوب ختنہ کا قائل ہو اور ختنہ کرانے میں کوئی ضرر بھی نہ ہو پھر بھی ختنہ نہ کرائے تو وہ شخص شرعاً فاسق ہے۔

ختنہ کے لیے ستر کھولنا

بالغ کے لیے بھی ختنہ کرانا سنت ہے اور ضروری ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ بالغ کا دوسروں کے سامنے ستر کھولنا، ختنہ کرنے والے کا اس کی شرمگاہ کو دیکھنا اور چھونا کیسا ہے؟ حضراتِ فقہاء نے واضح کیا ہے کہ اس جیسی ضرورت میں ستر کو دوسروں کے سامنے کھولنے میں مضائقہ نہیں۔ ختنہ سنت موکدہ ہے تو اس کا درجہ مباح سے بڑا ہوا ہے اور جب علاج کرانا صرف مباح اور اس میں ضرورتاً شرمگاہ کی طرف دیکھنا اور اسے چھونا جائز ہے تو اس سنت کی تکمیل کے واسطے اس کا چھونا اور اس کی طرف دیکھنا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔ اسی لیے علامہ کردیؒ فرماتے ہیں کہ ختنہ کرنے کی غرض سے شرمگاہ دیکھنا جائز ہے۔ (بزازیہ مع الہندیہ) اور صاحب بدائع فرماتے ہیں ”ختنہ کرنے کی غرض سے شرمگاہ دیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اسی طرح ختنہ کرنے کے بعد علاج کی غرض سے بھی شرمگاہ دیکھی جاسکتی ہے۔

ختنہ کا طریقہ

ختنہ کہتے ہیں مرد کے عضو مخصوص کی اس کھال کے کاٹ دینے کو جو سپاری (حشفہ) کو چھپائے ہوئے ہوتی ہے۔ لہٰذا ختنہ کا مستحب طریقہ یہ ہے کہ حشفہ کو جو کھال ڈھانکے ہوئے ہوتی ہے اس کھال کو حشفہ کی جڑ سے مکمل طور پر کاٹ کر جدا کردیا جائے تاکہ حشفہ کا کوئی حصہ کھال سے ڈھکا ہوا نہ رہ جائے اور اگر کسی وجہ سے اتنی مقدار نہ کاٹی جاسکتی ہو تو کم سے کم اتنا کاٹ ڈالنا بہر حال ضروری ہے کہ کھال سے حشفہ نہ ڈھک سکے۔ اسی وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی بچہ کا ختنہ کیا گیا مگر نصف یا اس سے زائد حشفہ کھال سے چھپا ہی رہ گیا تو ختنہ معتبر نہ ہوگا۔ دوبارہ ختنہ کرانا ہوگا البتہ اگر نصف سے کم ڈھکا ہوا ہو تو دوبارہ ختنہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صاحب محیط نے یہ صراحت کی ہے کہ اگر کسی

بچہ کا ختنہ تو ہوا، لیکن کچھ دنوں کے بعد اس کی کھال دوبارہ اتنی بڑھ گئی کہ اس کا حشفہ اس میں ڈھک گیا تو پھر ختنہ کرانا ہوگا اور اگر نصف سے زائد حشفہ ڈھکا نہیں ہے تو دوبارہ اس کی ضرورت نہ ہوگی۔

ختنہ کس سے کرائے ؟

اگر آدمی بالغ غیر مختون ہو اور ختنہ خود کر سکتا ہو تو بہتر یہ ہے کہ خود کرلے دوسرے سے نہ کرائے۔ اور اگر خود نہ کر سکتا ہو تو اگر شادی شدہ ہو اور اس کی بیوی یہ عمل جانتی ہو تو اس سے کرائے۔ آج کل ختنہ عموماً اس کے ماہرین (جن کو حجام کہا جاتا ہے) سے ہی کرایا جاتا ہے۔ اور جہاں اس عمل کے لیے ڈاکٹر کی سہولت مل جاتی ہے تو ان سے بھی کرایا جاتا ہے، موجودہ ماحول میں فضائی آلودگی کے پیش نظر بہتر یہی ہے کہ کسی ڈاکٹر کے پاس صاف ستھرے ماحول (آپریشن تھیٹر وغیرہ) میں ختنہ کرائی جائے۔ البتہ اس کا خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ ختنہ خواہ جس سے بھی کرائی جائے، وہ سنت کے مطابق ختنہ کرنا جانتا ہو، اگر کوئی غیر مسلم ڈاکٹر ختنہ کرنے میں ماہر اور تجربہ کار ہو تو اس کی خدمات لینے میں بھی مضائقہ نہیں ہے۔ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمایا تھا کہ واقف کار غیر مسلم ڈاکٹر سے ختنہ کرانا جائز ہے۔ یہی حکم بچہ اور بالغ دونوں کے لیے ہے۔

ختنہ کی اجرت

اگر بچہ کے پاس مال ہو تو ختنہ کی اجرت خود اس کے مال سے ادا کی جائے گی ورنہ اس کا باپ اجرت ادا کرے گا، ابن عابدینؒ لکھتے ہیں کہ اگر بچہ کے پاس مال نہ ہو تو اس کے ختنہ کی اجرت باپ پر لازم ہوگی۔ یہی تفصیل امام شافعی کے یہاں بھی ہے۔ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ بچہ کے ختنہ کی اجرت خود اس کے مال سے ادا کی جائے گی اور اگر اس کے

پاس مال نہ ہو تو جس پر بچے کا نفقہ واجب ہے اس پر اس کے ختنہ کی اجرت لازم ہوگی۔

مختون پیدا ہونے والے بچوں کا حکم

کچھ بچے مختون ہی پیدا ہوتے ہیں، ایسے بچے کے بارے میں بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اتباع سنت کے پیش نظر استحباباً اس مقام پر استرہ پھیر دیا جائے۔ مگر ابن قیم فرماتے ہیں کہ یہ ایک مہمل عمل ہے اس لیے اس کی ضرورت نہیں۔

بعض حضرات تجربہ اور مشاہدہ کی بناء پر فرماتے ہیں کہ مختون پیدا ہونے والے بچوں کا ختنہ عموماً ناقص ہوتا ہے اور عام طور پر پورا حشفہ کھلا ہوا نہیں ہوتا، اس لیے صرف استرہ پھیرنا کافی نہیں ہوگا بلکہ حشفہ کے ظاہر ہونے کی حد تک ختنہ کرنا ضروری ہوگا۔ ابو شامہ فرماتے ہیں کہ جو بچہ مختون پیدا ہوتا ہے اس کا ختنہ عام طور پر ناقص ہوتا ہے، حشفہ کا کچھ ہی حصہ ظاہر ہوتا ہے، اگر واقعۃً ایسا ہی ہو تو حشفہ کے ظاہر ہونے کی حد تک ختنہ کرانا ضروری ہوگا، ہاں البتہ اگر ختنہ مکمل ہوگا تو ختنہ کرانا یا صرف استرہ پھیرنا بھی غیر ضروری ہے۔

غیر مختون بالغ کا غسل

غیر مختون شخص پر اگر غسل جنابت واجب ہو جائے تو قلفہ (حشفہ کو ڈھانپنے والی کھال) کے اندر پانی پہنچانا غسل کرتے وقت ضروری ہے۔ ابو بکر بلخیؒ سے منقول ہے کہ جس طرح کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا، غسل جنابت میں ضروری ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ قلفہ کے اندر بھی پانی ڈالا جائے۔ اس کے بغیر غسل جنابت درست نہیں ہوگا ، لیکن عام فقہاء احناف کا کہنا ہے کہ قلفہ کے اندر پانی پہنچانے کی ضرورت نہیں ہے، اس کے بغیر بھی غسل جنابت ہو جائے گا۔ البتہ حشفہ کی اوپری کھال (قلفہ) اور اس کے سرا کو اہتمام سے دھونا لازم ہوگا۔

غیر مختون کا ذبیحہ

حضرت انسؓ کا قول ہے کہ غیر مختون کا ذبیحہ درست نہیں ہے ۔ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کی وضاحت کردی جائے ۔ امام محمد سے بھی یہی منقول ہے کہ غیر مختون کا ذبیحہ حلال نہیں ہے ۔لیکن ابن قدامہؒ نے لکھا ہے کہ اس کا ذبیحہ حلال ہے، کیوں کہ یہ شخص مسلمان ہے اور مسلمان کا ذبیحہ بالاتفاق صحیح ہے، لہٰذا اس کا ذبیحہ بھی جائز ہوگا۔ نیز شریعت میں زانی قاذف اور شرابی کا ذبیحہ ان سب کے فسق کے باوجود صحیح ہے تو غیر مختون شخص جو ایک سنت اور اسلامی شعار کا تارک ہے وہ زیادہ سے زیادہ شرعاً فاسق کہلانے کا مستحق ہے تو اس کا ذبیحہ کھانے میں کیا مضائقہ ہے ۔ اسی طرح اسلام میں اہل کتاب کا ذبیحہ کھانے کی اجازت ہے جب کہ وہ غیر مختون ہونے کے ساتھ کافر بھی ہے اور یہ شخص تو صرف غیر مختون ہے، ایمان کی دولت تو بہر حال اس کے پاس ہے، لہٰذا اس کا ذبیحہ کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کا ذبیحہ بالکل حلال اور درست ہے۔

غیر مختون شخص کا انتقال

غیر مختون شخص کا اگر انتقال ہوجائے تو احناف کے یہاں اس کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اس کا ختنہ نہیں کیا جائے گا، اسی حالت میں اس کی تجہیز وتکفین کردی جائے گی، البتہ فقہ حنبلی میں اس کے بارے میں دو روایتیں ملتی ہیں، ایک روایت میں ہے کہ اس کا ختنہ کیا جائے گا، اس کے بعد تجہیز وتکفین عمل میں آئے گی۔ اور دوسری روایت فقہ حنفی کے مطابق ہی ہے کہ اس کا ختنہ نہ کیا جائے، اس پر اکثر حنابلہ کا فتویٰ ہے۔ علامہ ابن قدامہ نے بھی اسی روایت کو ترجیح دی ہے۔

ختنہ کے طبی فوائد

شریعت اسلامی کا کوئی حکم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت انسانی فلاح و دنیا و آخرت کے کئی فوائد سے خالی نہیں ہوتے۔ ختنہ کے عمل میں بھی بے شمار فوائد ہیں، اس کی بعض مصالح پر ختنہ کی مشروعات کے وجوہ کے ذیل میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں حالیہ سائنسی تحقیقات کی روشنی میں ختنہ کے کچھ طبی فوائد کی طرف مختصراً اشارہ مفید ہوگا۔ ختنہ سے جنسی اعضاء کی صفائی اچھی طرح ہوتی ہے، اور اس سے اعضاء کی نظافت کا کام اچھی طرح سے ہو جاتا ہے۔ ختنہ کرنے سے بچوں کے اندر پیشاب کی نالی کی سوزش، پیشاب کی بندش، گردے کی پتھری، غیر ضروری شہوت اور خیالات کے انتشار، اگزیما، خارش اور الرجی جیسے امراض میں کمی واقع ہو جاتی ہے، ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ختنہ والی جگہ کے اندر ایک مادہ ہوتا ہے جو قضیب کا کینسر پیدا کر سکتا ہے، ختنہ سے اس کے خطرات کم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ماہرین کا کہنا ہے کہ ایڈز جیسے موذی مرض سے حفاظت اور کسی حد تک اس کی روک تھام میں ختنہ کرانا بہت مفید اور موثر ثابت ہو رہا ہے۔

(مطبوعہ روزنامہ سالار 02/05/2003 اور 25/04/2003، دو قسطوں میں)

مسجدیں جنت کے باغ ہیں

سب سے زیادہ محبوب جگہ مسجد ہے

بندگی کا فطری تقاضہ یہ ہے کہ انسان اللہ کی بندگی بارگاہ میں عاجزی وانکساری کے ساتھ اپنی محتاجی وفقیری کا اظہار کرتے ہوئے، اس کی خوشنودی اور قرب حاصل کرنے کی نیت سے اس کی محبت میں گرفتار ہوکر کھڑے ہوجائے اور اپنی بلند پیشانی اس کے حضور میں جھکا دے اور انتہائی عاجزی کے ساتھ اس کی بارگاہ میں اپنا سر رکھ دے اور اس کی یاد سے اپنے دماغ کو منور اور تازہ اور دل کو مسرور کردے۔ انہیں پاک جذبات کے ساتھ عبادت کا نام نماز ہے اور اسی نماز کو اجتماعی نظام کے ساتھ ادا کرنے کا نام جماعت ہے اور جن دو عظیم ووسیع مقاصد کے ساتھ یہ نماز اللہ کے جس گھر میں ادا کی جاتی ہے اس کا نام مسجد ہے اور یہ مسجدیں، جہاں سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں مسلمان جمع ہوکر ہر قسم کی تفریق سے بلند ہوکر نماز ادا کرتے ہیں، ان مسجدوں کا رشتہ اسی خانہ کعبہ سے ہے جو انوار وتجلیات ربانی کا مرکز ومنبع ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، شہروں میں، بستیوں میں، اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ان کی مسجدیں ہیں اور سب سے زیادہ مبغوض ان کے بازار اور منڈیاں ہیں۔ اس حدیث کا ماحصل یہی ہے کہ مسجدیں زندگی کے مقصد کو پورا کرتی ہیں، ان کے ذریعے بندہ اپنی زندگی کے تقاضے پورے کرتا ہے اور یہی مقصد حیات بھی ہے اور بازار ضروریات زندگی ہے، اور ضرورت کی ایک

حد ہوتی ہے، اس حد تک اس کا استعمال ہوگا، اگر اس قدر اس کو استعمال کیا جائے کہ مقصد فوت ہو جائے اور ایسی شکل سامنے آئے کہ ضرورت ہی مقصد بن جائے تو پھر انسان افراط وتفریط کا شکار ہوگا اور گمراہی میں پڑ جائے گا۔ اس حقیقت کو یوں سمجھا سکتا ہے کہ بیت الخلاء انسان کی ضرورت ہے، اگر انسان ضرورت کے بقدر بیت الخلاء میں رہے تو بالکل ٹھیک ہے، لیکن اگر انسان اسی میں رہنے لگے تو ظاہر ہے کہ یہ ایک معیوب بات ہے۔ بالکل اسی طرح بازار ہیں کہ وہاں جانے سے انسان اخلاقی اعتبار سے آلودہ ہو جاتا ہے اس لیے حدود کی پابندی کے ساتھ بازاروں سے تعلق رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔

اللہ کے خاص مہمان

جو بندہ جس وقت بھی صبح یا شام کو اپنے گھر سے نکل کر مسجد کی طرف جاتا ہے تو اللہ اس کے واسطے مہمانی کا سامان تیار کرتا ہے وہ جتنی دفعہ بھی صبح وشام کو جائے۔ جس بندے کی مہمان نوازی کا سامان خود اللہ رب العزت فرمائیں تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی شان کے اعتبار سے ہی مہمان نوازی فرمائیں گے اور جو اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں گے اس کا تو انسان بھی تصور نہیں کر سکتا۔ ہم بار بار مسجدوں میں جاتے ہیں، دن اور رات میں پانچ پانچ مرتبہ روزانہ مسجد کے اندر جاتے ہیں لیکن ہماری نیتیں محدود ہوتی ہیں، ہم صرف یہ سمجھتے ہیں کہ بس نماز پڑھنا ہے اور پھر لوٹ آنا ہے، یہ نیت بالکل سطحی اور محدود نیت ہے، ان احادیث کی روشنی میں ایک بندہ مومن کو چاہیے کہ جب وہ مسجد میں داخل ہو تو یہ تصور اس کے دل ودماغ میں ضرور ہو کہ وہ ایک حقیقی مالک وخالق اور پاک پروردگار کے دربار میں داخل ہو رہا ہے۔ میں اس کا مہمان بن کر جا رہا ہوں وہ میرا میزبان ہے۔ میں اس کو خوش کرنے جا رہا ہوں اور اس کی رحمتوں کو سمیٹنے اور برکتوں کو حاصل کرنے کے لیے اس کے گھر

جا رہا ہوں ۔اس کے مقدس دربار میں اس کی بڑائی بیان کروں گا، اس کی حمد وثناء کروں گا، اس کے سامنے باادب ٹہروں گا، اس کے سامنے جھکوں گا۔اپنے اس عمل سے اس کوخوش کروں گا اور وہ میری مرادوں کو پورا کرے گا ، وہ اپنے در سے خالی ہاتھ نہیں لوٹائے گا، وہ میرا ہے اور میں اس کا ہوں ۔ میں اس کو اور وہ مجھے دیکھ رہا ہے، اگر ان جذبات کے ساتھ ایک بندۂ مومن مسجد میں داخل ہوگا تو ظاہر ہے اس کے دل کو تازگی اور اس کے دماغ کو سکون ملے گا، یہ تو نقد فائدہ ہے اور پھر مرنے کے بعد جنت کی وہ نعمتیں جس کو نہ کسی نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، اور نہ کسی دل میں اس کا تصور پیدا ہوا، جو بطور مہمان نوازی کے دی جائیں گی۔

مسجد سے ہمارا تعلق

جس طرح بندے کا اپنے رب سے تعلق ہونا چاہیے، اسی طرح اس کا اس کے گھر یعنی مسجد سے بھی تعلق ہونا چاہیے۔ایک مومن اگرچہ صرف نماز ادا کرنے کے لیے مسجد میں آتا ہے پھر چلا جاتا ہے لیکن ایک سچے اور پکے مومن کے دل میں بار بار مسجد آنے جانے کی وجہ سے ایک ایسا تعلق مسجد سے ہوتا ہے کہ وہ کسی نماز کے بعد اپنے گھر جاتا ہے تو اہل وعیال میں گھل مل جاتا ہے لیکن اس کے بعد اس کے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں اللہ کے دربار میں جانے کا وقت تو نہیں ہوگیا۔کہیں کسی نماز میں غیر حاضری تو نہیں ہو جائے گی۔ جب وہ کسی نماز کے بعد بازار چلا جاتا ہے تو وہاں بار بار اس کے دل میں کھٹکا ہوتا رہتا ہے کہ کہیں اذان تو نہیں ہوگئی ۔اس طرح بار بار خیال آنا ایمان کی پختگی کی علامت ہے ۔ایسے لوگوں کے تعلق سے کہ جن کا دل مسجد میں اٹکا رہے اللہ کے رسول کا فرمان ہے کہ اس شخص کے لیے اللہ تعالیٰ اس دن جب کوئی اور دوسرا سایہ نہ ہوگا اپنا سایہ رحمت عطا کریں گے۔

اللہ کے نیک بندے مسجد کے باہر رہتے ہوئے بھی مسجد کے اندر رہتے تھے، آج ہم مسجد کے اندر رہتے ہوئے بھی مسجد کے باہر ہوتے ہیں۔ حضرت سالمؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت عبداللہ بن عمرؓ بازار سے گذرے تو نماز کا وقت آ گیا، لوگوں کو دیکھا کہ دکانیں بند کر کے نماز کی طرف جارہے ہیں تو فرمایا انہی لوگوں کے بارے میں یہ ارشاد ہے یہ ایسے لوگ ہیں جنہیں خرید وفروخت اللہ کی یاد سے غفلت میں نہیں ڈالتی۔

قیامت کے دن نور کامل کے حقدار

حضرت بریدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے جو بندے اندھیریوں میں مسجد کی طرف جاتے ہیں، ان کو بشارت سنادو کہ ان کے اس عمل کے بدلے میں قیامت کے دن ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور کامل عطا ہوگا، کس قدر خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو رات کی اندھیریوں میں مسجد کی طرف رخ کرتے ہیں اور ابدی روشنی کو پانے کے لیے وقتی اندھیریوں کو برداشت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر مومن کے دل میں نور کامل کا جذبہ پیدا فرمائے اور اس کا ہمیں حقدار بنائے۔

ایمان کی گواہی دو

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ مسجد سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی خدمت ونگہداشت کرتا ہے تو اس کے ایمان کی شہادت دو، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اللہ کی مسجدوں کو وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور یوم آخرت پر۔ مسجدوں کی فکر رکھنے والوں کے لیے اس سے بڑا ایوارڈ اور کیا ہوسکتا ہے کہ نبی آخرالزماں نے اپنی امت کے افراد کو حکم دیا کہ ایسے فکرمندوں کے بارے میں ایمان کی گواہی دو جو مسجد سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کی خدمت ونگہداشت کرتے ہیں۔

جس کے ایمان کی گواہی خود پیغمبر دیں، اس کی خوش نصیبی قابل رشک ہے۔

مسجدیں مضبوط قلعے ہیں

مسجدیں مذہب اسلام کا شعار بھی ہیں اور اسلامی تہذیب وتمدن اور اسلامی ثقافت کی نگہبان بھی ہوں، مساجد سے مسلمان اسلامی طور طریقوں سے آگاہ ہوتا ہے، یہیں سے تقویٰ اور پرہیز گاری کا درس ملتا ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ برخوردار۔ بہت بہتر ہے کہ مسجد تمہارا گھر ہو جائے کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ مسجدیں متقیوں کا گھر ہیں، مسجد جس کا گھر ہو جائے تو اللہ اس کے لیے رحمت کا اور پل صراط پر سے گذرنے کا ضامن ہوتا ہے۔

مسجدیں جنت کے باغ ہیں

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب جنت کے باغوں پر سے گذرو تو خوب میوے کھایا کرو۔ پوچھا گیا، یا رسول اللہ مسجد کے باغ سے میوے کھانے کا کیا مطلب ہے۔ فرمایا، **سُبْحَانَ اللّٰهِ ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ** کی تسبیح پڑھنا۔ اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ مسجدیں اس اعتبار سے جنت کے باغ ہیں کہ مسجدوں میں کی جانے والی عبادت جنت کے باغوں کے حصول کا سبب ہے۔ خوب میوے کھانے کا مطلب مسجدوں میں داخل ہو جانے کے بعد اللہ کی پاکی وحمد وثناء بیان کرو اس کے ہونے کا اعلان کرو۔ تمہارے اس عمل سے خوش ہو کر جنت کے باغ عطا فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو مسجدوں کا ادب واحترام کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور جنت کے باغوں کے حصول کا شوخ عطا فرمائے۔ خداوند قدوس کی خصوصی رحمتوں کو وصول کرنے والا بنائے۔

روزہ

بندے اور رب کے درمیان ایک راز ہے

صوم کے معنی لغت میں رک جانے کے ہیں اور اصطلاحِ شرع میں ایک عبادت کا نام ہے، جس میں ایک مسلمان مرد عورت صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور جماع سے رک جاتا ہے۔

علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب نیل الاوطار میں اس طرح صوم کا معنی لکھا ہے کہ روزہ کے معنی شریعت میں رک جانا اور شریعت میں مخصوص شرائط کے ساتھ ایک مخصوص وقت میں مخصوص طور پر رک جانے کے ہیں۔ رمضان، رمض سے مشتق ہے، جس کے معنی جل جانے کے ہیں، جس سال رمضان کے روزے فرض ہوئے اس سال سخت گرمی کا زمانہ تھا، اس لیے رمضان سے موسوم ہوا۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس ماہ میں روزہ دار کے گناہ جل جاتے ہیں۔ اس لیے اسے رمضان کہا جاتا ہے۔

روزہ دین اسلام کا ایک رکن اور اہم ترین فریضہ اور اللہ رب العزت کی محبوب ترین عبادت ہے۔ اس کی فرضیت ہجرت کے بعد سن دو ہجری میں ہوئی۔ روزے کا مقصد نفس کو خواہشات سے روکنا ہے تاکہ اس کے اندر سعادت کو حاصل کرنے اور دائمی پاکیزہ زندگی کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ بھوک اور پیاس اور نفس کی تیزی ختم ہو جائے اور مسکینوں کی فاقہ کشی کا اندازہ ہو سکے۔ خورد و نوش کی جگہیں تنگ ہوں، ساتھ ہی ساتھ جسم میں شیطان کے چلنے کی جگہیں بھی تنگ ہو جائیں۔ روزہ متقیوں کی زمام،

مجاہدوں کی ڈھال اور نیک ومقرب بندوں کا چمن ہے۔ انسانی اعمال میں یہ عمل اللہ رب العزت کے لیے مخصوص ہے، کیونکہ روزہ دار اپنی خواہشات کو ترک کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرتا۔ یعنی اپنی تمام محبوب ترین چیزوں کو اللہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ یہ بندہ اور رب کے درمیان ایک راز ہے۔

رمضان المبارک کے روزے کی فرضیت قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، جیسا کہ مجتہد امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ نے قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ لاکر ثابت کیا ہے کہ رمضان المبارک کا روزہ تمام امتِ مسلمہ پر فرض ہے، جو شخص رمضان کے روزے کی فرضیت کا انکار کرے، وہ بالاتفاق کافر ہے۔

ارشادِ ربانی ہے: ''اے ایمان والو، تم پر روزہ فرض کیا گیا جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، شاید کہ تم متقی وپرہیز گار بن جاؤ''۔

حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی پریشان حال اور پراگندہ بال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں حاضر ہوکر پوچھا کہ یارسول اللہ مجھے بتایئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کتنی نمازیں فرض کی ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا ''پانچ وقت کی نمازیں، یہ اور بات ہے کہ تم اپنی طرف سے نفل نماز پڑھ لو، اس نے عرض کیا یارسول اللہ، بتایئے کہ مجھ پر کتنے روزے فرض کئے گئے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ماہِ رمضان کے روزے، یہ اور بات ہے کہ تم اپنے طور پر نفل روزے رکھ لو۔ پھر پوچھا، یہ بتایئے کہ زکوٰۃ کس طرح اللہ نے فرض کی ہے۔ آپ نے اس کا حکم بھی بتادیا۔ اس دیہاتی نے کہا ''اس ذات کی قسم جس نے آپ کو عزت دی ہے، جو اللہ نے فرض کیا ہے میں نہ اس میں سے کچھ گھٹاؤں گا اور نہ کچھ بڑھاؤں گا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اگر اس نے سچ کہا تو کامیاب ہوگیا۔ یا

آپ نے فرمایا کہ اگراس نے سچ کہا تو جنت میں داخل ہوگیا۔(بخاری شریف)

درج بالا قرآنی آیت اور حدیث شریف سے بالکل واضح اور عیاں ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کے تمام افراد پر ماہِ رمضان کے روزے فرض کئے ہیں۔ساتھ ہی ساتھ پانچ وقت کی نمازیں اور مالدار وخوشحال لوگوں پر زکوٰۃ فرض کئے ہیں۔نماز روزہ زکوٰۃ کی کامل ادائیگی پر ہی جنت میں دخول اور فلاح وکامرانی دنیاوآخرت میں ممکن ہو سکے گی۔

مطبوعہ روزنامہ سالار بنگلور 02/12/2000

روزہ پچھلے گناہوں کا کفارہ

ایمان واحتساب کے ساتھ روزے کا مفہوم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس شخص نے رمضان میں روزہ ایمان واحتساب کے ساتھ رکھا اللہ اس کے پچھلے گناہوں کی مغفرت کردے گا، اور جس نے رمضان میں ایمان واحتساب کے ساتھ قیام کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے پچھلے گناہوں کو معاف کردے گا، اور جس نے شب قدر میں ایمان واحتساب کے ساتھ قیام کیا تو اللہ اس کے پچھلے گناہوں کی مغفرت کردے گا۔ (بخاری ومسلم)

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ایمان واحتساب کے ساتھ روزہ رکھنے اور قیام کرنے پر اللہ تعالیٰ ماضی کے گناہوں کو معاف کردیتا ہے۔ ایمان کے ساتھ روزہ رکھنے کا مفہوم یہ ہے کہ روزہ رکھنے کا خیال کرتے ہوئے روزہ رکھے اور احتساب کے ساتھ روزہ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ روزہ دار اجر وثواب کے ارادے سے روزہ رکھے۔

یہ بھی واضح ہے کہ گناہوں کی مغفرت سے مراد صغیرہ گناہوں کی مغفرت ہے، کیونکہ کبیرہ گناہ تو بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے۔ مثلاً جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، زنا کرنا۔ کسی کو ناحق قتل کرنا، کسی کا ناحق مال کھانا، شراب نوشی، جوابازی وغیرہ۔

روزہ گناہ کے لیے کفارہ ہے

اس سلسلے میں صحیح حدیثیں کتابوں میں موجود ہیں کہ روزہ گناہوں کے لیے کفارہ ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ مجتہد اعظم امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب بخاری شریف

میں باب ''روزہ گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے'' کے تحت حدیث نقل کی ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ فتنہ سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کس کو یاد ہے۔ حضرت حذیفہ نے جواب دیا کہ میں نے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا تھا انسان کے لیے اس کے بال بچے، اس کا مال اور اس کے پڑوسی فتنہ ہیں۔ جس کا کفارہ نماز روزہ اور صدقہ بن جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اس کے متعلق نہیں پوچھتا ہوں، میری مراد تو اس فتنے سے ہے جو سمندر کی موجوں کی طرح اٹھ آئے گا، اس پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ کے اور اس فتنے کے درمیان دروازہ ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ وہ دروازہ کھول دیا جائے گا یا توڑ دیا جائے گا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ توڑ دیا جائے گا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، پھر تو قیامت تک کبھی بند نہیں ہونے پائے گا۔ ہم نے مسروق سے کہا کہ آپ حضرت عمرؓ کو پوچھئے کہ کیا انہیں معلوم تھا کہ وہ دروازہ کون ہے۔ چنانچہ حضرت مسروق نے پوچھا تو حضرت حذیفہ نے جواب دیا ہاں، بالکل اسی طرح جس طرح رات کے بعد دن آنے کا علم ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حذیفہؓ سے جس فتنے کے بارے میں پوچھا تھا وہ فتنہ خلافتِ راشدہ کے زمانے ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ حضرت عمرؓ فتنے کے لیے بند دروازہ تھے، ان کے قتل کر دیے جانے سے فتنہ شروع ہو گیا اور اب قیامت تک یہ فتنہ ختم نہیں ہوگا۔

مسند امام احمد اور صحیح ابن حبان میں ماضی کے گناہوں سے متعلق حدیثیں نقل کی گئی ہیں۔ چنانچہ مسند امام احمد میں ابو سعید خدریؓ سے حدیث نقل کی گئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کے حدود کو ملحوظ رکھا اور

روزہ کا اس چیز سے تحفظ کیا جس سے تحفظ کرنا تھا تو اس کے پچھلے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ صحیح ابن حبان میں ابو سعید سے مرفوعاً اس طرح مروی ہے کہ جس نے رمضان کا روزہ رکھا اور اس کے حدود کو پہچانا تو وہ اس کے ماقبل کے گناہوں کے لیے کفارہ بن جائے گا۔

روزہ اور قرآن بندے کے لیے شافع

قیامت کے دن رمضان المبارک کے روزے اور قرآن مجید کی تلاوت، اللہ تعالیٰ کے دربار میں شفاعت کریں گے جیسا کہ مسلم شریف اور بیہقی کی روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روزہ اور قرآن بندے کی شفاعت کریں گے، روزہ کہے گا کہ اے رب میں نے اس کو دن بھر کھانے اور خواہشاتِ نفسانی سے روکے رکھا تھا، اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ قرآن کہے گا کہ اے رب میں نے اس کو رات کو سونے سے روکے رکھا تھا تو اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ چنانچہ دونوں کی سفارش قبول کی جائے گی۔

روزہ داروں کے لیے باب ریان

حضرت سہل بن سعد الساعدی سے مروی ہے، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جنت کا ایک دروازہ ہے جسے باب ریان کہا جاتا ہے، قیامت کے دن اس دروازے سے صرف روزہ دار ہی داخل ہوں گے، ان کے سواء اور کوئی اس دروازے سے داخل نہ ہو سکے گا، پکارا جائے گا کہ روزہ دار کہاں ہیں، وہ کھڑے ہو جائیں گے، ان کے سوا اس دروازے سے کوئی اندر نہ آسکے گا۔ جب یہ لوگ اندر داخل ہو جائیں گے تو پھر یہ دروازہ بند کر دیا جائے گا، پھر کوئی اس دروازے سے اندر نہ جا سکے گا۔ (بخاری)

دوسری حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو اللہ کے راستے میں دو چیزیں خرچ کرے گا اسے فرشتے جنت کے دروازوں سے بلائیں گے کہ اے اللہ کے بندے آ یہ دروازہ اچھا ہے، پھر جو شخص نمازی ہوگی اسے نمازیں کے دروازے سے بلایا جائے گا، جو روزہ دار ہوگا اسے باب الریان سے بلایا جائے گا، جو مجاہد ہوگا اسے جہاد کے دروازے سے بلایا جائے گا، جو زکوٰۃ ادا کرنے والا ہوگا اسے زکوٰۃ کے راستے سے بلایا جائے گا۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں اے اللہ کے رسول، کوئی ایسا بھی ہوگا جو ان سب دروازوں سے بلایا جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں، اور مجھے امید ہے کہ آپ بھی انہیں میں سے ہوں گے۔

مطبوعہ روزنامہ سالار 04/12/2000

روزہ چھوڑنے والے کے لیے وعید

روزہ چھوڑنے والے کے لیے وعید حدیث کی کتابوں میں بکثرت آئی ہیں، جس میں روزے کے تارک کا مقام بتایا گیا ہے۔ چند حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہوئے سنا، کہ میں سویا ہوا تھا کہ دو آدمی میرے پاس آئے، انہوں نے دونوں طرف سے میرے بازو کو تھام لیا اور ایک نہایت دشوار گذار پہاڑ کی طرف مجھے لے چلے، دونوں نے مجھ سے کہا کہ چڑھو، میں نے کہا، میں چڑھ نہیں سکتا۔ ان میں سے ایک نے کہا، ہم تمہاری مدد کریں گے، میں چڑھنے لگا، جب میں پہاڑ کے وسط میں پہنچا تو میں نے تیز تیز آوازیں سنیں، میں نے کہا یہ کیسی آوازیں ہیں، انہوں نے کہا یہ دوزخیوں کی کتوں جیسی بھونکنے کی آوازیں ہیں، پھر وہ مجھے آگے لے چلے، اچانک میرے سامنے کچھ لوگ اپنی ایڑیوں کے بل لٹکے ہوئے، ان کے جبڑے چرے ہوئے اور ان جبڑوں سے خون بہہ رہا تھا، میں نے ان سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں، انہوں نے کہا، یہ وہ لوگ ہیں جو افطار کی اجازت سے پہلے کھا پی لیا کرتے تھے (ابن خزیمہ، ابن حبان)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لائے تو آپ نے فرمایا آمین، آمین، آمین۔ کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ منبر پر تشریف لے گئے تو آپ نے آمین آمین آمین فرمایا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور انہوں نے کہا، جو کوئی

رمضان المبارک پا کر اپنے لیے مغفرت کا سامان نہ کرے اور شخص جہنم میں جائے گا اور اللہ تعالیٰ اسے دور دور رکھے گا، کہو آمین، میں نے کہا آمین ۔(ابن حبان، ابن خزیمہ)

مذکورہ دونوں حدیثوں سے قارئین کے لیے واضح ہو جائے گا شرعی عذر جیسے سفر ، بیماری، بڑھاپے اور عورتوں کو لاحق عوارض جیسے حیض، نفاس، حمل اور دودھ پلانے کے علاوہ کسی بھی عذر اور مجبوری کے بغیر روزہ ترک کرنا سخت گناہ کبیرہ ہے۔

مگر حیف صد حیف، آج کثیر تعداد میں مسلمان اس مبارک ماہ کے روزہ اور مقدس راتوں کو لہو ولعب، فسق و فجور، شر وفساد اور خواب وخور کی نذر کر دیتے ہیں، اور اس ماہ کی رحمتوں اور برکتوں کو تلاش کرنے سے غافل ولا پرواہ نظر آتے ہیں، حد تو یہ ہے کہ بڑے شہروں، کارخانوں، کمپنیوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہزاروں مسلم نوجوان خود روزہ نہیں رکھتے، اور روزہ داروں کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ رمضان کے دنوں میں مسلمانوں کے ہوٹلوں میں پردے لگا دیے جاتے ہیں، اور بہت سے نام نہاد مسلمان روزہ رکھنے کے بجائے باپردہ ہوٹلوں میں کھاتے پیتے ہیں اور قانون الٰہیہ کا گلا گھونٹتے ہیں اور راتوں میں صلوٰۃ تراویح کے بجائے شراب نوشی اور جوئے بازی، سینما بینی اور کیرم بورڈ جیسی چیزوں میں مشغول ومنہمک نظر آتے ہیں، اور شام کو جذباتی انداز سے مساجد میں جمع ہو کر سکون ووقار اور شب قدر کے احترام سے قطع نظر عبادت کے نام پر طوفان مچاتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں نہ اللہ کا خوف ہے، نہ موت کا خیال ہے ، نہ اسلام کے احکام کا پاس ولحاظ ہی ہے، نہ موت کے بعد زندہ اٹھنے اور زندگی کا حساب وکتاب دینے کی فکر ہے۔ کاش کہ مسلمان اپنے اندر اللہ کا خوف پیدا کرتے، موت کو

دھیان میں رکھتے، اسلام کا احکام کا پاس ولحاظ رکھتے اور کتاب وسنت کی روشنی میں زندگی گذارتے۔

ایک وہ دور تھا کہ جہاد کے موقع پر بھی افطار کی رخصت کے لیے باوجود لوگ ترک روزہ میں تردد کرتے تھے، انہیں فرائض وواجبات کی محبت اور طاعت نے ان کو عروج تک پہنچایا تھا اور دنیا میں مقام ملا، اور دنیا ہی میں جنت کی خوشخبری اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملی تھی۔ لیکن آج کے مسلمانوں نے اسلاف کے کارناموں کو فراموش کردیا اور کتاب وسنت کو بالائے طاق رکھ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے مسلمان اغیار کی نظروں میں ذلیل وخوار ہیں، ان کا کوئی مقام اس سرپرزمین پر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں کو صحیح سمجھ عطا فرمائے اور کتاب وسنت کا صحیح عامل بنائے۔ آمین۔

مطبوعہ: روزنامہ سالار 10/12/2001

افطار کے وقت ہزاروں دوزخیوں کی رہائی

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا، جب رمضان المبارک کے مہینے کی پہلی شب ہوتی ہے، تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، (اور پورے مہینے یہ دروازے کھلے رہتے ہیں) ان میں سے کوئی سادہ دروازہ بھی پورے ماہ بند نہیں ہوتا اور دوزخ کے دروازے بھی بند کر دیے جاتے ہیں اور اس دوران ایک دروازہ بھی نہیں کھلتا، اور سرکش جنات قید کر دیے جاتے ہیں، اور رمضان المبارک کی ہر رات ایک آواز لگانے والا تمام رات صبح تک آواز لگاتا رہتا ہے کہ اے بھلائی اور نیکی کے ڈھونڈنے والے نیکی کا ارادہ کر اور خوش ہو جا، اور اے برائی کا ارادہ کرنے والے برائی سے رک جا، اور اپنے حالات کا جائزہ لے اور یہ بھی آواز لگاتا ہے کہ کوئی گناہوں کی معافی چاہنے والا ہے کہ اس کے گناہ معاف کر دیے جائیں، کوئی توبہ کرنے والا ہے کہ اس کی توبہ قبول کر لی جائے، کوئی دعا مانگنے والا ہے کہ اس کی دعا قبول کر لی جائے۔ کوئی ہم سے کسی چیز کے متعلق سوال کرنے والا ہے کہ اس کا سوال پورا کر دیا جائے اور رمضان المبارک کے مہینے میں روزانہ رات کو (افطار کرتے وقت ساٹھ ہزار آدمی اللہ تعالیٰ جہنم سے بری فرماتے ہیں، پھر جب عیدالفطر کا دن ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اتنی ہی تعداد میں جہنم سے بری فرماتے ہیں جتنے ساٹھ ہزار یومیہ کے حساب سے مجموعی طور پر پورے مہینے میں آزاد فرماتے ہیں، جن کی مجموعی تعداد تقریباً اٹھارہ لاکھ ہوتی ہے۔ (بیہقی)

رمضان المبارک میں اللہ کے نیک اور صالح بندے جو طاعات وحسنات میں مشغول

ومنہمک ہوجاتے ہیں، وہ دنوں کو روزہ رکھ کر ذکر وتلاوت میں گذارتے ہیں اور راتوں کا بڑا حصہ تراویح وتہجد اور دعا واستغفار میں بسر کرتے ہیں اور ان کے انوار وبرکات سے متاثر ہو کر عام لوگوں کے قلوب بھی رمضان المبارک میں عبادت اور نیکیوں کی طرف راغب اور بہت سے گناہوں سے کنارہ کش ہوجاتے ہیں تو اسلام اور ایمان کے حلقے میں سعادت اور تقویٰ کے اس عام رجحان اور نیکی اور عبادت کی اس عام فضاء کے پیدا ہوجانے کی وجہ سے وہ تمام طبیعتیں جن میں کچھ بھی صلاحیت ہوتی ہے، اللہ کی مرضیات کی جانب مائل اور گناہوں اور نافرمانی سے متنفر ہوجاتی ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس ماہ مبارک میں تھوڑے عمل کی قیمت اور دنوں کی بہ نسبت بہت زیادہ بڑھادی ہے۔ اس لیے ان سب باتوں کے نتیجے میں ان لوگوں کے لیے جنتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں اور شیاطین ان کو گمراہ کرنے سے عاجز اور بے بس ہوجاتے ہیں، ہر طرف نیکی کی فضا قائم ہوتی ہے، اور پھر بندوں پر باری تعالیٰ کے عفو وکرم کی بارش ہوتی ہے اور یومیہ ساٹھ ہزار خطا کاروں کی مغفرت فرمادی جاتی ہے۔

بہر حال ان کی مغفرت وبخشش کا تعلق ان اہل ایمان سے ہے، جو رمضان المبارک میں خیر وسعادت حاصل کرنے کی طرف مائل ہوں۔ باقی رہے وہ کفار اور خدا فراموش، غفلت شعار لوگ جو رمضان اور اس کے احکام وبرکات سے کوئی سروکار ہی نہیں رکھتے اور نہ اس کے آنے پر ان کی زندگیوں میں کوئی تبدیلی آتی ہے، بلکہ الٹا اعتراض کردیا جاتا ہے کہ روزہ وہ رکھے جس کے گھر کھانے کو نہ ہو، یا روزہ عرب کی غربت اور افلاس کے پیش نظر رکھوایا جاتا تھا، آج اس کی ضرورت نہیں۔ تو ظاہر ہے کہ اس قسم کی بشارتوں کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے جب اپنے آپ کو خود ہی محروم کرلیا ہے اور بارہ مہینے شیطان کی پیروی پر مطمئن ہیں تو پھر اللہ کے یہاں بھی ان کے لیے محرومی وبدبختی کے سواء کچھ نہیں۔

مطبوعہ: روزنامہ سالار 29/11/2001

تراویح کے رکعت بیس ہیں

لفظ تراویح کی تحقیق:۔تراویح عرف عام میں اس نماز کو کہا جاتا ہے جو رمضان المبارک میں عشاء کے بعد جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی ہے ۔حافظ عبداللہ صاحب سلفیؒ نے تراویح کی یہ تعریف بیان فرمائی ہے: نماز تراوی وہ نماز ہے جو رمضان المبارک کی راتوں میں عشاء کے بعد با جماعت پڑھی جائے (ضمیمہ رکعات تراویح) حافظ ابن حجر عسقلانی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ رمضان کی راتوں میں نماز با جماعت کا نام تراویح ہے (فتح الباری شرح بخاری) مگر یہ لفظ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مستعمل نہیں تھا اس لیے آپ نے اس لفظ کو کسی حدیث میں وارد نہیں کیا بلکہ احادیث مبارکہ میں تراویح کی نماز کو قیام رمضان اور صلوٰۃ رمضان کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ اکثر محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں تراویح کے لیے"قیام رمضان، قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی رمضان ، صلوٰۃ رمضان "کے عنوان سے باب باندھے ہیں ۔تراویح کے لفظ کی ابتداء کیسے ہوئی، اس کو شارح بخاری علامہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس طرح واضح فرمایا ہے کہ"تراویح، ترویحہ کی جمع ہے اور ترویحہ کے معنی ایک دفعہ آرام کرنے کے ہیں، جیسے تسلیمہ کے معنی ایک دفعہ سلام پھیرنے کے ہیں، اور رمضان کی راتوں میں با جماعت نماز کو تراویح کہا جاتا ہے، اس بناء پر کہ ابتداءً جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اس امر پر اتفاق ہو گیا تو وہ ہر دو سلاموں کے بعد یعنی چار رکعتوں کے بعد کچھ آرام کرتے تھے۔(فتح الباری) مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور میں جب قیام

رمضان کی باجماعت ابتداء ہوئی تو صحابہ میں اس بات پر بھی اتفاق ہوا کہ ہر چار رکعت کے بعد تھوڑی دیر آرام کرلیا جائے، اس لیے کہ تراویح کی رکعتوں میں بہت طویل قیام ہوتا تھا، چنانچہ حضرت سائب بن یزید کہتے ہیں کہ وہ لوگ تراویح کی رکعتوں میں کئی سو آیتیں پڑھتے تھے اور حضرت عثمانؓ کی زمانۂ خلافت میں شدتِ قیام کی وجہ سے اپنی لاٹھیوں کا سہارا لیتے تھے ۔(بیہقی) بہر حال ترویحہ وہ نشست ہے جس میں کچھ راحت کرلی جائے اور چونکہ صحابہ کرام قیام رمضان کی چار رکعتوں پر سلام پھیرنے کے بعد تھوڑا بیٹھتے اور دعا پڑھتے تھے، اس طرح کچھ آرام مل جاتا تھا، اس لیے قیام رمضان کی چار رکعتوں کو ایک ترویحہ کہا جانے لگا۔ اور اس کا مجموعہ تراویح کہلایا۔

لفظ تراویح کی اس بحث سے ایک اہم نکتہ بھی واضح ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تراویح کا صیغہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تراویح کی رکعات آٹھ سے زائدہ ہیں، اس لیے کہ چار رکعت ایک ترویحہ ہے تو آٹھ رکعت ترویحتین ہوئے لہٰذا بارہ اور اس سے زائد رکعات ہی تراویح کہلائیں گے۔ چونکہ پوری تراویح میں پانچ ترویحے ہیں اس لیے ان کا مجموعہ تراویح کہلاتا ہے۔

رکعت تراویح کی تعداد:۔ تراویح کے بارے میں علماء محققین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول یا فعل سے تراویح کی رکعتوں کا کوئی عدد متعین نہیں ہوتا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس ہی رکعت تراویح پڑھی ہوں، نہ اس سے کم نہ اس سے زائد۔ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں کہ علماء نے تراویح کی رکعت میں اختلاف کیا ہے اور اگر یہ رکعتیں (تراویح کی متعین رکعتیں) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہوتیں تو یہ اختلاف نہ ہوتا۔ (مصباح المصابیح) اس لیے

امام ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ جس شخص کا یہ خیال ہو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام رمضان کی کوئی تعداد متعین کی ہے جس میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی تو وہ غلطی پر ہے۔ (مرقات، فتاویٰ ابن تیمیہ) تراویح کے بارے میں حقیقت یہی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں اور حضرت عمرؓ کے شروع کے دورِ خلافت میں رمضان المبارک میں تراویح کی رکعتوں کا کوئی شمار نہیں تھا۔ جس کی جتنی مرضی ہوتی تھی اتنی ہی رکعتیں پڑھ لیا کرتا تھا۔ اس لیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی تحدیدی حکم نہیں تھا کہ کتنی رکعتیں پڑھیں، حکم صرف یہ تھا کہ جتنا بھی ہو سکے زیادہ سے زیادہ قیام کرو۔ تو جس کو جتنی ہمت اور شوق ہوتا تھا، وہ اتنی رکعتیں پڑھ لیا کرتا تھا ۔تراویح کی جماعت پورے مہینے کی پابندی کے ساتھ نہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پڑھی گئی اور نہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں۔ اس پر عمل حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں شروع کیا اور آج تک پوری دنیا میں مسلمان پابندی کے ساتھ اس پر عمل کرر ہے ہیں۔

حضرت ابی بن کعب سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب نے انہیں حکم دیا کہ وہ رمضان میں رات کو لوگوں کو نماز پڑھایا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ لوگ دن میں روزہ تو رکھتے ہیں، لیکن اچھی طرح قرأت نہیں کر سکتے اگر تم رات کو ان پر قرآن پڑھا کرو تو اچھا ہو۔ حضرت ابی بن کعب نے عرض کیا امیر المومنین، پہلے ایسا نہیں ہوا۔ آپ نے فرمایا، مجھے بھی معلوم ہے، تاہم یہ ایک اچھی چیز ہے۔ چنانچہ ابی بن کعب نے لوگوں کو بیس رکعتیں پڑھائیں، (کنز العمال ج ۸، ص ۴۰۹)

یہ بیس رکعت بھی ابی بن کعبؓ نے حضرت عمرؓ ہی کے حکم سے پڑھائیں۔ حضرت یحییٰ

بن سعیدؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعت پڑھائیں۔(ابن ابی شیبہ، ج۲،ص۳۹۳)(دیکھئے حدیث اوراہل حدیث ص ٦۳۷، ٦۳۸)

حضرت عمر کا عمل حدیثِ مرفوع: یہ بات کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ حضرت عمر جیسے جلیل القدر صحابی اور خلیفۃ المسلمین جن کے بارے میں اللہ کے رسول نے یہ فرمایا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔(ترمذی) اور جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور آپؐ کی اتباع سے ادنیٰ روگردانی بھی برداشت نہیں کرتے تھے، اور جنہوں نے ایک مسلمان کی گردن اسی لیے اڑادی تھی کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو منظور نہیں کیا تھا اور آپؐ کے فیصلے کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس فریاد لے کر آ گیا تھا۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ تراویح کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نا صرف خود کوئی عمل کریں اور امت کو بھی اسی عمل پر ڈالیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس یقیناً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قولی یا فعلی ثبوت ضرور موجود تھا، جس کی بنیاد پر آپ نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ کو بیس رکعت تراویح پڑھانے کا حکم دیا۔ حضرت اسد بن عمرو حضرت قاضی ابو یوسف سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا، میں نے حضرت امام ابو حنیفہؒ سے تراویح اور اس سلسلہ میں جو حضرت عمر نے کیا ہے، اس کے متعلق سوال کیا تو آپؒ نے فرمایا، تراویح سنت موکدہ ہیں اور حضرت عمر نے بیس رکعت خود اپنی طرف سے مقرر و متعین نہیں کیے اور نہ وہ کسی بدعت کے ایجاد کرنے والے تھے، آپ نے جو بیس کا حکم دیا ہے، اس کی آپ کے پاس ضرور کوئی اصل تھی، اور ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم تھا۔(حدیث اور اہل حدیث، ص ۲۴۱، بحوالہ مراقی الفلاح)

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ ”پس جب حضرت عمر نے حضرت ابی بن کعب کو

امامت میں سب لوگوں کی ایک جماعت قائم کردی تو وہ بیس رکعتیں پڑھاتے تھے، پھر تین رکعات وتر پڑھاتے تھے‘‘ (مرقات) ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں، حضرت عمرؓ نے سب صحابہ کو حضرت ابی بن کعب کی امامت میں جمع کیا اور حضرت عمرؓ خلفائے راشدین میں سے ہیں، جن کی بابت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کرو، اور اسی کو ڈاڑھوں سے مضبوطی سے پکڑے رکھو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈاڑھوں کا ذرا اسی لیے کیا کہ ڈاڑھوں کی گرفت مضبوط ہوتی ہے، الغرض حضرت عمرؓ کا یہ اقدام عین سنت ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۲۲، ص ۲۳۴) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے عمرؓ کے دل اور زبان پر حق بات رکھی ہے۔ (ترمذی) حضرت عمر نے اپنے تفقہ فی الدین، فراستِ ایمانی اور علم وبصیرت سے امت مسلمہ کو بیس رکعت تراویح پر جمع فرمایا تو یہ یقیناً عین سنت کے مطابق ہے۔ علاوہ ازیں اصول حدیث کے مطابق حضراتِ محدثین کے یہاں حضرت عمر کا حکم حدیث مرفوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ صحابی کا وہ قول بھی حدیث مرفوع کے حکم میں ہے جسے اس نے اسرائیلیات سے نہ لیا ہو، نہ اس میں اجتہاد کی گنجائش ہو، نہ اس کا تعلق کسی لغت کے بیان سے ہو نہ کسی نامانوس لفظ کی شرح سے ہو، وہ حدیث مرفوع کے حکم میں ہے، اس لیے کہ صحابہ کرام کی اس قسم کی خبریں، کسی خبر دینے والے کو چاہتی ہیں، جب اس میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں تو کہنے والے کے لیے کوئی واقفیت اور اطلاع کی جگہ ہوگی جہاں سے اس نے یہ بات حاصل کی ہو۔ اور صحابہ کرام کی واقفیت کی جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی نہیں۔ (شرح نخبۃ الفکر)

ظاہر بات ہے کہ تراویح کی رکعت کا مسئلہ نہ کوئی عقلی چیز ہے اور نہ ہی یہ اجتہادی

مسئلہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے جو بیس رکعتوں کا حکم دیا اور حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ اور دیگر تمام صحابہ نے جو اسے تسلیم کیا وہ سوائے اس کے نہیں ہوسکتا کہ خود حضرت عمر اور دیگر صحابہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول یا فعل اسی طرح سنا اور دیکھا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل: یقیناً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تراویح کی رکعتوں کا کوئی متعین عدد ثابت نہیں ہے، مگر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تراویح میں اکثر بیس رکعت ہی کا تھا، بلکہ آپ نے صحابہ کو بیس رکعت تراویح جماعت کے ساتھ پڑھائی بھی ہے۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ رمضان المبارک میں ایک رات نبی علیہ السلام باہر تشریف لائے اور صحابہ کرام کو چوبیس رکعتیں چار عشاء کی اور بیس تراویح کی پڑھائیں اور تین رکعت وتر پڑھے۔ (تاریخ جرجان) ابن ابی شیبہ ایک جلیل القدر محدث ہیں، ان کی جلالتِ شان کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ امام بخاری و امام مسلم ان کے شاگرد تھے اور انہوں نے ان سے علم حاصل کیا ہے۔ یہ امام بخاری و امام مسلم کے استاذ اپنی کتاب مصنف ابن ابی شیبہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی مفسر قرآن حبر الامہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت نقل فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رمضان میں بیس رکعت تراویح پڑھا کرتے تھے اور وتر کی نماز بھی۔ اس حدیث کو ابن ابی شیبہ کے علاوہ، موطا امام محمد، عبد بن حمید، بغوی، طبرانی، بیہقی وغیرہ میں بھی نقل کیا گیا ہے۔ بیہقی کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے مہینے میں بغیر جماعت بیس رکعت نماز پڑھا کرتے تھے" یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ کے دور میں اکابر صحابہ کرام اور تابعین کا اسی پر تعامل رہا۔ اور بعد کے ادوار میں بھی ائمہ، علماء،

فقہاء، محدثین سب کا اسی پر عمل رہا۔

صحابہ اور اسلاف کا اجماع: حضرات صحابہ کرام، تابعین اور فقہاء امت اور اسلاف امت کا اس بات پر اتفاق اور اجماع ہے کہ رمضان میں بیس رکعت تراویح سنت ہے۔ چنانچہ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ جمہور اہل علم کا مسلک وہی ہے جو حضرت علیؓ عمرؓ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے منقول ہے کہ تراویح بیس رکعت ہیں، حضرت سفیان ثوری، ابن مبارک، اور امام شافعیؒ کا بھی یہی مسلک ہے اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے اہل مکہ کو بیس رکعت پڑھتے دیکھا ہے۔ (ترمذی) شارح مسلم امام نووی فرماتے ہیں کہ جان لو کہ نماز تراویح کے سنت ہونے پر تمام علماء کا اجماع ہے۔ اور یہ بیس رکعت ہیں جن میں ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرا جاتا ہے۔ (الاذکار) ابن قدامہ فرماتے ہیں اور امام احمد کے ہاں پسندیدہ عمل بیس رکعت کا ہے اور حضرت ثوری بھی یہی کہتے ہیں اور ان کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے صحابہ کو حضرت ابی بن کعب کی اقتداء میں جمع کیا تو وہ بیس رکعت پڑھتے تھے۔ نیز حضرت امام احمد کا استدلال حضرت یزید و علیؓ کی روایات سے ہے، ابن قدامہ کہتے ہیں کہ یہ بمنزلہ اجماع کے ہے، آگے یہ بھی فرمایا کہ جس چیز پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ عمل پیرا رہے ہوں وہی اتباع کے لائق ہے۔ (ملخص المغنی) (تفصیلات کے لیے دیکھئے نمازِ پیغمبر ازفضیلۃ الشیخ محمد الیاس فیصل، مدینہ منورہ، ص۲۳٦ تا ۲۵۰)

یقیناً حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی عمل تھا کہ وہ تراویح کی بیس رکعت اور وتر کی تین رکعت پڑھا کرتے تھے اور اسی پر آج بھی امت کا سوادِ اعظم عمل پیرا ہے حتی کہ حرمین الشریفین، کعبۃ اللہ اور مسجد نبوی میں آج بھی تراویح کی بیس رکعت ہی پڑھی جاتی ہیں اور یہی سنت ہے۔

اعتکاف کی فضیلت

اعتکاف کے لغوی معنی اپنے آپ کو روکے رکھنے، کسی چیز پر قائم رہنے اور اس سے وابستہ رہنے کے ہیں، شریعت کی اصطلاح میں اعتکاف اس چیز کا نام ہے کہ آدمی ایک خاص صورت سے مسجد میں ٹھہرا رہے۔ گویا مسجد میں قیام کرنے اور اپنے آپ کو وہاں روکے رکھنے کا نام اعتکاف ہے۔ اعتکاف دراصل عشق الٰہی اور جذبہ عبادت میں سب سے کٹ کر اللہ کے دربار میں اور اس کے در پر عجز و انکساری اور اظہار بندگی کے ساتھ آ کر پڑ جانا ہے۔ مولانا رفعت صاحب قاسمی تحریر فرماتے ہیں کہ روزے کے ذریعے انسان کی نفسیات کو اعتدال پر لا کر شریعت کے تقاضے پورا کرنے کے لائق بنایا گیا تھا، اب اس نے جب اس طریقے پر بیس دن گذار دیے اور گویا روحانی دوا کا ایک نصاب پورا ہو گیا، تو اب خدائے پاک نے یہ چاہا کہ میرا بندہ میرے سوا تمام مخلوقات سے غیر ضرورت میل جول ترک کر کے میرے ہی در پر آ پڑے اور میرے سوا اس کو کسی سے کسی قسم کا تعلق نہ رہے۔ (مسائل اعتکاف)

روزے میں محبوب بیوی کو صرف دن کی حد تک چھڑایا گیا تھا، جب بندہ اس آزمائش میں پورا اترا تو اب دن و رات اس سے الگ کر کے اس کی تمام تنہائیاں اپنے لیے مخصوص کر لیں اور فرما دیا کہ کھانا پینا، لیٹنا سونا، سب ہمارے ہی در پر کرو، اور ہماری جو یاد اب تک دنیا کے کام دھندوں میں لگ کر کرتے تھے، اب وہ سب سے الگ تھلگ ہمارے عبادت خانہ ہی میں ہوا کرے گی تا کہ دنیا کے گندے ماحول سے یکسو ہو کر دل و دماغ میں

ہماری محبت خوب رچ بس جائے اور تمہارے دل کی دنیا پر اب حکومت رہے تو صرف ایک اللہ واحد وقہار کی۔

اگر خالص اللہ کو راضی کرنے کی نیت سے اعتکاف کیا جائے تو بہت اونچی اور عظیم الشان عبادت ہے، اسی لیے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کا بہت اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری دس دنوں میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ پاک نے آپ کو وفات بخشی پھر آپ کے بعد بھی آپ کی ازدواج مطہرات اعتکاف کیا کرتی تھیں۔ (بخاری ومسلم)

ایک دوسری روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال رمضان میں دس روز اعتکاف کیا کرتے تھے، لیکن جس سال آپ کا وصال ہوا اور اس سال آپ نے رمضان میں بیس دن اعتکاف کیا (بخاری) امام زہری کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بہت سے کام بھی کرتے، اور کبھی چھوڑ دیتے تھے، لیکن جب سے مدینہ منورہ تشریف لائے اخیر عمر تک کبھی بھی (رمضان کے آخری دس دنوں کا) اعتکاف نہیں چھوڑا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ رمضان کے آخری دس دنوں کا اعتکاف فرماتے تھے، جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تو آپ کے لیے مسجد میں ایک جگہ مخصوص کردی جاتی اور وہاں آپ کے لیے کوئی پردہ چٹائی وغیرہ کا ڈال دیا جاتا یا کوئی چھوٹا سا خیمہ نصب کردیا جاتا اور یہ عموماً ستونِ توبہ کے آگے یا پیچھے کی جگہ ہوتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیسویں تاریخ ہی کو فجر کی نماز پڑھ کر وہاں چلے جاتے تھے اور عید کا چاند دیکھ کر وہاں سے باہر تشریف لاتے تھے، اس درمیان میں آپ برابر وہیں کھاتے پیتے اور وہیں استراحت فرماتے، آپ کی

ازواج میں سے جس کو آپ کی زیارت مقصود ہوتی وہیں چلی جاتی اور تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس آجاتیں، بغیر کسی شدید ضرورت کے آپ وہاں سے باہر تشریف نہ لے جاتے۔ایک مرتبہ آپ کو سر صاف کرانا مقصود تھا تو آپ نے سر مبارک کھڑکی سے باہر کر دیا۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تشریف لائیں اور انہوں نے آپ کے سر کو مل کر صاف کر دیا۔(بخاری و مسلم)

جس عمل کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی پابندی فرمائی، امت کے لیے روا نہیں کہ اس سے غفلت برتے ۔اعتکاف کرنے والے کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ معتکف تمام گناہوں سے محفوظ رہتا ہے اور وہ گناہوں سے روک دیا جاتا ہے اور اس کے لیے نیکیاں اس شخص کی طرح لکھی جاتی ہیں جیسے تمام نیکیاں کرنے والے کو لکھی جاتی ہیں،(ابن ماجہ)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ رمضان کے (آخری) دس دن کے اعتکاف کا ثواب دو حج اور دو عمروں کے برابر ہے۔(بیہقی) بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ معتکف کا سارا وقت سوتے جاگتے عبادت میں شمار ہوتا ہے اور اعتکاف کا ایک اہم مقصد شب قدر کی تلاش بھی ہے۔اسی طرح معتکف ہر حال میں شب قدر کی عظیم برکتوں اور رحمتوں سے مالا مال ہوگا۔

حافظ ابن قیم زاد المعاد میں فرماتے ہیں کہ اعتکاف کا مقصد اور اس کی روح دل کو اللہ پاک کی پاک ذات کے ساتھ وابستہ کر لینا ہے کہ سب طرف سے ہٹ کر اسی کے ساتھ مجتمع ہو جائے اور ساری مشغولیات کے بدلے میں اسی پاک ذات سے مشغول ہو جائے اور اس کے غیر کی طرف سے منقطع ہو کر اس طرح اس میں لگ جائے کہ خیالات و تفکرات سب کی جگہ اس کا پاک ذکر اور اس کی محبت سما جائے ۔یہاں تک کہ مخلوق کے ساتھ انس و محبت کے بدلے اللہ کے ساتھ محبت پیدا ہو جائے کہ یہ انس قبر کی وحشت میں اس دن کام دے،

جس دن وہاں اللہ پاک کی ذات کے سوا کوئی مونس نہ ہوگا، نہ دل بہلانے والا، اگر دل اس کے ساتھ مانوس ہو چکا ہوگا تو کس قدر لذت سے وقت گذرے گا۔

مطبوعہ: روزنامہ سالار 03/12/2001

مختصر اعمالِ حج

۸/ ذی الحجہ: (۱) بعد نماز فجر منیٰ کے لیے روانگی (۲) منیٰ میں قیام اور پانچ نمازوں کی ادائیگی، (ظہر عصر مغرب عشاء اور فجر۔

۹/ ذی الحجہ:۔ (۱) بعد نماز فجر عرفات کے لیے روانگی۔ (۲) ظہر عصر دونوں نمازوں کی ایک ساتھ ادائیگی (۳) غروب آفتاب کے بعد عرفہ سے مزدلفہ کے لیے روانگی۔

۹/ اور ۱۰/ ذی الحجہ کی درمیانی شب: (۱) مزدلفہ پہنچ کر مغرب اور عشاء دونوں نمازوں کی ایک ساتھ ادائیگی۔ (۲) مزدلفہ میں قیام اور ذکر واذکار میں مشغول رہنا (۳) رمی جمار کے لیے منیٰ یا مزدلفہ سے کنکریاں چننا۔ (۴) نماز فجر کے بعد منیٰ کے لیے روانگی۔

۱۰/ ذی الحجہ:۔ (۱) منیٰ پہنچ کر جمرہ عقبہ (بڑے شیطان) کو سات کنکریاں مارنا۔ (۲) متمتع اور قارن کے لیے قربانی کرنا (۲) قربانی کے بعد حلق یا قصر کرنا، حلق افضل ہے۔ (۴) طواف افاضہ (زیارت) کرنا (۳) سعی کرنا، اگر پہلے نہ کیا ہو۔

۱۱/ ذی الحجہ:۔ زوال کے بعد تینوں شیطانوں کو سات سات کنکریاں مارنا۔ ابتداء جمرۂ اولیٰ سے کرنا (۲) طواف افاضہ کرنا اگر دس ذی الحجہ کو نہ کیا ہو۔

۱۲/ ذی الحجہ:۔ (۱) زوال کے بعد تینوں شیطانوں کو سات سات کنکریاں مارنا۔ ابتداء جمرہ اولیٰ (چھوٹا شیطان) سے کرنا۔ (۲) طواف زیارت کرنا اگر ۱۰ ذی الحجہ کو نہ کیا ہو۔ (۳) غروب آفتاب سے پہلے مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہونا۔ اگر کسی وجہ سے تاخیر ہوگئی تو ۱۳/ ذی الحجہ کو منیٰ میں قیام کرنا ضروری ہے۔

۱۳/ذی الحجہ (۱) اگر منیٰ میں کسی وجہ سے ٹھہر گیا ہوتو زوال کے بعد تینوں شیطانوں کو سات کنکریاں مارنا اور پھر مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہونا۔

نوٹ:۔ وطن لوٹنے سے پہلے طواف وداع کرنا واجب ہے۔ اگر خواتین حیض ونفاس کی حالت میں ہوں تو ان پر طوافِ وداع واجب نہیں ہے۔

۸/ ذی الحجه :۔

(۱) نماز فجر پڑھ کر منیٰ کے لیے روانہ ہوجائے

(۲) منیٰ میں پانچ نمازیں، ظہر، عصر، مغرب عشاء اور نویں ذی الحجہ کی فجر پڑھے۔

۹/ ذی الحجه :۔

(۱) نماز فجر پڑھ کر عرفات کے لیے روانہ ہوجائے

(۲) ظہر کے وقت میں ظہر عصر ایک ساتھ دونوں نمازیں باجماعت پڑھ لے۔

(۳) عرفات میں سورج ڈوبنے تک ٹھہرے لیکن یہ اطمینان کرلے کہ وہ عرفات کی حدود کے اندر ہی ہے۔ اور نوافل ذکر وتلاوت میں مشغول رہے۔

(۴) سورج ڈوبنے کے بعد عرفات سے مزدلفہ کے لیے نکلے

(۵) اگر کوئی سورج ڈوبنے سے پہلے عرفات سے باہر نکل گیا تو اس پر ایک دم (ایک جانور کی قربانی واجب) ہے

(٦) آج عرفات میں سورج ڈوبنے کے بعد مغرب کی نماز نہ پڑھے، مزدلفہ پہنچ کر وہیں مغرب اور عشاء دونوں نمازیں ایک وقت میں ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ پڑھے۔ خواہ رش کی وجہ سے یا پیدل چلنے کی وجہ سے تاخیر ہی کیوں نہ ہوجائے۔ اگر کوئی حاجی مغرب کی نماز مزدلفہ کے علاوہ کہیں اور پڑھے گا تو اس کی یہ نماز نہ ہوگی اور

مغرب کی نماز مزدلفہ میں دوبارہ پڑھنی ہوگی۔ مزدلفہ پہنچ کر یہ اطمینان کرلے کہ وہ مزدلفہ کے اندر ہی ہے۔

(۷) فجر کی نماز مزدلفہ ہی میں پڑھے اور جب خوب روشنی پھیل جائے تو منیٰ کے لیے نکلے۔ صبح صادق سے پہلے کسی حال میں باہر نہ نکلے۔ اگر کوئی شخص بغیر عذر کے صبح صادق سے پہلے باہر نکل گیا تو اس پر ایک دم واجب ہے، البتہ صرف عورتوں یا بوڑھوں یا معذور افراد اور ان کے ہمراہیوں کو اس کی اجازت ہے کہ رش اور پریشانی سے بچنے کے لیے آدھی رات کے بعد منیٰ کے لیے روانہ ہو جائیں۔ منیٰ میں دو راتیں گذارنا سنت ہے۔

۱۰/ ذی الحجہ

(۱) منیٰ پہنچنے کے بعد سب سے پہلے جمرہ عقبہ کو (سب سے بڑا شیطان جو حرم شریف کی طرف ہے) سات کنکریاں مارے اور ہر بار اللہ اکبر کہے۔ دو باقی دو شیطانوں کو آج کنکریاں نہیں ماری جائیں گی۔ یہ کنکریاں مزدلفہ ہی سے چن لے یا پھر منیٰ سے لے لے، جو مٹر کے برابر یا اس سے بڑی ہوں لیکن اتنی بڑی نہ ہوں کہ کسی کے سر یا بدن میں لگ جائیں تو زخمی کردیں۔ جمرات کے پاس سے کنکریاں اٹھانا منع ہے۔ ۱۰/ذی الحجہ کو کنکری مارنے کا وقت سورج نکلنے کے بعد سے سورج ڈوبنے تک ہے۔ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے مغرب سے پہلے کنکریاں نہیں مار سکا تو صبح صادق سے پہلے پہلے ضرور مار لے۔ بیمار، یا بوڑھے اور کمزور افراد کنکریاں مارنے میں کسی دوسرے کو اپنا وکیل بنا سکتے ہیں، وکیل پہلے اپنی طرف سے کنکریاں مارے گا بعد میں دوسرے کی طرف سے۔

(۲) اگر تمتع یا قرآن کی نیت کی ہے تو پہلے قربانی کرے۔ قربانی کا گوشت خود بھی کھا سکتا ہے اور اپنے عزیزوں کو بھی کھلا سکتا ہے۔ (البتہ دَم والی قربانی کا گوشت خود

نہیں کھا سکتا، اس کا پورا گوشت غریبوں کو کھلا دے) آج کل جو کوپن کے ذریعہ سے قربانی ہوتی ہے اس میں بھی حصہ لے سکتا ہے لیکن اس بات کا خیال رکھے کہ قربانی کا جو وقت وہ لوگ بتائیں اس سے پہلے بال نہ کاٹے۔

(۳) سر کے بال منڈھوائے کا کٹوائے۔ منڈھانا افضل ہے، البتہ عورت نہ سر کے بال منڈھائے گی نہ کٹوائے گی، بلکہ اس کے لیے صرف ایک یا دو پور کے برابر بال کٹوانا کافی ہے۔ بال کٹوانے کے بعد اب چاہے تو احرام کھول دے اور اپنے کپڑے پہن لے۔ اب اس کے لیے احرام کی تمام پابندیاں ختم ہوگئیں، صرف بیوی کے پاس جانے کی پابندی باقی ہے۔ حاجی اپنے بال خود بھی کاٹ سکتا ہے۔

(۴) اگر موقع ہو تو آج ہی مکہ مکرمہ جا کر پہلے طوافِ زیارت کرلے، پھر سعی کرے، طواف اور سعی کے بعد بیوی کے پاس جانے کی پابندی بھی ختم ہو جائے گی۔ طواف اور سعی میں کسی خاص دعا کا پڑھنا ضروری نہیں۔ اپنی زبان میں جو چاہے دعا مانگے ، اور اگر عربی زبان میں دعائیں پڑھنا چاہتا ہے تو قرآن کی دعائیں یا حدیث سے ثابت شدہ دعائیں پڑھے۔

افضل یہ ہے کہ تینوں کام ترتیب وار کرے، یعنی پہلے کنکری مارے، پھر قربانی کرے، پھر سر کے بال کٹوائے، اور سب سے آخر میں طواف زیارت کرے، لیکن اگر کسی مجبوری یا دشواری کے وجہ سے یہ ترتیب باقی نہ رہے تو کوئی حرج نہیں۔

۱۱/ ذی الحجہ

(۱) اگر کوئی ۱۰/ذی الحجہ کو طواف زیارت نہیں کرسکا تھا تو آج مکہ مکرمہ جا کر طواف اور سعی کرلے

(۲) تینوں جمرات کو سات سات کنکریاں مارے۔ سب سے پہلے چھوٹے شیطان کو کنکریاں مارے جو مسجد خیف کی طرف ہے اور منیٰ سے مکہ آتے ہوئے پہلے نمبر پر آتا ہے پھر درمیانی شیطان کو مارے، پھر بڑے شیطان کو مارے۔ کنکریاں مارنے کا وقت ۱۱/اور ۱۲/ ذی الحجہ کو زوال کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اور سورج ڈوبنے تک رہتا ہے، غروب شمس سے صبح صادق تک کا وقت مکروہ ہے، البتہ معذور افراد یا عورتوں کو رش کی وجہ سے رات میں رمی کرنے کی اجازت ہے۔

نوٹ: موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے بعض علماء نے زوال سے پہلے بھی کنکریاں مارنے کی اجازت دی ہے۔

۱۲/ ذی الحجہ :

(۱) اگر ابھی طواف زیارت اور سعی نہیں کی ہے تو آج طواف اور سعی کر لے۔

(۲) زوال کے بعد تینوں جمرات کو سات سات کنکریاں مارے۔

جب اپنے وطن جانے کا ارادہ ہو تو طواف وداع کرنا واجب ہے۔ صرف حیض اور نفاس والی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔

مطبوعہ روزنامہ سالار 06/03/2001

حج عبادت ہے تجارت نہیں

حج کے موسم میں سنٹرل حج کمیٹی، حجاج کرام کے لیے ہوائی سفر اور حرمین شریفین میں رہائشی انتظامات کرتی ہے اور ریاستی سطح پر حجاج کرام کا کوٹہ بھی مقرر ہے اور قرعہ اندازی بھی ہوتی ہے۔ جن حجاج کرام کا نمبر قرعہ میں نہیں اٹھتا انہیں مایوسیوں سے بچانے کے لیے پرائیوٹ ٹور ایجنسیوں کا آغاز ہوا۔ اور یہ ایجنسیاں حج کمیٹی کے مقابلے میں حجاج کرام کے لیے اطمینان بخش انتظامات کرتی ہیں، گو کہ حج کمیٹی کے بالمقابل پرائیوٹ ٹور سے اخراجات کی شرح کچھ زیادہ ہوتی ہے تاہم حجاج کرام بخوشی برداشت کرتے ہیں۔

ایجنسیوں کے آرام دہ اور اطمینان بخش انتظامات کا جب ہندوستان میں عموماً اور بنگلور شہر میں خصوصاً چرچا ہونے لگا تو ایس ٹی ڈی بوتھوں کے مانند ہر محلہ اور ہر گاؤں میں پرائیوٹ ٹور ایجنسیوں کا ایک جال سا بچھ گیا۔ اور آج کل یہ ایجنسیاں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے اور دوسرے ٹورس کو نیچا دکھانے کے لیے اور حجاج کرام کا اپنی جانب راغب کرنے کے لیے شرح اخراجات میں کمی سے لے کر انعامی اسکیموں تک کا اعلان کرتی ہیں۔ ہر روز نئے نئے ہتھکنڈوں کو استعمال کرتی ہیں۔ چنانچہ آج کل ایک نیا ہتھکنڈہ یہ بھی استعمال ہونے لگا ہے کہ جس طرح بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں اپنے مال کی شہرت اور تجارت کو فروغ دینے کے لیے فلمی ستاروں اور مشہور کھلاڑیوں کا سہارا لیتی ہیں اور لمبے چوڑے اعلان کرتی ہیں اسی طرح یہ پرائیوٹ ٹور ایجنسیاں علماء کرام اور مفتیان عظام کا سہارا لے کر بلند بانگ دعووں کے ساتھ بڑے بڑے اعلانات کرتی ہیں گویا حج ایک عبادت نہیں، حجاج کی خدمت نہیں بلکہ محض ایک تجارت ہے۔

ماشاء اللہ کوئی پرائیوٹ ٹور ایجنسی کسی عالم کو بطور رہبر اپنے ساتھ رکھتی ہیں تو بہت اچھی بات ہے، جس سے لوگوں کو حج وعمرہ کے مسائل وفضائل معلوم ہوں گے۔ مقامات مقدسہ کی تاریخ معلوم ہوگی۔ مناسک حج وعمرہ بخوبی ادا ہوں گے، حجاج کرام کی صحیح رہبری ہوگی۔ حج وعمرہ ضائع اور باطل ہونے سے محفوظ رہنے گے۔ لیکن گذشتہ حج کے بعد حجاج کرام کی صحیح خدمت کرنے اور سہولتیں بہم پہنچانے میں انتہائی نا کام رہی ہیں، ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں خدمت کے جذبہ سے زیادہ اپنی تجارت میں نفع حاصل کرنے کا رجحان پرورش پانے لگا ہے۔

یہ لکھتے ہوئے بھی بڑی کوفت ہوتی ہے ہمیں اطلاعات ملی ہیں کہ بنگلور کی بعض ٹور ایجنسیاں حجاج کرام کو تکلیف اور پریشانیوں کی پرواہ کیے بغیر اپنی تجارت میں زیادہ نفع حاصل کرنے کے مقصد سے مشترکہ طور پر سستے اور غیر اطمینان بخش رہائشی مکانات حرم شریف سے کافی دور منیٰ کے قریب عزیزیہ میں قصر سلطان کے روبرو اتنے فاصلہ پر حاصل کیے کہ حجاج کرام کو ہر نماز کے لیے حرم شریف آنے جانے کے لیے بڑی دقت اٹھانے کے علاوہ بس یا ٹیکسی کے لیے کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ واضح رہے کہ وہاں (سفر حج) پر حاجی کے لیے ایک ایک ریال سو روپیہ کے برابر ہے۔

بعض ایجنٹوں نے تو ایسی عمارتیں کرایہ پر لیں کہ کمروں میں گندہ پانی گھس جاتا ہے، اکثر ایجنٹوں نے حجاج کرام پر یہ ظلم کیا کہ کمروں میں گنجائش سے زیادہ افراد کو بھر دیتے ہیں ۔ مدینہ منورہ میں ایک ایجنٹ نے مالک مکان کو حجاج کرام کی تعداد کم بتا کر دوگنے حجاج کرام وہاں بھردیے، کسی کی اطلاع پر حکومت کے کارندوں نے وہاں دھاوا بول دیا۔ اور حجاج کرام کو پریشانی اٹھانی پڑی۔ میں نے سنا کہ ایسا بھی ہوا کہ واپسی کے موقع ہے، حجاج کرام کا سامان پلیٹ فارم پر پڑا ہوا ہے، بس بھی آچکی ہے اور مالک مکان ایجنٹ کو روک رکھا ہے پہلے کرایہ کی پوری رقم ادا کرکے عمارت خالی کرے اور ادھر حجاج

کرام اس صورت حال سے پریشان کھڑے ہیں۔

یہ بھی شکایتیں سننے میں آئیں کہ مکانات میں حجاج کرام کی تعداد کے مطابق بیت الخلاء اور غسل خانے نہیں ہوتے، جس سے حجاج کو بڑی پریشانیاں ہوتی ہیں، یہاں تک لوگوں سے شکایتیں سننے میں آئیں کہ ایک مشہور ٹور ایجنٹ نے تو مزدلفہ میں قیام کا موقع دیے بغیر ڈرا دھمکا کر حاجیوں کو منی لے گیا۔ اور مجبور و بے بس حجاج ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔ ایسا بھی ہوا کہ منیٰ میں جلد واپس ہونے کے خیال سے بغیر کسی شرعی معقول عذر کے بعض حجاج کرام کی رمی بعض ایجنٹ حضرات خود اپنی طرف سے کرا دیتے ہیں اور حاجیوں کو مکہ مکرمہ واپس لے کر آجاتے ہیں، یہ بھی سنا کہ کسی ٹور ایجنٹ نے حجاج کرام سے ایک خطیر رقم حج کے بعد بغداد لے جانے کا کہہ کر وصول کر لی لیکن عین وقت پر حاجیوں سے چھپتا چھپاتا پھرتا ہے۔ یہ سن کر بھی بہت افسوس ہوا کہ بعض ایجنٹوں نے حجاج کرام سے قربانی کی رقم تو وصول کر لی لیکن قربانی نہ کی اور رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ ٹورس والوں سے ایک شکایت یہ بھی ہے کہ حاجیوں کو جمع کرنے اور زیادہ نفع کی حرص میں شرعی حدود پار کر دیتے ہیں اور اس مبارک سفر کو ایک عذاب بنا دیتے ہیں، محرم اور غیر محرم کا بالکل لحاظ نہیں رکھتے۔ خصوصاً رہائشی کمروں اور دالان میں اجنبی مردانہ میں گوشہ پردہ کا کوئی خیال نہیں کرتے۔ سالِ گذشتہ تو ایک ٹور والے نے ایک قادیانی کو اس مقدس سفر پر لے کر حرم شریف کو گندہ کر دیا۔ (نعوذ باللہ)

کھانے کا نظم بھی بالکل ٹھپ بھونڈے بڑے تلنے والے کو کم قیمت پر باورچی کی حیثیت سے لے جاتے ہیں، غرض اتنی ساری تکالیف اور کوتاہیوں کے باوجود اکثر حجاج بڑی فراخدلی سے فریضۂ حج کی اہمیت اور مقامات کے تقدس کے پیشِ نظر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔

حجاج کرام کی اس خاموشی اوراعلیٰ ظرفی سے یہ ایجنٹ حضرات ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اوراپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے بڑے بڑے علماء کرام کے ساتھ اشتہارات دیتے ہیں۔ ایجنٹوں کی ان من مانیوں اورکوتاہیوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ علماء کرام کوبھی خاطر میں نہیں لاتے۔صرف برائے نام اپنی تجارت کوفروغ دینے کے لیےان کا استعمال کرتے ہیں۔

بحیثیت رہبر قافلہ کے ساتھ تشریف لے جانے والے علماء کرام اور مفتیان عظام سے عاجزانہ گزارش ہے کہ وہ اپنے قافلے میں محرم ونامحرم کے درمیان پردہ کرانے پرسخت متنبہ کریں اوررہائشی مکانات ،کھانے پینے اورمتعلقہ انتظامات وسہولتوں پرخاص کر مناسک حج اورعمرہ کی ادائیگی کے مسائل اورحاجیوں پر کئے جانے والے ظلم اورکوتاہیوں پر سخت گرفت کریں تاکہ حجاج کرام اطمینان اورسکون کے ساتھ فریضہ حج ادا کریں۔ ورنہ آپ حضرات کا مقام صرف لیبل کی طرح ہوجائے گا۔

اخبارات میں یہ خبر پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ کرناٹک حج عمرہ ٹور آپریٹر ایسوسی ایشن کا قیام بھی عمل میں آیاہے جس کا صدر دفتر بنگلور میں ہے۔اور جناب اقبال صدیقی صاحب اس کے صدر ہیں ،موصوف آل انڈیا حج وعمرہ پرائیوٹ ٹور آپریٹر کے نائب صدر بھی ہیں ،موصوف پر بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ کرناٹک کے ہرٹور آپریٹر سے قافلہ کی تعداد ، رہائشی انتظامات اور متعلقہ سہولتوں کے بارے میں تمام تفصیلات اور جانکاری حاصل کرنے کے بعداجازت نامہ دیں اوران امور پر ہونے والی کوتاہیوں اور شکایتوں پرتوجہ دیں۔ ورنہ حجاج کرام کے قافلہ میں علماء کرام کی سرپرستی اورآپ کی صدارت بالکل بے معنی ہوکررہ جائے گی اوریہ حج نہ ہوگا بلکہ تجارت ہوجائے گا۔

مطبوعہ روزنامہ سالار بنگلور06/11/1998

حج کیمپ کو میلے کی شکل نہ دیں

حج بیت اللہ ارکانِ اسلام میں سے ایک بنیادی رکن اور عبادات اسلامی میں ایک اہم ترین عبادت ہے۔ حالانکہ حج صرف عاقل بالغ صاحب حیثیت مسلمان پر زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہوتا ہے، مگر ہر مسلمان چاہے وہ صاحب حیثیت ہو یا نہ ہو اس کے دل میں حج کرنے اور دربارِ الٰہی میں حاضری دینے کی خواہش مچلتی رہتی ہے۔ اگر سچ پوچھیے تو حج ہی ایک ایسی عبادت ہے جس میں آدمی واقعی اپنے خدا کی خوشنودی کے لیے جاتا ہے اور اپنے اہل وعیال اور اپنے کاروبار اور اپنے وطن کو چھوڑ کر خدا کی بارگاہ میں حاضر ہو کر لبیک اللھم لبیک (میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں،) کی صدا لگاتے رہتا ہے۔ جس خوش نصیب کو بھی حج فارم داخل کرنے کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے، تو اسی وقت سے اس کی زبان پر بے ساختہ تلبیہ جاری ہو جاتا ہے اور وہ خدا کے دربار میں حاضری دینے کے ایام کو انگلیوں پر شمار کرتا رہتا ہے۔

جیسے جیسے روانگی کی تاریخ قریب آتی ہے اس کی خوشی اور مسرت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جب وہ اپنا گھر اور اپنی بستی چھوڑ کر حج کیمپ کی طرف روانہ ہوتا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہاء نہیں رہتی۔ مگر پچھلے تین سالوں میں شہر بنگلور میں جو حج کیمپ لگا کرتے تھے ان کی حالت یہ تھی کہ عازم حج ایک عجیب کیف وسرور کی حالت میں حاضری بارگاہِ رب العزت کی خوشی اور مسرت دل میں لیے جب اس حج کیمپ میں داخل ہوتا تو ششدر رہ

جاتا کہ کیا دربارِ خداوندی میں حاضری کی پہلی منزل یہی ہے!؟۔میں حج کے تمہیدی مقام پر حاضر ہوا ہوں یا کسی میلے میں آگیا ہوں۔سارا کیف و مستی کا عالم کافور ہو جاتا۔

حج کیمپ کے اس افراتفری کے عالم کا سبب جہاں منتظمین حج کیمپ کی غفلت ہے، وہیں عازم حج اور ان کے وداع کرنے والے اور عام شہری مسلمان بھی بڑی حد تک اس کے ذمہ دار ہیں۔ منتظمین کی طرف سے حج کیمپ میں مرد و خواتین کے لیے علاحدہ مستقل انتظام نہیں ہوتا۔اس پر مزید یہ کہ عام مسلمانوں نے حج کیمپ کو تفریح گاہ بنالیا ہے ۔جس کی وجہ سے منتظمین کو بھی کئی دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے۔اس سال بھی الحمدللہ قدوس صاحب عیدگاہ ہی میں حج کیمپ منعقد ہو رہا ہے اور اس کے لیے پورے زور وشور کے ساتھ تیاریاں چل رہی ہیں، حج کیمپ کے لیے جگہ الاٹ کرنے سے پہلے عیدگاہ قدوس صاحب کے ٹرسٹیان کی جانب سے جن شرائط کا اعلان کیا گیا تھا اس سے اس بات کی قوی امید ہے کہ اس مرتبہ پچھلے حج کیمپوں کے بہ نسبت بہتر انتظامات ہوں گے، پھر بھی منتظمین حج کیمپ سے ہماری گزارش ہے کہ یہاں ایسا حج کیمپ ترتیب دیں کہ عازمین حج کو یہیں سے حج کیمپ کی جھلکیاں نظر آئیں اور یہیں سے ان کے دل میں خوفِ خدا غالب آجائے اور محبت الٰہی اس کے دل میں جوش مارنے لگے تاکہ حقیقی بارگاہ میں حاضر ہونے کے بعد عبادتوں میں لطف آئے۔حاجی اگر یہاں کے بے ڈھنگے مناظر کو دل میں بسا کر جائے گا تو یہیں کے خیال سے واپس آئے گا۔

عازمین حج سے گزارش ہے کہ وہ حج کیمپ پر اپنے سارے محلے والوں کو ساتھ نہ لائیں، بہتر ہے، سب سے گاؤں ہی میں مل کر آئیں اور دواعی بھی حاجی کو اپنے گھر اور وطن ہی میں مل کر وداع کردیں، اگر مناسب سمجھیں تو ایک یا دو آدمی ساتھ آئیں، اس میں

سب کا فائدہ ہے اور خواہ مخواہ لوگوں کا ازدحام، آنے جانے کا خرچ، ٹھہرنے کا خرچ اور کھانے وغیرہ کے اخراجات کا مسئلہ کئی پریشانیاں، کئی مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں، خود حاجی بھی سفر پر روانہ ہونے کے بعد پریشان رہتا ہے کہ سب لوگ بخیر و عافیت گاؤں پہنچ گئے یا نہیں؟ اس لیے عازمین حج اور ان کے رشتے داروں کو چاہیے کہ گھر ہی سے وداع کریں، اگر منتظمین حج کیمپ، حاجی حضرات اور ان کے رشتے داران چند باتوں پر عمل کرلیں تو انشاء اللہ ہمارے شہر کا حج کیمپ جو اب بھی پورے ملک میں مشہور و مقبول ہے، واقعتاً بہترین اور قابل تقلید نمونہ بن جائے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حج ٹورس والے اور دیگر حضرات کے نام

حج وزیارت ٹورس والے اور اس سفر کے دیگر انتظامات کرنے والے حضرات خوش نصیب ہیں کہ انہیں اس خدمت کا موقع ملا ہے۔ ہر سال اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو اپنے مہمانوں کی خدمت کا موقع نصیب فرماتا ہے۔آپ حضرات خلوص دل کے ساتھ ان حضرات کی خدمت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو جزائے خیر عطا فرما کر آپ حضرات کی تجارتوں کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔آپ حضرات اپنے ٹورس کو اللہ تعالیٰ کے نام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نامِ مبارک کے ساتھ منسوب کرتے ہیں جیسے السید بیت اللہ ٹور، الطیبہ ٹور، المدینہ ٹور، الحرم ٹور الکعبۃ ٹور، وغیرہ۔ نہ جانے اور کتنے ایسے ہی نام ہیں۔آپ حضرات حاجیوں کو ٹور کی طرف سے لگیج بیگ، زمزم کیان، احرام کا کپڑا، مصلی وغیرہ دیتے ہیں، نہ جانے اور کیا کیا آپ کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ ان چیزوں میں آپ کے ٹور کا نام ہوتا ہے، وہ نام اللہ یا مقدس مقامات کی طرف منسوب ہوتا ہے۔آپ حاجی کو لگیج بیگ دیتے ہیں، جب حاجی دورانِ سفر بیگ کو اپنے قدموں کے پاس رکھے گا تو لازماً اس کا پاؤں بیگ کو لگ سکتا ہے۔جس سے ایک طرف حاجی کو پریشانی ہوگی اور دوسری طرف نامِ مبارک کی بے حرمتی ہوگی۔

ایک حاجی صاحب نے کہا کہ مصلی فراہم کیا، ان میں نام جو پرنٹ تھا ٹھیک قدموں کے نیچے آرہا تھا۔اسی طرح ایک حاجی صاحب نے کہا کہ احرام کا کپڑا دیا گیا، اس میں ٹور والے کا نام پرنٹ ہو کر ہے، حالتِ احرام میں دیکھتے ہیں تو ٹھیک قدموں کے پاس

ہے۔اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے ٹور کی تشہیر کرنے کے لیے ہر جگہ نام پرنٹ کر کے اس کی بے حرمتی نہ کرائیں۔

اسی طرح آج کل دعوتوں میں پلاسٹک کا دستر خوان استعمال کیا جاتا ہے، جس میں حدیث کا ایک ٹکڑا ''النکاح'' پرنٹ ہوتا ہے۔دستر خوان کو استعمال کرنے کے بعد ایسی جگہ پھینک دیا جاتا ہے کہ اسے غیر قوم اپنے پاؤں تلے روندتے ہیں۔اور کتے وغیرہ اس پر پیشاب کرتے ہیں، اس سے حدیث پاک کی توہین ہوتی ہے۔بہتر ہے کہ ایسے دستر خوان کو استعمال نہ کریں۔اگر استعمال کرتے ہیں تو استعمال کے بعد اس کو کسی محفوظ جگہ رکھ دیں جہاں کسی کے قدم نہ پڑیں۔

نیز آج کل شہر میں ایک سگریٹ ''عزیز'' کے نام سے فروخت ہو رہا ہے۔لوگ اس کے استعمال کے بعد خالی ڈبے کو راستے میں پھینک دیتے ہیں۔''عزیز'' اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے، اس کی بڑی بے قدری کی جاتی ہے۔بہتر ہے کہ خالی ڈبے کو جلا دیں یا کسی اونچے مقام پر رکھ دیں جہاں کسی کا ہاتھ نہ جاتا ہو، یا وہ ڈبہ کسی کے قدموں تلے نہ آتا ہو۔

امید کہ ٹورس والے حضرات اور قارئین کرام ان گزارشات پر توجہ دیں گے اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ناموں کی توہین اور بے حرمتی سے حتی الامکان گریز کریں گے۔

(مطبوعہ روزنامہ سالار 27/04/2001)

حج ہاوز......اردو ہال

عازمین حج جو اس سال حج بیت اللہ وزیارت وروضۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تشریف لے جارہے ہیں، ان سے عاجزانہ ومخلصانہ گذارش ہے کہ آپ حضرات اللہ کے مہمان بن کر ایک ایسے سفر پر جارہے ہیں، جہاں قدم قدم پر رحمت خداوندی آپ کا استقبال کرے گی اور ایسی سینکڑوں منزلیں آئیں گی جہاں آپ کی دعائیں بارگاہِ رب العزت میں شرف قبولیت کا درجہ پائیں گی، اس پر حاجی قدم قدم پر دعاؤں کا اہتمام تو کرتا ہی ہے، مگر ہماری گذارش ہے کہ آپ جب ان مقدس مقامات پر اپنے لیے اور اپنے رشتے داروں کے لیے دعا کریں گے تو ساتھ ساتھ یہ بھی دعا کریں کہ شہر گلستان جو کہ کرناٹک کی راجدھانی ہے، اس میں ایک خوبصورت حج ہاوز عافیت کے ساتھ تعمیر ہو جائے، جو بغیر کسی تنازعہ کے اور آپس میں اختلاف کے ہو۔ حج کے ایام کے علاوہ اس حج ہاوز کو امت کی فلاح و بہبودی کے لیے صحیح طور پر استعمال کیا جائے۔ تاجر حضرات یا دوسرے شہر سے آئے ہوئے مہمانوں کو کرایے پر دے کر اس کی آمدنی کو صحیح مصرف میں خرچ کیا جائے۔

دوسری ضروری گزارش یہ ہے کہ شہر گلستان آج اتنا ترقی کر رہا ہے الحمد للہ۔ یہاں پر غیر ملکی وزراء، سیاح، ادیب حضرات اور نہ جانے کون کون حضرات یہاں مختلف ثقافتی پروگرام اور مشاعرے بھی منعقد کر رہے ہیں، حال ہی میں کرناٹک اردو اکاڈمی نے ٹاون ہال میں یوم جمہوریہ کے موقع پر غزل اور موسیقی کا پروگرام پیش کیا تھا۔ افسوس کا مقام

ہے کہ ایسے پروگراموں کے لیے ہمارے پاس کوئی ''اردو ہال'' نہیں ہے۔ علاوہ ازیں کرناٹک اردو اکاڈمی حکومت کرناٹک کے شعبہ کنڑا اینڈ کلچر کے تحت آتی ہے، اس لیے یہاں یہ بات بے حد ضروری ہے کہ یہاں ایک علاحدہ اردو ڈائرکٹوریٹ قائم ہو جائے اور اردو کے لیے ایک اردو ہال بھی تعمیر کیا جائے، اگر یہاں ایک اردو ہال تعمیر ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ سونے پر سہاگہ ہو جائے گا۔ ہم ہمدردانِ اردو چاہے تو کیا کچھ نہیں کر سکتے؟؟

دوسری قوموں کے افراد نے اپنی اپنی مادری زبان کے لیے ایک کنڑا بھون (قلبِ شہر، جے سی روڈ میں) تعمیر کروالیا۔ اگر مایوس ہوئے ہیں تو صرف ہماری زبان اردو والے۔ آج تک صرف جگہ کی تلاش میں اپنا وقت ضائع کرتے پھر رہے ہیں، میری رائے میں اردو ہال کے لیے دارالسلام کوئنس روڈ کے عقبی جانب جو جگہ کئی سالوں سے خالی پڑی ہے، وہاں تعمیر ہو تو بہتر ہوگا۔ موجودہ کانگریس حکومت میں پانچ مسلم وزراء کا کابینہ میں ہونا ایک تاریخ سے کم نہیں ہے۔ ایک سے ایک باصلاحیت بھی ہیں اور مسلم ایم ایل اے حضرات کی توجہ اردو ہال کی طرف ہو جائے، تو یہ بھی ایک تاریخ بن جائے گی۔

امید کہ مسلم وزراء اس طرف توجہ دیں گے اور عازمین حج سے دوبارہ پر زور اپیل کرتا ہوں کہ وہ حضرات اپنے مخصوص دعاؤں میں شہر میں ایک خوبصورت اردو ہال کے لیے ضرور دعا کریں۔ نیز اپنی دعاؤں میں سارے عالم میں امن وسلامتی اور مسلمانوں کی حفاظت کے لیے بھی دعا کریں اور سارے مسلمانوں کی طرف سے روضہ اقدس پر سلام سنائیں۔ اللہ تعالیٰ تمام عازمین حج کو حجِ مبرور ومقبول عطا فرمائے، اور ان کی دعاؤں میں ہم سب کا حصہ نصیب فرمائے۔

(مطبوعہ روزنامہ سالار 08/02/2001)

دینی مدارس میں اردو

میؔر وغالبؔ کی جان ہے اردو
ہم سبھوں کی زبان ہے اردو

اردو ہے جس کا نام ہمی جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

جیسا کہ سب جانتے ہیں لفظ اردو دراصل ترکی زبان کا لفظ ہے، یہ لفظ مذکر ہے اور ترکی زبان میں لشکر یا لشکر گاہ یعنی چھاؤنی کے لیے بولا جاتا تھا،لیکن آگے چل کر اس لفظ نے عورتوں کا جامہ زیب تن کیا اور مونث بن گیا۔ اب یہ لفظ عموماً مونث ہی استعمال ہوتا ہے اور برصغیر میں سب سے زیادہ بولی جانے والے زبان کے لیے مستعمل ہے۔

کہتے ہیں کہ زبانیں عموماً قوموں ،فرقوں اور تہذیبوں کی تصاویر ہوا کرتی ہیں ، ہر زبان کسی ایک خاص فرقے ، مذہب یا تہذیب کی علامت اور نشان ہوتی ہے۔لیکن تمام زبانیوں کے درمیان میں سمجھتا ہوں کہ شاید اردو زبان ہی ایسی زبان ہے، جیسے ہندو مسلم سکھ عیسائی سبھوں نے اپنایا ہے۔تبھی تو کہا جاتا ہے کہ اردو کا الف اللہ کا پتہ دیتا ہے، ر، رام کی خبر دیتا ہے، د، دی گارڈ سے عبارت ہے اور و، واہے گروہ کی نشاندھی کرتا ہے۔اس طرح یہ زبان بیک وقت مسلمانوں کی بھی زبان ہے اور ہندوں کی بھی بولی ہے، عیسائیوں نے بھی

اسے اپنایا ہے اور سکھوں نے بھی ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر کے طول وعرض میں عوامی سطح پر سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان، سب سے زیادہ سمجھی جانے والی زبان اور سب سے زیادہ استعمال کی جانے والی زبان یہی ہماری زبان اردو ہے۔

اردو زبان کو ایک شرف یہ بھی حاصل ہے کہ یہ زبان میری معلومات کی حد تک تہذیب یافتہ دنیا کی سب سے آخری زبان ہے۔ آخرِ الالسنہ ہونے کا شرف بھی اسے حاصل ہے۔ اس لیے کہ اردو زبان کی پیدائش کو ابھی چند صدیاں ہی گزری ہیں، واقعہ یہ ہے کہ جب ترک فوجیں ہندوستان پر حملہ آور ہوئیں اور ہندوستان کے بعض حصوں پر غالبانہ فتح پاکر قابض ہوگئیں تو ترکی حکمرانوں کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ اپنی فوج کا ایک حصہ مستقل طور پر ہندوستان میں چھوڑے رکھیں تاکہ ہندوستان کے مقبوضہ علاقے ہمیشہ ترکیوں کے باج گزار رہیں اور ہاتھ سے نکلنے نہ پائیں۔ اس طرح ترکستان کے فوجیوں کی ایک جمعیت مستقل طور پر ہندوستان میں رہنے لگی، اس دور میں ہندوستان کی اکثریت کی زبان سنسکرت تھی اور ادھر ترکی فوجیوں کی زبان ترکی، بعضے فارسی سے واقفیت رکھتے تھے اور بعضے عربی کی بھی شد بد رکھتے تھے۔ جب یہاں کی عوام کا ترکی فوجوں سے معاشرتی لین دین وغیرہ میں اختلاط ہونے لگا تو سنسکرت، ترکی، فارسی اور عربی اور دوسری علاقائی زبانوں (مثلاً دکنی وغیرہ) کے حسن امتزاج اور حسین ملاپ نے خود بخود ایک منزہ، آسان اور شستہ زبان کو پیدا کردیا، جس میں سنسکرت کی بھی رعایت تھی، ترکی و فارسی کے بھی بیشتر الفاظ موجود تھے، اور عربی کا ذائقہ بھی کم نہ تھا، اسی ملی جلی زبان کو آج ہم اردو کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

امیر خسرو جو سلطان الہند حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے خاص مریدوں

میں سے تھے اور حکومتی سطح پر بھی نہایت بلند پایہ امیر تھے، انہیں شعروشاعری سے بھی خاصہ لگاؤ تھا اور بادشاہ کے دربار میں خصوصی شعراء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ امیر خسرو کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ایک دفعہ بادشاہ کے دربار میں چند اشعار پیش کیے تو بادشاہ نے انہیں اشرفیوں کی ایک بڑی تھیلی انعام میں دیدی۔ اسی وقت جب امیر خسروانعامِ خسروانہ لے کر لوٹ رہے تھے اُدھر ایک فقیر حضرت نظام الدین اولیاء کے دربار میں حاضر ہوا اور کچھ مالی مدد کی درخواست کی۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے پاس کیا تھا سوائے نامِ خدا کے۔ انہوں نے اپنی جوتیاں ہی اس فقیر کے حوالے کر دیں کہ اسی کو بیچ کر کچھ گزارا کر لے۔ فقیر ان بوسیدہ جوتیوں کو لے کر چلا، راستے میں امیر خسرو کی سواری گذر رہی تھی۔ فقیر نے صدادی اور کہا کہ امیر محترم! میرے پاس آپ کے مرشد ومربی حضرت نظام الدین اولیاء کی جوتیاں ہیں۔ مجھے ان جوتیوں سے کیا فائدہ ہوگا، آپ انہیں لے کر کچھ درہم عنایت فرمائیں۔

امیر خسرو نے اپنے آقا ومرشد کا نام سنا تو فوراً سواری روک دی اور سواری سے اتر کر خود فقیر کے پاس پہنچے اور پوچھا کہ کیا یہ جوتیاں واقعی حضرت قبلہ کی ہیں۔ فقیر نے عرض کیا: بے شک جناب والا۔ امیر خسرو نے جوتیوں کو دونوں ہاتھوں سے لیا اور چوما اور سر پر رکھ کر فرمایا: کیا تم اس پر راضی ہو کہ یہ جوتیاں میرے حوالے کر دو اور اشرفیوں سے بھری یہ تھیلی جو مجھے ابھی بادشاہ کے دربار سے ملی ہے اسے قبول کر لو۔ فقیر بہت متعجب ہوا کہ دو چار آنے کی جوتیوں کو اشرفیوں کی تھیلی سے کیا نسبت۔ غرض اس نے بخوشی جوتیاں دے کر اشرفیوں سے بھری تھیلی حاصل کر لی۔

غالب تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

جوتیاں لے کر امیر خسرو، حضرت نظام الدین اولیاء کے دربار میں پہنچے تو حضرت نے بلا استفسار دیکھتے ہی ارشاد فرمایا ''خسرو! تم نے جوتیاں بڑی سستی خرید لیں''

غرض ذکر اس بات کا چل رہا تھا کہ امیر خسرو ایک بلند پایہ شاعر تھے، امیر خسرو پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو زبان میں شاعری کی۔ آپ کے اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو اس وقت اپنے ارتقائی دور میں تھی۔ آپ کے اشعار اردو فارسی کا ملا جلا مرقع ہیں، کہیں شعر کا ایک مصرعہ اردو میں ہے تو دوسرا فارسی میں۔

غرض کہنے کا مطلب یہ ہے کہ امیر خسرو کے دور ہی سے اردو زبان میں شعر و شاعری کا آغاز ہوا۔ اور جیسا کہ ہم نے مضمون کے ابتداء میں ذکر کیا تھا کہ اردو کسی ایک فرقے یا مذہب کی زبان نہیں بلکہ برصغیر کے تمام مذاہب نے اسے اپنایا ہے، یہی وجہ ہے کہ اردو کے بڑے بڑے افسانہ نگار، شاعر، ڈرامہ نگار، ادیب اور ناول نگار غیر مسلم ہیں مثال کے طور پر افسانہ نگاروں میں منشی پریم چند کا نام لیا جا سکتا ہے، اپنے افسانوں میں دیہاتی اور غربت زدہ زندگی کو پیش کرنے میں منشی پریم چند کا مقام بہت بلند ہے۔ اس صنف میں وہ خصوصی امتیاز رکھتے ہیں۔ شعراء میں فراق گھورکھپوری، جوش ملیح آبادی، مجروح سلطان پوری، وغیرہ قابل ذکر ہیں، اسی طرح ادیبوں میں ملک کے مایہ ناز وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کا نام بھی آتا ہے۔

اب اسے وقت کی ستم ظریفی کہیے یا کچھ اور کہ اردو زبان پہلے تو سرکاری دفاتر سے نکالی گئی، پھر متعصّبانہ طور پر اسے مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اس کے ساتھ سوتیلا سلوک کیا جانے لگا۔ بیشتر نغمے اور غزلیں جو اردو زبان کی چاشنی اور مٹھاس سے مشہور و مقبول ہوئیں انہیں ''ہندی گانے'' کہا جانے لگا، اور حد تو یہ ہے کہ ہند و پاک میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان اردو کو سرکاری مشنری ''دوسری زبان'' کا درجہ دینے پر بھی راضی نہیں۔

دورِ حاضر میں اردو زبان کے محافظ اور اردو سے محبت کرنے والے ادارے اگر کوئی ہیں تو وہ حکومتی امداد پر چلنے والے سرکاری اردو اسکول وکالج نہیں بلکہ مدارس عربیہ دینیہ ہیں۔ یہی وہ مدارس ہیں جنہوں نے اردو کو اپنایا ہے۔ میرے علم کی حد تک کرناٹک کے بیشتر مدارس جن میں سب سے پہلے میں نام لوں گا اپنی مادرِ علمی 'دارالعلوم سبیل الرشاد' کا (یہی مدرسہ ریاست کرناٹک میں دیگر مدرسوں کے لیے ماں کا درجہ رکھتا ہے، لہٰذا اسے ام المدارس کہنا مبالغہ نہیں، واقعہ کی صحیح تصویر ہے) اسی طرح دیگر مدارس مثلاً مدرسہ عربیہ دارالعلوم شاہ ولی اللہ بنگلور، جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور، جامعہ غیث الہدیٰ بنگلور، جامعہ الکلیۃ السعودیہ بنگلور، دارالعلوم مبارکہ بنگلور، جامعہ محمدیہ منصورہ بنگلور، جامعہ تعلیم القرآن بسم اللہ نگر بنگلور، اشرف العلوم میسور، مدرسہ صدیقیہ میسور، دارالبلاغ میسور، جامعہ مظہر العلوم شیموگہ، غرض کرناٹک کے سبھی بڑے مدارس میں تعلیم وتعلم کی زبان اردو ہے۔ بیشتر مدارس نے دارالعلوم سبیل الرشاد کی اقتداء کرتے ہوئے داخلہ کی شرائط میں اردو سے واقفیت کو شرطِ اول گردانا ہے۔ خود مادر علمی دارالعلوم سبیل الرشاد کے داخلہ فارم میں یہ لکھنا بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ داخلہ کا امیدوار طالب علم اردو سے کتنی واقفیت رکھتا ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر دارالعلوم سبیل الرشاد اپنے نجی معاملات کی حد تک اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ دارالعلوم کی سرکاری زبان اردو ہے۔ ہر طالب علم کا اردو سے واقف ہونا ضروری ہے۔ استاذ کا تدریس کے لیے اردو زبان اختیار کرنا لازمی ہے۔

غرض یہی مدارس اسلامیہ ودینیہ ہیں جو فی الحال اردو کے لیے محافظ اور قلعے کا کام انجام دے رہے ہیں۔ عصر حاضر کے ممتاز شعراء، اور نظم نگار ونثر نگار انہی مدارس کے فیض یافتہ ہیں۔ مثال کے طور پر ملک کے مایہ ناز ادیب وشاعر ڈاکٹر راہی فدائی باقوی، مایہ ناز نثر نگار حضرت امیر شریعت کرناٹک (مفتی محمد اشرف علی باقوی صاحب) دامت برکاتہم، نعت خواں

ونعت نگار حضرت انجم سعودی، مظہر سعودی اور انہر سعودی وغیرہ حضرات انہی مدارس عربیہ کے فیض یافتگان ہیں۔ بلکہ چلتے چلتے یہ بھی ذکر کردوں تو مضائقہ نہ ہوگا کہ ملک کے مایہ ناز صدر ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے بھی ایک مرتبہ کہا تھا کہ انہوں نے بھی مدرسہ میں تعلیم پائی ہے۔

قحط الرجال کے اس دور میں اگر مدارس عربیہ بھی اردو کے تعلق سے کچھ تزلزل کا شکار ہوں اور ادباء شعراء اور نظم ونثر نگاروں کا ایک جم غفیر وہاں دکھائی نہ دیتا ہو تب بھی ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہاں کچھ شکایت ہے تو وہ 'کمیابی' کی ہے، نایابی کی نہیں۔

تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ مدارس عربیہ دینیہ اپنے دامن میں جھانکیں، اپنی کوتاہیوں کا احساس کریں اور اردو کے تعلق سے اردو کے کاز کے لیے متفق ومتحد ہو کر عملی بیداری پیدا کریں۔ خصوصاً بڑے مدارس اردو کے لیے عملی جدوجہد کرتے ہوئے موقع موقع سے اردو سیمینار منعقد کریں۔ اردو کی خدمت کرنے والوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں ایوارڈ سے نوازا جائے کہ یہی زندہ قوموں کی نشانی ہے اور یہی زندگی کی علامت......

سبق پڑھ پھر صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

Book.eps195

مسلمانوں سے چند اہم گزارشات

اردو نیوز ہماری ریاست میں شروع ہوئی اور بند بھی کردی گئی۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اردو والوں کو فرقہ پرست جس طرح چاہے نچا سکتے ہیں۔بات یہ ہے کہ اردو نواز حضرات نے بڑے ہی صبر وضبط سے کام لیا۔ان حضرات سے میری گزارش ہے کہ مسلمان اپنی دکانوں میں دکان کا بورڈ اردو میں لکھائیں،اس کا مطلب یہ نہیں ہے دوسری زبانوں کو بالائے طاق رکھ دیں،عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انگریزی ہو یا کنڑ،یا تمل، کسی بھی زبان میں آپ بورڈ لگوائیں مگر اس کے ساتھ اردو میں بھی دکان کا نام وغیرہ لکھیں۔بورڈ لکھاتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ صحیح لکھا جارہا ہے یا نہیں؟

دوسری التجا یہ ہے کہ اپنے خطوط میں انگریزی کے بجائے اردو میں پتہ لکھا کریں،اگر ہم اردو میں پتہ لکھیں گے تو حکومت کو مجبور ہوکر اردو داں مسلمانوں کو نوکری پر رکھنا پڑے گا،میری یہ بھی ایک گزارش ہے کہ شہر میں مختلف جگہوں میں کتب خانے ہیں، وہاں جاکر مطالعہ کریں اور اپنے معلومات میں اضافہ کریں جیسا کہ دوسری زبان والے وقت نکال کر جاتے ہیں اور مطالعہ کرتے ہیں۔مگر افسوس کہ ہمارے لوگوں کو اتنی فرصت کہاں،اردو اخبارات ورسائل کو دیکھ کر ایسے منھ بناتے کہ مت پوچھئے۔اگر ہم اردو اخبار کو کثرت سے پڑھتے ہوتے تو ضرور ہمارے شہر سے بھی شامنامہ نکلتا،جیسا کہ دوسری زبانوں میں نکلتا ہے۔امید کہ میر گزارشات پر غور کیا جائے گا۔

(مطبوعہ روزنامہ سالار 11/11/1994)

ہر محلے کا ارادہ اردو اسکول اڈاپٹ کرے

شہر گلستان بنگلور میں رہنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے بڑی وسعت قلبی سے نوازا ہے، دینی معاملہ ہو چاہے سیاسی معاملہ، یا اور کوئی بھی میدان ہو، اہلِ شہر گلستان بڑی فراغ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں، حال ہی میں حکومت کرناٹک نے اسکول اڈاپٹ کرنے کا ارادہ کیا تو الحمدللہ ''رباط العلماء بنگلور'' نے رحمانیہ اسکول تمیا روڈ کو اڈاپٹ کیا اور انجمن خدام المسلمین بنگلور نے جو پچھلے پندرہ سال سے خاموشی کے ساتھ قوم وملت کی قابل قدر اور قابل نمونہ خدمت انجام دے رہی ہے اب یلگنڈہ پالیم کی اسکول کو اڈاپٹ کیا ہے، جہاں اس سال ساتویں جماعت کے شاندار نتائج رہے اور کئی بچوں نے اعلیٰ درجے میں کامیابی حاصل کی، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور اس اسکول کو اور انجمن کو اور ترقیات سے نوازے، اسی طرح خلاصی پالیم کی اسکول کو مجلس ملیہ والوں نے اڈاپٹ کیا، الحمدللہ ہر محلے میں ایک انجمن یا فلاحی ادارہ یا بیت المال یا ایسوسی ایشن موجود ہے، جو اپنے اپنے طور پر مختلف خدمات انجام دے رہے ہیں اگر مذکورہ اداروں کے ذمہ دار حضرات اپنے اپنے محلے کے اردو اسکولوں کو اڈاپٹ کریں گے، تو میں سمجھتا ہوں کہ محلے کے بچوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور محلے کے پسماندہ طبقے میں تعلیمی محنت کرنے میں آسانی بھی ہوگی۔

محلے کے حضرات محلے کے حالات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں، اس سے بڑا فائدہ یہ ہوسکتا ہے کہ بچہ مزدوری کا خاتمہ ہوسکتا ہے، کئی مخیّر حضرات اپنی رقم کو اس طرح

کے کارِ خیر میں استعمال کرنا چاہتے ہیں، اگر ہم محلے کے ذمہ دار حضرات، ان کی خدمت میں پہنچ کر ساری تفصیلات پیش کر کے ان صاحب خیر حضرات کی سرپرستی میں کام کریں گے تو میں سمجھتا ہوں کہ محلے میں کوئی بھی گھر ایسا نہ ہوگا جس میں بچہ اسکول کو جاتا نہ ہو، اور ادارے کے ذمہ دار حضرات بچوں کی کتابیں اور یونیفارم اور دوسری ضروریات کا سامان مہیا کرنے کی فکر کریں تو انشاء اللہ آنے والی نسل ان کی خدمات کو فراموش نہیں کرے گی، اس کام سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اردو کی بقا اور اس کی حیات کا یہ کام ایک ذریعہ ہوگا، ورنہ ناممکن نہیں کہ اردو چند سالوں کے بعد دنیا سے ناپید ہو جائے اور اس کا تذکرہ صرف تاریخ کی کتابوں میں باقی رہ جائے۔ لہٰذا میری شہر کے ہر محلے کے ذمہ دار حضرات سے گذارش ہے کہ جلد از جلد اردو اسکولوں کو اڈاپٹ کریں۔ مزید تفصیلات کے لیے مذکورہ اداروں کے ذمہ داروں سے رابطہ قائم کریں۔ کاہلی اور سستی کریں گے تو

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

والا معاملہ ہو جائے گا۔

مطبوعہ روزنامہ سالار 23/06/2001

کرناٹک اردو اکیڈمی کی افسوس ناک صورتحال

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

حد ہوگئی صاحب! لکھنا چاہتا ہوں لیکن قلم، قرطاس پر چلنے سے بیزارگی کا اظہار کر رہا ہے، کیا کیا جائے بات ہی کچھ ایسی ہے۔ چند دن قبل یہ دردناک اور افسوس ناک واقعہ پیش آیا کہ ہمارے ایک شاعر دوست نے اپنا دیوان شائع کرانے کے لیے کرناٹک اردو اکیڈمی کو درخواست بھیجی، تو ان کی درخواست کی وصولیابی کی اطلاع اردو اکیڈمی سے آ گئی، لیکن جب شاعر موصوف نے لفافہ چاک کیا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اردو اکیڈمی کے ڈائرکٹر نے بجائے اردو جیسی شیریں زبان نے انگریزی میں لکھا ہوا ایک پروانہ ارسال کیا تھا۔

یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ مجھے انگریزی زبان سے یا کسی اور زبان سے کوئی نفرت نہیں ہے، بلکہ میں اردو کے علاوہ دوسری زبانیں جانتا بھی ہوں اور دلچسپی بھی رکھتا ہوں، لیکن یہاں میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ جب اکیڈمی اردو کی ہے تو چاہیے تو یہ تھا کہ وہاں کے تمام کارکن اچھی طرح اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہوں، وہاں کے تمام دستاویزات اردو میں تحریر ہوں، وہاں کے اعلانات، وہاں کے خطوط، تمام ہی اردو میں انجام پائیں۔

قارئین کرام! صرف اردو اکیڈمی ہی کا یہ حال نہیں ہے، آپ کو ایسے اور بھی

بہت سے ادارے ملیں گے جہاں نام تو اردو کا ہوگا لیکن کام پورا اردو کے منافی ۔ ریڈیو اسٹیشن میں اردو نشریے کے لیے ایسے شخص کو ذمہ دار بنایا گیا ہے جو اردو کا الف تک نہیں جانتے ۔ سالار میں یحیٰ النسیم صاحب کے مضمون سے بھی یہاں کی زبوں حالی کا پتہ چلتا ہے کہ ایسے کئی ادارے ہیں جہاں اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں اردو کا خون ہو رہا ہے ۔ کسی شاعر نے ایسے ہی موقع کے لیے کہا تھا

دل کے پھپولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

میں امید کرتا ہوں کہ ہمدردانِ اردو اس طرف توجہ فرمائیں گے۔

مطبوعہ روزنامہ سالار 23/06/2001

اردو ہال کا بے حال

ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب ساری دنیا میں مشہور اور منفرد ہے۔ یہی ایک ایسا ملک ہے کہ ایک دو یا دس بیس نہیں بلکہ سینکڑوں زبانیں یہاں پنپتی ہیں اور ہر زبان کی اپنی ایک تاریخ ہے، اپنا ایک لٹریچر ہے، ہندستان کی ہر ریاست کی زبان الگ ہے، اور اس ریاست میں اس کو فرسٹ لنگویج کا درجہ بھی حاصل ہے اور عام طور پر دوسری زبان، سیکنڈ لنگویج انگریزی ہی کو قرار دیا جاتا ہے، جب کہ ساری ہندوستان میں تمام ہی مسلمان اردو بولتے ہیں، ان کی مادری زبان اردو ہے، ان کا مذہبی لٹریچر بھی اردو میں بھرا پڑا ہے، وہ اردو بولنے پر فخر کرتے ہیں، اگر کسی ریاست کے مسلمانوں کو اردو سے آشنائی نہیں تو وہ احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں اور اردو سیکھنے کے لیے دور دور کا سفر کرتے ہیں اردو کی شیرینی اور اس کی مٹھاس سے لطف اندوز ہوتے ہیں، اس اعتبار سے اگر زبانوں کے بولنے والوں کے اعتبار سے اوسط نکالا جائے تو اردو کو سب سے زیادہ پوائنٹس ملیں گے اور وہ پہلے نمبر پر ہوگی، نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے کئی دوسرے ممالک ایسے ہیں جہاں دوسری زبانوں کے علاوہ اردو بھی بولی، لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔

لیکن بھارت کو آزاد ہو کر پچاس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا، اردو کو آج تک اس کا حق نہ ملا۔ صرف ووٹ بٹورنے کے لیے وعدے کیے جاتے ہیں کہ اردو کو اس جائز مقام دیا جائے گا اور اردو ہال بنایا جائے گا اور دو ایک ریاستوں میں اردو گھر کے نام سے

عمارتیں موجود بھی ہیں، لیکن ہماری ریاست کرناٹک میں بنگلور، جو نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے اور یہاں صدیوں سے اردو بولنے والے موجود ہیں، لیکن آج تک ''اردو گھر'' یا 'اردو ہال' کے نام سے کوئی عمارت نہیں بنی۔ چند دنوں سے یہ بات گرم ہے کہ اردو ہال بنایا جائے گا۔ اس کے لیے جگہ کی تلاش ہے، میں قارئین کرام سے گذارش کرتا ہوں کہ اردو کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے پوری دیانت داری کے ساتھ اپنی اپنی رائے دیں کہ اردو گھر یا اردو بھون کہاں بنایا جائے، اس میں اپنے فائدے کا شائبہ تک نہ ہو، پورے خلوص کے ساتھ مشورہ دیں انشاء اللہ خود بخود جگہ کا تعین ہو جائے گا اور ہمارے سامنے ایک خوبصورت ''اردو ہال'' یا ''اردو گھر'' تیار ہو جائے گا۔

(مطبوعہ روزنامہ سیاست 05/04/2000)

کیا اتحادِ امت ناممکن ہے؟

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اسلام جہاں انفرادی زندگی کے بارے میں بہت سے ہدایات واحکامات دیتا ہے، وہیں اجتماعی زندگی کے متعلق بھی بہت اہم اور قیمتی تعلیمات سے نوازتا ہے، اسلام ہم سے خلوت میں جینے کا مطالبہ نہیں کرتا، بلکہ ایک امت بن کر اجتماعیت کے ساتھ زندگی گزارنے کا تقاضہ کرتا ہے اور ایک ایسی امت بنانا چاہتا ہے جو اس طرح متحد نظر آئے جس طرح ایک امام کی اقتداء میں مقتدی متحد و متفق ہوتے ہیں، اور ایسی ملت بنانا چاہتا ہے جو حالات سے باخبر رہے، مخلص اور خیر خواہ لوگوں کی اتباع میں اپنا سفر طے کرے، ہشیاری، بیدار مغزی، تیقظ اور اجتماعی شعور کے ساتھ اپنی مسلمانیت کو ظاہر کرتے ہوئے سفر آخرت جاری رکھنے کا دینِ اسلام کا ہم سے مطالبہ ہے۔

اسلام کا یہ مطالبہ اتنا ہی اہم اور قابلِ توجہ ہے جتنا تقویٰ طہارت، نماز روزہ وغیرہ کے بارے میں ہے۔ اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب ایمان والوں کو تقویٰ کا حکم فرمایا تو اس کے فوراً بعد اتحاد واتفاق کی تلقین فرمائی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ** ”اے ایمان والو، اللہ تعالیٰ سے ایسا ڈرا کرو جیسا ڈرنے کا حق ہے، اور اسلام کامل کے سوا کسی اور حالت پر جان نہ دینا“ یعنی تادمِ مرگ کامل تقویٰ پر اور اسلام پر قائم رہنا۔ نیز فرمایا **وَاعْتَصِمُوا**

بِـحَبْـلِ اللّٰـهِ جَمِيْعاً وَّلَا تَفَرَّقُوا ’’اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوط پکڑے رہو، اور آپس میں نااتفاقی مت کرو‘‘ یعنی اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھام لو، بایں طور کہ باہم سب متفق بھی رہو اور آپس میں انتشار وافتراق کی صورتیں پیدا مت کرو۔

ان دو آیتوں میں مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو مضبوط اور ناقابل تسخیر بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو اہم اصول بیان فرمائے ہیں۔(۱) تقویٰ وطہارت (۲) اتحاد واتفاق معلوم ہوا کہ اتحاد واتفاق کی فضیلت واہمیت تقویٰ وطہارت کے مساوی ہے۔ خدا تعالیٰ نے حکیمانہ انداز میں پہلے اس نسخۂ اکسیر کا ذکر کیا جو انسانوں کو باہم مربوط اور جوڑے رکھنے کا بہترین اصول ہے یعنی تقویٰ وطہارت، پھر آپس میں متفق ہونے اور انتشار وافتراق سے بچنے کا حکم فرمایا ہے۔

اتحاد اور وحدت ایک ایسی شئے ہے جس کے مستحسن ہونے پر دنیا کے تمام انسان خواہ وہ کسی عہد اور کسی اقلیم کے ہوں، کسی مذہب ومشرب اور مسلک کے ہوں، سب کی رائے ایک ہے، اس میں دو رائے ہونے کا امکان ہی نہیں۔ اسی لیے دنیا کی ہر جماعت اور ہر فرد لوگوں کو ایک ہونے ہی کی دعوت دیتا ہے، مگر حالاتِ حاضرہ پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اتحاد واتفاق کے مفید اور لازم ہونے کے باوجود ملتِ اسلامیہ فرقوں اور پارٹیوں میں منقسم ہے۔ اس کی بنیاد اور وجہ کے بارے میں سوچا جائے تو اس کی واحد وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہر فرقہ اور ہر شخص لوگوں کو اپنے خودساختہ نظامِ عمل یا اپنے خودساختہ نظریے پر متفق کرنا چاہتا ہے اور جب دوسرے لوگ اپنا بنایا ہوا کوئی نظام العمل یا اپنی رائے پیش کرتے ہیں تو یہ شخص اپنے نظریے پر ہٹ دھرمی کے ساتھ جم جاتا ہے اور دوسروں کے نظریات کا لحاظ اور احترام نہیں کرتا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایک ہی ملّت

بے شمار انتشار وافتراق کا شکار ہو جاتی ہے۔

اس کی واضح تردید قرآن حکیم نے اس عادلانہ اصول کے ذریعے پیش کی ہے کہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعاً وَّلا تفرَّقُوا ''سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامو، تفرقے میں مت پڑو''، الگ الگ مت ہو جاؤ، گروہوں اور متفرق جماعتوں میں اپنے کو مت ڈھال لو، سب کے سب سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح شئ واحد ہو جاؤ۔ اس آیت سے واضح ہے کہ کوئی بھی خود ساختہ نظریہ اتحاد کا ذریعہ نہیں بن سکتا تا حالیکہ اتحاد کی جڑ ''اللہ کی رسی'' نہ ہو۔ اور اس آیت میں ''اللہ کی رسی'' سے مراد اللہ کی کتاب، اللہ کی طرف سے عطا کردہ نظام حیات، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن تعلیمات ہیں۔

اسی سلسلے میں حضرت ثابت مزنیؒ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو خطبے میں فرماتے ہوئے سنا اے لوگو! تم اطاعت اور جماعت کو لازم پکڑ لو، اس لیے کہ یہی وہ دو چیزیں ''اللہ کی رسی'' ہیں، جس کو تھامنے کا اللہ نے حکم فرمایا ہے۔

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اِتَّبِعُوا السَّوَادَ الاَعْظَمَ فَاِنَّهُ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّار ''تم سوادِ اعظم کی اتباع کرو، اس لیے کہ جو بڑی جماعت سے علاحدہ ہوا وہ جہنم میں داخل ہوگا'' اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا'' اِنَّ اللّٰهَ يَرْضٰى لَكُم ثَلاثاً وَيَسْخَطُ لَكُم ثَلاثاً ، يَرْضٰى لَكُمْ اَنْ تَعْبُدُوْهُ وَلا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئاً وَاَنْ تَعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعاً وَلا تفرَّقُوْا وَاَنْ تَنَاصَحُوْا مَنْ وَلاَّهُ اللّٰهُ اَمرَكُمْ وَيَسْخَطُ لَكُمْ ثَلاثاً قِيْلَ وَقَالَ وَكَثْرَةَ السُّوَالَ وَاِضَاعَةَ الْمَالِ (ابن کثیر، بروایت مسلم)

''اللہ تعالیٰ تمہارے لیے تین چیزوں کو پسند کرتا ہے اور تین چیزوں کو ناپسند کرتا ہے، پسندیدہ چیزیں یہ ہیں، (۱) تم اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ، تم اللہ تعالیٰ کی

کتاب کو مضبوطی سے تھام لو اور نا اتفاقی سے بچو۔ اپنے حکام اور اولوالامر کے حق میں خیر خواہی کرو۔ تین ناپسندیدہ چیزیں یہ ہیں۔(۱) بے ضرورت بحث ومباحثہ کرنا،(۲) بلا ضرورت کسی سے سوال کرنا (۳) حاجت کے بغیر ناحق مال خرچ کرنا۔

لہذا شریعت مقدسہ میں اجتماعی اعمال، امت واحدہ اور ملت متحدہ کا مظہر ہیں اجتماعی اعمال میں سے ایک عمل نماز جمعہ ہے جمعہ کے دن مسلمانوں کی اجتماعیت اور اتحاد کا ایک معمولی سا مظاہرہ ہوتا ہے۔ چونکہ مسلمان ایک جماعت ہے کسی انبوہ، گروہ یا کسی بھیڑ یا ریوڑ کا نام نہیں اور مسلمانوں کا کسی جگہ پر اتفاقا یا عادتا یا اچانک جمع ہو جانا (خواہ ہفتہ واری ہو یا ماہانہ یا سالانہ) فی نفسہ مطلوب نہیں نیز مسلمان وقتی اور عارضی طور پر صرف اپنے بدن اور جسم سے اجتماعیت کا مظاہرہ کریں، یہ اصلا مقصود نہیں بلکہ شریعت کے مدنظر نماز جمعہ کے ذریعے مسلمانوں کے مابین اتفاق واتحاد اور اجتماعیت نیز قلوب میں محبت ومودت کو فروغ دینا ہے۔ جمعہ کے دن اجتماع کے مقاصد اور تقاضے وہی ہیں جو روزانہ پنجوقتہ باجماعت نماز ادا کرنے کے ہیں۔ اسی سلسلے میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ باجماعت نماز پڑھنے کی حکمت یہ بیان فرماتے ہیں:۔ جب کسی امر کا اظہار بزور منظور ہوتا ہے تو اس کو عملی صورت میں لا کر دکھاتے ہیں چونکہ خدا تعالی کو اس عالم کی ہر چیز میں اعتدال منظور ہے اور اشیاء میں اعتدال جب ہی قائم رہتا ہے کہ ان میں اتحاد اور وحدت کا رابطہ قائم ہو پس خدا نے وحدت واتفاق کو عالم تشریعی (شرعی احکام کی دنیا) کے اندر جماعت وامامتِ نماز کی صورت میں دکھایا (المصالح العقلیۃ صفحہ ۱۰۵) جو مقاصد یومیہ باجماعت نماز پڑھنے کے ہیں وہی مقاصد اور حکمتیں وسیع پیمانے پر بروز جمعہ جامع مسجد میں حاضر ہو کر اجتماعی طور پر نماز کی ادائیگی کے ہیں نیز وہی مصالح اور

اسرار ورموز سالانہ عید گاہ میں جا کر عید کی نماز ادا کرنے کے ہیں ان مقاصد اور مصالح میں سے ایک اہم مقصد اتحاد و اتفاق کی عملی تمرین، قلوب کی وحدت اور تحابب کو عام کرنا ہے۔

مذکور بالا آیت وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعاً وَّلاَ تَفَرَّقُوا میں اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑنے کا جو حکم ہے وہ اس طرح نہیں کہ ہر فرد اپنی جگہ پر دوسرے کی مخالفت انشقاق اور تنازع کرتے ہوئے حبل اللہ کو تھامے، بلکہ حکم یہ ہے کہ سب مل کر اجتماعیت ووحدت کا مظاہرہ کرتے ہوئے باہمی الفت ومودت کے ساتھ اعتصام بحبل اللہ کو بجالائیں نیز یہ اجتماعیت خالصۃ لوجہ اللہ ہو تو خدا تعالی کو پسندیدہ ہے اور اللہ کی نصرت اس کے ساتھ ہونے کی خوشخبری دی گئی ہے، اسی کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا يَدُاللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِفَمَنْ شَذَّشُذَّفِي النَّار (مشکوۃ) اللہ کی تائید، مدد، نصرت اور حمایت جماعت کے ساتھ ہے، پس جو جماعت سے الگ ہو گیا وہ جہنم میں داخل ہو گیا۔

یہاں یہ بات بھی ذہین نشین ہونی چاہئے کہ جب جماعت کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس میں علاقائیت کی، زبان کی، خاندانوں کی، مختلف نسلوں کی ساری حدود ختم ہو جاتی ہیں یعنی اگر کوئی جماعت سے صرف کسی خاص علاقے، خاندان، زبان، یا خاص حلقے والوں کی جماعت مراد لے اور اسی کو جماعت سمجھے دیگر جماعتوں اور افراد کے ساتھ اجتماعیت کا وہ رابطہ نہ رکھے جیسا رابطہ ہونا چاہئے تو یہ گروہ بندی ہو گئی

لہذا رنگوں، زبانوں قبیلوں، نسلوں، خاندانوں، علاقوں اور فرقوں کی بنیاد پر جو تفرقات وجود پذیر تھے ان سب اختلافات کو ختم کرنے کے لئے اللہ تعالی نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو دین اسلام عطا فرما کر آخری آفاقی اور عالمگیر رسول بنا کر خاتم النبیین

اور رحمۃ للعالمین کی حیثیت سے مبعوث فرمایا، آپ نے مکہ والوں کو مدینے والوں کے ساتھ ،مشرق والوں کو مغرب والوں کے ساتھ، شمال والوں کو جنوب والوں کے ساتھ، عرب کو عجم کے ساتھ ان تمام طبقات کو جو بھی اسلام میں داخل ہوتے گئے شیر وشکر فرمادیا، ان کے مابین مواخاۃ قائم فرمادی ان کو بالکل اس طرح مربوط فرمادیا جس طرح ایک باپ کے بیٹے اور سگے بھائی ہوتے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرسکتے اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے حق تعالی نے ارشاد فرمایا اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَۃٌ (الحجرات ۱۰) مسلمان تو سب (ایک دوسرے کے) بھائی ہیں۔ اسی کی اور تشریح کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اَلۡمُؤۡمِنُ مِرآۃُ الۡمُؤۡمِنِ وَالمُؤۡمِنُ اَخُو الۡمُؤۡمِنِ یَکُفُّ عَلَیۡہِ ضَیۡعَتَہٗ وَیَحُوۡطُہٗ مِـــن وَّرَاءِہٖ (سنن ابی داؤد رقم الحدیث ۴۹۱۸) ایک مومن دوسرے مومن کے لئے آئینہ ہے اور ایک مومن دوسرے مومن کا بھائی ہے، اس کے نقصان کو اس سے روکتا ہے اور اس کی ہر طرف سے حفاظت کرتا ہے، ان احادیث کو مدنظر رکھ کر ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ بھائی چارگی کی کیفیت ہمارے اندر پیدا ہوئی ہے یا نہیں اگر ہمارے ذہنوں میں تفریق ہے اور دماغوں میں اپنے طور پر درجہ بندی کرلی گئی ہے یا ہم نے ایک نیا طبقہ یا درجہ یا فرقہ یا پارٹی قائم کرلی ہے، تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ہم نے اخوت کو تاراج کر رکھا ہے کیونکہ مسلمان کسی فرد واحد کا نام نہیں بلکہ مسلمان درحقیقت ایک فرد ہی سے وجود میں آتا ہے، لیکن ایک جماعت اور اجتماعیت کا نام ہے اس جماعت منصورہ ومرحومہ اور مؤیدہ کے اوصاف عالیہ خود باری تعالی نے ارشاد فرمائے ہیں وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنَاتُ بَعۡضُھُمۡ اَوۡلِیَاءُ بَعۡضٍ (التوبہ ۷۱) اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں یعنی ایک دوسرے کے دوست، حمیم مخلص، اور صدیق کامل ہیں مخلص دوست وہی ہوتے

ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کے کام آنے والے ہوتے ہیں نیز ہر مومن دوسرے مومن کا ساتھی خادم فکر مند ہمدرد اور خیر خواہ ہوتا ہے جن صفات عالیہ اور خصال محمودہ کو اپنے اندر لانے سے مؤمنین کاملین کی جمعیت وجود پذیر ہوتی ہے وہ مفصل اور مکمل اس آیت والمومنون والمومنات بعضہم اولیاء بعض میں بیان کئے گئے ہیں اللہ تعالی کو صرف یہ پسند نہیں کہ ہر آدمی صرف عبادت گذار بن جائے اور اس کے اندر اخلاق حمیدہ نہ ہو، اگر اللہ تعالی کو یہ پسند ہوتا تو امت محمدیہ علی صاحبھا الصلاۃ والتسلیم کی تخلیق کی ضرورت نہ ہوتی جس کے خصوصی اوصاف میں نماز، زکوۃ، اللہ تعالی کے احکام کو بجالانے اور محبوب خدا ﷺ کی اطاعت کرنے کے ساتھ ساتھ، ایک دوسرے کے ولی اور مددگار ہونے کو بھی ذکر کیا گیا ہے ،اس لئے کہ سابقہ امتوں میں عبادت گذار راھب اور مرتاض عیسائی موجود تھے قرآن کریم میں ان کا ذکر ہے قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (المائدۃ ۸۳) محض اس طرح کے لوگ پیدا کرنے تھے تو مکی اور مدنی انقلاب برپا کرنے کی حاجت درپیش نہ ہوتی کہ جس انقلاب کے ذریعے خیر امت کو وجود بخشا گیا پھر اس کے خاص اوصاف اور صفات میں جس صفت اور وصف کو ذکر کے اعتبار سے پہلا رتبہ درجہ اور مقام دیا گیا وہ بعضہم اولیاء بعضھے ،دوسرے اوصاف (نماز، زکوۃ، اطاعت احکام الہی، اتباع سنت رسول اللہ ﷺ وغیرہ) کو بعد میں بیان فرمایا، اللہ تعالی اس صفت کو پہلے ذکر کرنے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ تعاون وتناصر اور تحابب کا جذبہ ایمان اور اسلام کی بنیادوں میں سے ہے اور یہی جذبۂ دروں مسلمانوں میں عام کرنا ہے اسی کی تشریح رسول اللہ ﷺ نے اس طرح فرمائی عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ ﷺ لَاتَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى تُوْمِنُوْا وَلَاتُوْمِنُوْا حَتّٰى تَحَابُّوْا اَوَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى شَئٍ اِذَافَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ

اَفْشُوا السَّلامَ بَيْنَكُمْ (مسلم رقم الحدیث ۸۱) تم جنت میں داخل نہیں ہو سکتے ایمان کے بغیر اور فرمایا باہمی محبت کے بغیر تمہارا ایمان کامل نہیں، (تمہارا ایمان کا دعوی معتبر نہیں) کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جس پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے آپس میں محبتیں پیدا ہوتی ہیں وہ عمل یہ ہے کہ تم آپس میں سلام کو رواج دو۔ اسی کی تبیین اور توضیح میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْمُؤمِنُ يَأْلِفُ وَيُؤْلَفُ وَلَاخَيْرَ فِي مَنْ لَايَأْلِفُ وَلَايُؤْلَفُ وَخَيْرُ النَّاسِ اَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ رواہ الدارقطنی الجامع الصغیر جلد۲، صفحہ ۶۶۱ (منتخب احادیث صفحہ ۵۳۷) ایمان والا محبت کرتا ہے اور اس سے محبت کی جاتی ہے اور ایسے شخص میں کوئی بھلائی نہیں جو نہ محبت کرے اور نہ اس سے محبت کی جائے اور لوگوں میں بہترین شخص وہ ہے جو سب سے زیادہ لوگوں کو نفع پہنچانے والا ہو۔

اسی کی اور زیادہ وضاحت رسول اللہ ﷺ نے یوں فرمائی عَنْ اَبِي مُوسَىؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضاً وَشَبَّكَ اَصَابِعَهُ (بخاری رقم الحدیث ۲۴۴۶) ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے تعلق ایک عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے (بطور تمثیل کے) ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈالیں۔ یعنی اس عمل سے یہ سمجھایا کہ مسلمانوں کو اس طرح آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہنا چاہئے اور ایک دوسرے کی قوت کا ذریعہ ہونا چاہئے اس کی یہ پیوستگی، رشتہ اور تعلق ہی درحقیقت اسلام کی نمائندگی کرتا ہے۔

بنی آدم اعضاے یک دیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند

ان آیات اور احادیث کو پیش نظر رکھ کر ہم کو موازنہ کرنا چاہئے اور اندازہ لگانا چاہئے کہ

کیا واقعتاً ہمارے تعلقات اور رشتے اور محبتیں اس طرح ہیں؟ کیا ہم نے اپنے قلوب کو کدورتوں سے اور سینوں کو کینوں سے پاک کرلیا ہے؟ ہمارے اندر اگر بغض، عداوت حسد اور نفرت ہے اور ہم میں سے ایک آدمی دوسرے کی ٹانگ پکڑ کر کھینچنے میں لگا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ میں ہی سب پر حاوی اور غالب رہوں تو یہ جذبہ اور نیت مومنین کے اوصاف میں سے نہیں۔

جنگ وجدال اور نفرت وعداوت کی مضرت پر تنبیہ کرتے ہوئے باری تعالی نے ارشاد فرمایا وَلَاتَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ۔ (الانفال ۴۶) اور آپس میں نہ جھگڑو پس نامرد ہو جاؤ گے (ترجمہ شیخ الھندؒ) اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو بے شک اللہ تعالی صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔یعنی باہمی تنازع اور جدال سے تمہاری خود اعتمادی ختم ہو جائے گی بزدلی پیدا ہو جائے گی تمہاری ھیبت اور دبدبہ ختم ہو جائے گا۔

امت مسلمہ اس وقت جس ذلت ونکبت اور ہمہ گیر انحطاط کی شکار ہے کوئی شخص اس کے سینکڑوں اسباب اور وجوہات شمار کرے لیکن اس سے تو کسی کو انکار کی مجال نہیں کہ اس کا ایک اہم سبب باہمی رسہ کشی اور انتشار واختلاف ہے اسی کو صراحت سے فرمایا وَلَاتَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا یعنی تم آپس میں نزاع وجدال مت کرو ورنہ تمہارا وقار، رعب اور دبدبہ یکسر ختم ہو جائے گا اور تم اپنے مقاصد اور عزائم میں ناکام ہو جاؤ گے۔قرآن حکیم کی اس تعبیر (ہوا کے اکھڑ جانے) میں اعلی درجے کی جامعیت ہے یہ کسی خاص شعبے یا میدان یا کسی خاص حصے میں خسارہ اور ناکامی کی بات نہیں بلکہ زندگی کے ہر موڑ پر نامرادی اور نقصان کی نشاندھی ہے۔قرآن کی اس پیشین گوئی پر مسلمانوں کی ساڑھے چودہ سو سالہ تاریخ شاہد ہے کہ جہاں کہیں شکست وہزیمت کا سامنا کرنا پڑا اس کی بنیادی وجہ باہمی انتشار وافتراق رہا ہے چاہے بغداد میں تاتاریوں کی

بربادی ہو یا خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہو یا ہندوستان کی آٹھ سوسالہ حکومت کا زوال۔الغرض عالم اسلام میں پیش آنے والی عظیم آفت کا تعلق اسی نزاع وانتشار سے ملتا ہے۔اور ایک آیت میں اللہ تعالی افتراق واختلاف کرنے والوں کے لئے عذاب عظیم ہونے کی تنبیہ فرماتے ہیں ولاتکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءہم البینات واولئک لہم عذاب عظیم (آل عمران ۱۰۵)اور تم ان لوگوں کی طرح مت بنو جنہوں نے واضح اور روشن دلائل پہنچنے کے بعد باہم تفریق کرلی اور باہم اختلاف کرلیا اوران لوگوں کے لئے بڑا عذاب ہے یعنی یہود ونصاری کی طرح نہ ہوجاؤ جنہوں نے محض نفسانی خواہشات کی اتباع کرکے اصول شرع کے صاف احکام پہنچنے کے بعد اسی میں متفرق ہوگئے باہمی جنگ وجدال کے شکار ہوگئے یہ آیت دراصل اس سے ماقبل کی آیت واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولاتفرقوا کا تکملہ اور تتمہ ہے کہ جس طرح مسلمانوں کی اجتماعی اور ملی فلاح وکامرانی دوچیزوں (تقوی اور اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامنے) پر موقوف ہے،اسی طرح اپنے اندر تفرق واختلاف سے احتراز واجتناب کرنا بھی لازمی اور ضروری ہے کیونکہ تفرق وانتشار ہی نے گذشتہ قوموں کو تباہ وبرباد کردیا لہذا ان سے عبرت حاصل کروان کی طرح نہ بنو۔موجودہ دور میں جس قسم کے اختلاف سے ملت اسلامیہ کی گروہ بندی ہورہی ہے وہ محض دین (کے جزئی اور فروعی مسائل) ہی کے نام سے ہورہی ہے،آج کے عہد میں مسلمانوں کی ساری کدوکاوش کا ماحصل فروعی مسائل کا اثبات یا تردید مقصود ہوتی ہے۔

اعتقادات اور ایمانیات کے علاوہ جن جزئی مسائل میں آج ہم متفرق ومنتشر ہوگئے ہیں یہ جزئی مسائل میں اختلاف رائے صحابہ کرامؓ کے دور سے چلا آرہا ہے لیکن حضرات صحابہؓ نے کبھی بھی اس اختلاف رائے کو بنیاد بنا کر آپس میں عداوتیں نفرتیں اور رنجشیں پیدا نہیں کرلی تھیں، مطلق اختلاف رائے مذموم شئ نہیں بلکہ باہمی مخالفتیں اور

عداوتیں ممنوع اور محرمات میں سے ہے کیونکہ اختلاف رائے کے باوجود صحابہؓ کے باہمی اخوت اور مودت کی بے شمار مثالیں اور واقعات ہیں لہذا اگر باہم اختلاف رائے ہو جائے تو ہمارے لئے صحابہ کرامؓ کا اسوہ ہمارے لئے موجود ہے ان کی اتباع میں ہمارے لئے نجات اور سرخ روئی ہے۔

غیر منصوص مسائل میں نظری اور فکری اختلاف ایک فطری اور طبعی چیز ہے، جس طرح کائنات کی ہر شئے میں تنوع ہے، اسی طرح انسانوں کی ذہنی سطح اور اندازِ فکر میں بھی تنوع ہے، اس لیے نظری مسائل میں آراء کا اختلاف نہ مضر ہے اور نہ مہلک، بلکہ یہ اختلافِ رائے وحدتِ اسلامی کے منافی بھی نہیں۔ کیونکہ جہاں عقل مند لوگ اور دیانت دار لوگ جمع ہوتے ہیں۔ وہاں اختلافِ رائے ضرور ہوگا، اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین بھی اختلافِ رائے تھا، جیسے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے درمیان بعض مسائل میں اختلافِ رائے تھا، لیکن آپسی احترام اور خلوص ومحبت ایسی بے مثال تھی کہ ایک مرتبہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سوار ہو کر کہیں جا رہے تھے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر رکاب تھام لیا اور ان کی سواری کے ساتھ چلنے لگے، یہ دیکھ کر حضرتِ زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا "اے رسول کے چچازاد بھائی! رکاب چھوڑیے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ہمارے لیے یہی حکم ہے ہم اپنے علماء اور بزرگوں کے ساتھ اسی طرح پیش آئیں۔ یہ سب کر حضرتِ زید ابن ثابت نے فرمایا "اے ابنِ عمِ رسول، ذرا اپنا ہاتھ بڑھایئے" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو زید نے فرطِ محبت میں اس کو چوم لیا اور فرمانے لگے، ہمارے لیے یہی حکم ہے کہ آلِ رسول کے ساتھ اسی طرح پیش آئیں۔

اختلافِ رائے کے باوجود آپسی محبت اور احترام کے ایسے بے شمار واقعات صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین کے دور میں بھی،، ماضی قریب کے علماء میں نیز

اس زمانے کے متدین علماء میں اب بھی ملتے ہیں۔اس لیے اختلافِ رائے مذموم چیز نہیں ، بلکہ اختلافِ رائے میں فساد اور بگاڑ کی جڑ باہمی نزاع اور جنگ کی صورت پیدا ہو جانا خواہ عوام کی طرف سے ہو یا علماء کی جانب سے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی دو وجوہات بیان فرمائی ہیں۔ایک وجہ بعض علماء کی طرف سے، دوسری اکثر عوام کی جانب سے۔علماء کی جانب سے یہ ہے کہ وہ اپنے جزئی اختلافِ رائے کو علماء تک ہی محدود نہیں رکھتے ،بعض تو اس کی سعی کرتے ہیں کہ عوام کی اعانت ونصرت ان کے ساتھ ہو،اوران کی مدد سے وہ دوسرے اہل حق کی توہین وتذلیل کریں۔حالانکہ بہتر یہ تھا کہ وہ جس چیز کو حق سمجھتے ہیں اس کو ظاہر کر دیں اوراس کی پرواہ نہ کریں کہ ان کے قول پر کوئی عمل کرتا ہے یا نہیں۔کسی کے عمل نہ کرنے سے اہل حق کی حقانیت میں کوئی فرق نہیں آتا، بالخصوص ایسی حالت میں کہ عوام ان اختلافات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔تو ایسی حالت میں ان پر ان چیزوں کا یا اظہار نہ ہوتا یا جہاں علماء کا مجمع ہوتا وہاں ظاہر کی جاتیں۔یا اگر بضرورتِ تبلیغ اور بخوفِ کتمانِ علم اظہار کیا جاتا تو جب عوام کے عقول ان کے سمجھنے سے قاصر ہیں تو ان پر اس کا زور نہ دیا جاتا کہ وہ خواہ مخواہ ان کے ہم نوا بنیں۔دوسری وجہ جو پہلی وجہ سے بھی زیادہ سخت ہے، یہ ہے کہ عوام نے مسائل میں رائے زنی کو خواہ مخواہ اپنا مشغلہ بنالیا۔تو ان کو اہلِ علم کے اختلاف میں حکم بننے کی کیا ضرورت ہے کہ ان کے علمی ابحاث، ان کے علمی دلائل، سمجھنے کی اہلیت نہیں، لیکن اس میں محاکمہ اور فیصلے یہ حضرات (عوام) فرمانے لگیں۔حالانکہ ان کا کام یہ تھا کہ علمائے حق میں سے جس کے ساتھ حسنِ عقیدت ہو، تجربے سے اس کا دیندار، تجربہ کار اور اللہ والا ہونا ثابت ہو چکا ہو، اس کا اتباع کرتے، لیکن یہ تو جب ہوتا جب عمل مقصود ہوتا۔یہاں مقصود ہی نزاع ہے۔(الاعتدال)

اسی کو حضرت حکیم الملّت حضرت امیر شریعت قبلہ دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ مسلمان ایک دوسرے سے مختلف تو ہوسکتے ہیں، ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہوسکتے''۔ایک موقع پر یہ آپ نے یہ بھی فرمایا''اتحاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب اپنے اپنے نظریے اور خیالات چھوڑ کر ایک ہی رائے پر متفق ہوجائیں، بلکہ ہر فرقہ اپنے اپنے خیالات پر ثابت قدم رہتے ہوئے ملّی مسائل میں اتحاد، وحدت اور محبت کا مظاہرہ کرے۔اور یہ بھی فرمایا کہ ''مکتبِ فکر کو مکتبِ ذکر نہ بنائیں''

امت کو فروعی مسائل کے نزاعات سے نکالنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ اس کے حقیقی منصب پر امت کو گامزن کیا جائے اور بتایا جائے کہ فرضِ منصبی دعوت الی اللہ ہے، جب ملتِ اسلامیہ نے اپنے اصلی عہدے سے غفلت برتی تو اس کو شیطان نے داخلی کش مکش اور جزئی اختلافات میں الجھا کے رکھ دیا۔امت کو ایک شاہ راہ پر لانے والی واحد شئے اقامتِ دین اسلام اور اعلاء کلمۃ اللہ ہے۔اسی کو قرآن مجید میں فرمایا **شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْنَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖ اِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ** (الشوریٰ،۱۳) ترجمہ: اللہ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح علیہ السلام کو حکم دیا تھا، اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعے بھیجا ہے۔اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کو حکم دیا تھا وہ یہ ہے کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو، اس سے مراد دین کے اصول اور ضوابط ہیں۔جو تمام آسمانی شریعتوں اور انبیاء علیہم السلام کے صحیفوں میں مشترک ہیں۔اس دین کو پھیلانا اور اس کی دعوت دینا چاہیے۔مگر اس میں اختلاف اور تفریق کا شکار ہونا یہ حکمِ خداوندی کی خلاف ورزی ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے

ہیں کہ پس جس طرح شرائع سماویہ اور صحفِ انبیاء علیہم السلام فروعی اختلافات کے باوجود ایک ہی دین کہلائے، ایک کا مصدق دوسرے کا مصدق رہا، ان کے ماننے والے سب ایک رشتۂ اتحاد واخوت میں منسلک رہے، تحزب وتعصب اور بغض وعناد کی کوئی شان ان میں پیدا نہیں ہوئی۔ اور اسی لیے وہ ''کانوا شیعا'' کی حد (تعریف) میں نہیں آئے، اسی طرح ایک دین حنیف کے اندر فروعی اختلافات، اس کی شانِ اجتماع ووحدت میں خلل انداز نہیں ہوتے''۔

اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا'' مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الاِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهِ (رواہ احمد وابوداؤد) جس شخص نے جماعت مسلمین سے ایک بالشت بھی جدائی اختیار کی، اس نے اسلام کا حلقۂ عقیدت اپنی گردن سے نکال دیا۔ اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا'' شیطان انسانوں کے لیے بھیڑیا ہے، جیسے بکریوں کے گلے کے پیچھے بھیڑیا لگتا ہے تو وہ اسی بکری کو پکڑتا ہے جو اپنے گلے سے پیچھے یا ادھر ادھر رہ جائے اس لیے تمہیں چاہیے کہ جماعت کے ساتھ رہو، علاحدہ نہ رہو۔

نیز بڑے بڑے اختلافات کی بنیاد عموماً بدگمانی ہوتی ہے، جب کہ بدگمانی صاف قرآن وحدیث کی روشنی میں حرام ہے۔ اسی سلسلے میں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ حکیم اختر صاحب دامت برکاتہم نقل فرماتے ہیں کہ ہر بدگمانی پر قیامت کے دن مقدمہ چلے گا اور اس پر دلیل شرعی کا مواخذہ ہوگا، اور حسنِ ظن پر بدونِ دلیل اجر عطا فرمایا جائے گا۔ پس نہایت حماقت اور نادانی ہے کہ بدونِ دلیل مفت ثواب حاصل نہ کرے، اور بدگمانی پر دلیل کے مواخذہ میں خود کو گرفتار کرا دے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

کیا ماہِ صفر منحوس ہے......؟

صفر المظفر دوسرا قمری مہینہ ہے جو محرم کے بعد اور ربیع الاول سے پہلے آتا ہے، بعض ناواقف لوگ ماہِ صفر کے بارے میں یوں زبان درازی کرتے ہیں کہ ماہِ صفر کے کام صِفر (زیرو) ہوتے ہیں، اسی لیے بعض علاقوں میں ماہِ صفر میں شادی بیاہ اور پرمسرت تقاریب، دکان یا مکان کی افتتاح منعقد کرنے سے گریز کرتے ہیں اور یوں کہا کرتے ہیں کہ صفر کی شادی صِفر ہوتی ہے۔ حالانکہ اسلام میں کوئی ایسا مہینہ نہیں ہے جو اپنے اندر اس قسم کے عیوب ونقائص رکھے، سال کا ہر مہینہ اللہ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو منحوس سمجھنا اور منحوس کہنا یقیناً بدعقیدگی اور زبان درازی ہے۔

زمانہ جاهلیت میں ماہ صفر

زمانۂ جاہلیت میں صفر سے متعلق جہلائے عرب کے عجیب وغریب، من گھڑت اور بے اصل مختلف توہمات اور خیالات تھے، جن میں چند ہم پیش کرتے ہیں۔ ایک وہم اہل عرب کا یہ تھا کہ صفر سے مراد وہ سانپ ہے جو انسان کے پیٹ میں ہوتا ہے اور بھوک کی حالت میں انسان کو ڈستا ہے، چنانچہ بھوک کی حالت میں جو تکلیف محسوس ہوتی ہے وہ اسی کے ڈسنے سے ہوتی ہے۔ بعض جہلائے عرب کا عقیدہ یہ تھا کہ صفر سے مراد پیٹ کا وہ جانور ہے جو بھوک کی حالت میں بھڑکتا ہے اور جوش مارتا ہے اور یہ جانور جس پیٹ میں ہوتا ہے بسا اوقات اس کو جان سے بھی مار دیتا ہے، بعض جہلائے عرب صفران کیڑوں کو کہتے ہیں جو جگر اور پسلیوں کے سرے میں پیدا ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے انسان کا رنگ

بالکل پیلا پڑ جاتا ہے، جس کو طب کی اصلاح میں یرقان کہتے ہیں، بعض جہلائے عرب صفر کے مہینے سے بدفالی بھی لیا کرتے تھے۔

تاریخ کی کتابوں میں ہے کہ مشرکین عرب زمانہ جاہلیت میں ماہ صفر کی آمد کو منحوس خیال کرتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ ماہ صفر میں بلائیں اور مصیبتیں نازل ہوتی ہیں، جنگ کے شعلے بھڑکتے ہیں اور قتل و غارت گری اور خون ریزی کا بازار گرم ہوتا ہے، حالانکہ ماہِ صفر میں جنگ وجدال کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ ماہِ محرم حرمت والا مہینہ ہونے کی وجہ سے جنگ وجدال نہیں ہوتی تھی، تو جو جنگیں ماہ محرم میں ٹل جاتی تھیں وہ جنگیں ماہِ صفر میں ہی چھڑ جاتی تھیں، اسی خاص وجہ کی بناء پر یہ عقیدہ زمانہ جاہلیت کے جاہلوں میں پیوست ہوگیا کہ ماہِ صفر منحوس ہے اور بلاؤں کا مہینہ ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے **ولا صفر** فرما کر اس عقیدۂ باطلہ کی نفی فرمادی۔

ماہ صفر دورِ حاضر کے جاھلوں کی نظر میں

زمانہ جاہلیت کی طرح بلکہ اس سے بھی چند قدم آگے بعض ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات و توہمات جن کا حقیقت سے بال برابر تعلق نہیں ہے۔ یہ ایسے توہمات وخیالات ہیں جو اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہیں، عموماً لوگوں کے ذہن میں یہ بات پھنسی ہوئی ہے جو جلد نکل نہیں رہی ہے کہ صفر کا مہینہ منحوس اور نامبارک مہینہ ہے، چنانچہ ماہ صفر کے گذر جانے کے بعد یہ اپنی تقریبات شروع کرتے ہیں۔ بعض لوگ ماہ صفر کی پہلی تاریخ سے تیرہ تاریخ تک کے دنوں کو بطور خاص منحوس اور نامبارک خیال کرتے ہیں، ماہِ صفر بلاؤں یا مصیبتوں کا مہینہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ کامیابی اور خیر کا مہینہ ہے، اس کو ماہِ صفر اور ماہِ ظفر قرار دیا گیا ہے۔

آخری چہار شنبہ:۔ بعض لوگ خاص کر دیہاتی (اگر شہری لوگوں کو بھی شامل کرلیں تو مبالغہ

نہ ہوگا) ماہِ صفر کے آخری چہار شنبہ کو ایک عید مناتے ہیں، عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی طرح ''آخری چہار شنبہ'' بھی ان کے نزدیک عید کا دن ہے، اس دن نئے کپڑے پہنتے ہیں اور مزدوروں کو چھٹی بھی دی جاتی ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ اس دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحت کا غسل فرمایا تھا، اس خوشی میں وہ عید مناتے ہیں، حالانکہ ماہِ صفر کے آخری ایام تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کے ایام ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات کی ابتداء ہوئی تھی، بعض لوگ ان دنوں گھروں میں اگر مٹی کے برتن ہوں تو ان کو توڑ دیتے ہیں اور اسی دن بعض لوگ چاندی کے چھلے بنوا کر اس دن کی نحوست سے بچنے کے لیے لوگوں کو دیتے ہیں اور اپنے جیب بھرنے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔

بعض علاقوں میں اس دن مرد اور عورت پردہ اور حیا کو بلائے طاق رکھ کر میدانوں اور تفریحی مقامات کو چلے جاتے ہیں، ان کے خیال کے مطابق اس دن یہ ضروری ہے کہ آدمی ہری گھاس پر چلے اور وہاں پہنچ کر جھولا جھولتے ہیں اور ہنسی مذاق کرتے ہیں اور خوشی خوشی شام کو واپس ہو جاتے ہیں۔

اسلام میں آخری چہار شنبہ کی کوئی فضیلت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی ان توہمات اور خرافات سے حفاظت فرمائے اور دین میں نئی چیزیں پیدا کرنے سے بھی حفاظت فرمائے۔ آمین

مطبوعہ

روزنامہ سالار 11/04/2003

روزنامہ سیاست 04/04/2003

روزنامہ پاسبان 3/04/2003

عاشوراء کا روزہ

حدیث کی روشنی میں

صوم عاشوراء کی حقیقت

عَنِ ابن عباس ؓ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ لَمَا قَدِمَ الۡمَدِیۡنَۃَ وَجَدَھُمۡ یَصُوۡمُوۡنَ یَوۡماً یَعۡنِی عَاشُوۡرَاءَ فَقَالُوا ھٰذا یَوۡمٌ عَظِیۡمٌ وَھُوَ یَوۡمٌ نَجّی اللّٰہُ فِیۡہِ مُوسیٰ وَاَغۡرَقَ آلَ فِرۡعَوۡنَ ، فَصَامَ مُوۡسیٰ شُکرا لِلّٰہِ فَقَالَ أنَا أوۡلیٰ بِمُوۡسیٰ مِنۡھُمۡ فَصَامَہٗ وَأمَرَ بِصِیَامِہٖ . (صحیح البخاری ۳۰۴۵)

ترجمہ: حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو آپ نے یہودیوں کو اس دن یعنی یوم عاشورا کو روزہ رکھتے ہوئے پایا۔ یہودیوں نے کہا کہ یہ بہت عظمت والا دن ہے اس دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے نجات عطا فرمائی اور فرعون کو اس کے لشکر سمیت غرق کیا۔ اللہ کی اس عظیم نعمت کے شکر کے طور پر حضرت موسیٰ نے اس دن روزہ رکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ موسیٰ کے سلسلے میں تم سے زیادہ ہم حق رکھتے ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم عاشوراء کو روزہ رکھا اور صحابہ کو بھی اس دن روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔ (صحیح البخاری)

اسلامی سال کا پہلا مہینہ :

اسلامی سال کی ابتداء محرم الحرام سے ہوتی ہے۔ یہ مہینہ ابتداء ہی سے حرمت والا اور

قابلِ احترام قرار دیا گیا ہے۔اس مہینے میں بہت سے اہم واقعات کی رونمائی نے اس مہینے کی اہمیت کو بڑھادی ہے۔اس مہینہ کی دسویں تاریخ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔اس لئے کہ تاریخ کی کتابوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کواسی دن دنیا میں بھیجا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرعون سے اسی دن نجات دی۔خدا کا خاص فضل رہا حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شہادت کے لئے بھی اسی دن کو منتخب فرمایا۔

نعمت خداوندی پر شکر :

یوم عاشوراء چونکہ اللہ کی خاص نعمتوں کے حصول کا دن رہا ہے اس لئے اس دن میں روزہ رکھ کر اللہ کا شکر ادا کرنا باعث ثواب قرار دیا گیا۔جیسا کہ بیان کردہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نجات اور فرعون کے غرق ہونے کی وجہ سے جو روزہ کی عادت یہودیوں نے اختیار کی تھی اس کی توثیق فرمائی، اور فرمایا کہ روزہ رکھنے کے ہم زیادہ حقدار ہیں۔اس لئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی انبیاء کی اس مقدس جماعت کے جلیل القدر پیغمبر ہیں جس کی آخری کڑی اور خاتم النبیین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ نعمت کے شکریہ کے طور پر بندوں کو اللہ کے سامنے عبدیت کے اظہار کے لئے عبادت کرنا چاہئے۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام سے بھی یہی فرمایا تھا کہ ﴿اِعْمَلُوا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا﴾۔اے آل داؤد عمل کرو شکر کے طور پر۔یعنی شکر گذاری کے طور پر عبادت کرو۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ سے یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فضل خداوندی کے حصول کے لئے یوم عاشوراء کو رمضان کی طرح اہمیت کے ساتھ اہتمام فرماتے تھے۔عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِيْ زَيْدٍ سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ يَقُوْلُ مَا عَلِمْتُ

رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَتَحَرّٰی یَوْماً کَانَ یَبْتَغِیْ فَضْلَہٗ عَلٰی غَیْرِہٖ اِلَّا ھٰذَا الْیَوْمَ یَوْمَ عَاشُوْرَاءَ وَ شَھْرَ رَمَضَانَ (ابن ماجة ۲۷۰۹)

عاشوراء کے روزہ کی فضیلت :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ عمل (یعنی آپ کا یوم عاشورا کو فضل خداوندی کے حصول کے لئے تلاش کرنا) ہی ایک مسلمان کے لئے اس بات کی دلیل ہے کہ یوم عاشوراء کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں روزہ رکھے۔ اس لئے کہ اللہ کی رضا آپ علیہ الصلاۃ والسلام کی اتباع میں حاصل ہوتی ہے جو کہ مقصود زندگی ہے۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ انسانی طبیعت کا میلان انعام واکرام کی طرف زیادہ ہوتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روزہ کی فضیلت بھی بیان فرمائی ہے۔ فرمایا صِیَامُ یَوْمَ عَاشُوْرَا اَحْتَسِبُ عَلَی اللّٰہِ اَنْ یُّکَفِّرَ السَّنَۃَ الَّتِیْ قَبْلَہٗ (ترمذی ۶۸۳) ''یوم عاشورا کا روزہ، مجھے اللہ کی ذات سے یقین ہے کہ پچھلے ایک سال کے گناہ فرمائے گا''۔ اس دور میں ہم مسلمانوں کا کوئی دن ایسا نہ گذرتا ہوگا جس میں گناہ نہ کیا ہو۔ یہ اللہ کی شان کریمی ہے کہ بندوں کو ایسا موقع فراہم کیا جس میں بندوں کو اپنے فضل خاص کے ذریعہ سے ایک چھوٹی سی عبادت کے بدلے میں ایک سال کے گناہ معاف فرمادیتے ہیں۔ اگر چہ علماء نے اس کی صراحت فرمائی ہے کہ گناہوں کی معافی سے مراد صغیرہ گناہوں کی معافی ہے، لیکن اس امر سے کسی کو اختلاف بھی نہیں ہے کہ اللہ جس کے کبائر بھی معاف فرمانا چاہے تو معاف فرمادیں گے۔

دیگر اقوام کی مشابہت :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مَنْ تَشَبَّـہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ جو

شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے تو وہ انہیں میں سے ہے۔اس حدیث کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان یہود ونصاریٰ کی اتباع نہ کرے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے ادباً یہ عرض کیا تھا کہ یارسول اللہ یہ دن تو یہودی تعظیم کرتے ہیں اور خوشیاں مناتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب بات ایسی ہے تو آئندہ سال ہم نو ویں محرم کو بھی روزہ رکھیں گے۔راوی فرماتے ہیں کہ دوسرا سال آنے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے پردہ فرما گئے۔

سَمِعْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ يَقُوْلُ حِيْنَ صَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ وَاَمَرَ بِصِيَامِهِ قَالُوا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّه يَوْم تَعَظَّمَهُ الْيَهُوْدُ وَالنَّصارىٰ . فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِذَا كَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ صُمْنَا الْيَوْمَ التَّاسِعَ قَالَ فَلَمْ يَأْتِ الْعَامُ الْمُقْبِلُ حَتىٰ تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (مسلم ۱۹۱۶)

سابق پیغمبروں کی تعظیم : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے پچھلے تمام پیغمبروں کی تصدیق کرنے والا بنا کر مبعوث فرمایا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی تعلق کا اظہار اس حدیث میں اس جملہ سے فرمایا **نَحْنُ اَحَقُّ بِمُوْسىٰ مِنْكُمْ** ۔کہ موسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں ہم تم سے زیادہ حقدار ہیں۔موسیٰ علیہ السلام کے نجات کی خوشی منانے کے ہم زیادہ حقدار ہیں، اس لئے کہ جس مقدس جماعت انبیاء کی اہم کڑی موسیٰ ہیں اسی کے خاتم النبیین ہیں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم۔

ایک اہم نکتہ : اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ایک اہم اور بہت ہی اہم نکتہ یہ نکلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشی کے اظہار

کے لئے جوطریقہ اختیار فرمایا وہ دنیا والوں کے اور دیگر اقوام کے طریقے سے بالکل مختلف ہے۔ دیگر اقوام میں خوشی سے مراد ناچ گانا ہوتا ہے، ہنگامہ آرائی کی مختلف شکلوں سے لوگ خوشی کا اظہار کرتے ہیں لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ بندۂ مؤمن عبادت کی زیادتی سے اپنی روح کو خوشی پہنچاتا ہے اس لئے کہ روح کی غذا عبادت ہی ہے، ساتھ ہی ساتھ ان ارواح کو بھی خوشی ہوتی ہے جن کے توسط سے یہ روزہ رکھا گیا ہے۔

صرف خوشی کے موقع پر ہی نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شدید آزمائش کے موقع پر بھی امت مسلمہ کو یہ تعلیم دی کہ نوحہ خانی اور واویلا مچانے کے بجائے عملی زندگی کو سدھار کر آگے بڑھنے کی مثبت سوچ اختیار کرنا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اکلوتا نرینہ لڑکا حضرت ابراہیمؑ کی وفات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی ارشاد فرمایا تھا کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور دل غمزدہ ضرور ہے لیکن ہم وہی کہیں گے جو ہمارے پروردگار نے فرمایا۔ بڑی ناداں سمجھی جائے گی وہ قوم جو دشمن پر غصے کا اظہار خود اپنی جان و مال کی ہلاکت کے ذریعہ سے کرنے لگے۔

موجودہ دور میں نکاح بوجھ کیوں؟

نکاح کی اہمیت: ایک فطری حقیقت ہے کہ عفت وعصمت اور شرم وحیا انسانیت کی جان ہے انسان کی عزت اور اس کا وقار اس کی عزت وعصمت پر موقوف ہے یہی وہ صفت ہے جس سے انسان ہر قسم کی برائیوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اسی لئے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا اِذَا لَمْ تَسْتَحِیْ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ جب تم حیاء نہ کرو جو چاہے کرو۔

عفت وعصمت کو چاک کرنے میں عموماً نفسانی خواہشات ہی ذریعہ بنتے ہیں اسی لئے اسلام نے خواہشات نفس کے بارے میں اعتدال کو پسند فرمایا اور اخلاقی حدود کو سامنے رکھتے ہوئے باقاعدہ طور پر نکاح کرنے کا حکم دیا فَانْکِحُوا مَا طَابَ لَکُمْ مِنَ النِّسَاءِ الخ جبکہ دیگر مذاہب نے یا تو تفریط سے کام لیا یا افراط کا شکار ہوگئے اس قسم کی ناپاک مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

ایک دفعہ بعض صحابہ کرام کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دینی زندگی اور روحانی واخلاقی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ وہ دنیاوی اور مادی تعلقات سے کنارہ کش ہوجائیں، صحابہ ءکرام کے ان خیالات کی اطلاع نبیٔ رحمت ﷺ کو ہوئی تو آپ ﷺ نے ان کے ان راہبانہ خیالات کو سخت ناپسند فرمایا اور اعلان فرمایا کہ رہبانیت طریقۂ نبوت اور دینِ اسلام کے خلاف ہے نیز آپ نے یہ بھی فرمادیا کہ اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّی (بخاری ومسلم) نکاح میری سنت ہے جو شخص

اس سے منہ موڑتا ہے اور میرے طریقے سے روگردانی کرتا ہے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔

نکاح انبیائے کرام علیھم السلام کی ایک ایسی سنت ہے جس کا سلسلہ بدستور چلا آیا ہے اور قیامت تک یہ سلسلہ چلے گا یہی وہ نکاح ہے جس کے ذریعہ دو اجنبی خاندان ایک ہو جاتے ہیں، اسی نکاح کی بنیاد پر کئی مرد و عورت چھوٹے بڑے مالدار و غریب بغیر کسی امتیاز کے ایک ہی صف میں داخل ہو جاتے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ سب ایک دوسرے سے خوش خلقی محبت و الفت ہمدردی و غمگساری کا برتاؤ کرتے ہیں اگر یہ کہا جائے تو یقیناً مبالغہ نہ ہوگا کہ انسانوں کو آپس میں ملانے والا سب سے بڑا سلسلہ دنیا میں نکاح ہی ہے۔

منگنی اور استخارہ: اب سوال یہ ہے کہ اگر کوئی کسی سے نکاح کرنا چاہے تو اس کی ابتدا کس طرح ہو ظاہر ہے کہ نکاح کا مطلب ایک مرد اور عورت کا زندگی بھر ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گذارنا ہے یہ کوئی وقتی مسئلہ نہیں ہے کہ جس کو یوں ہی طے کر دیا جائے بلکہ یہ ایک مضبوط معاہدہ ہے اس لئے اسلام نے اس ابدی تعلق کو قائم رکھنے کے لئے سب سے پہلی تعلیم یہی دی کہ ایک ایسی چیز کو پیش نظر رکھا جائے جو خود بھی ابدی ہو اور وہ ہے دینداری۔

جس طرح نکاح کا یہ رشتہ دائمی ہے، اسی طرح ایمان بھی دائمی ہے اسی لئے جب کوئی کسی سے نکاح کرے گا تو انتخاب کے موقع پر دین ہی کو بنیاد بنا کر رشتہ کرے گا، مذہب اسلام میں شادی کا پیغام دینے کی آسان شکل اور سادہ صورت یہی ہے کہ جس عورت سے کسی مرد کا یا جس مرد سے کسی عورت کا رشتہ کیا جا رہا ہو ان کی شکل وصورت مال

ودولت خاندان دین واخلاق کے بارے میں ان کے سر پرست یا خود لڑکا لڑکی معلومات فراہم کرلیں تاکہ بعد میں افسوس نہ ہو اور تحقیق نہ کرنے کا اثر آپسی تعلقات پر نہ پڑے۔

استخارہ بھی کر لیجئے : جس اہم کام کا ارادہ کرلیا جائے تو اس سے پہلے استخارہ کرلینا بہتر ہے چونکہ نکاح بھی ایک اہم معاملہ ہے اس لئے نکاح کے لئے بھی استخارہ کرلینا چاہئے حضرت زینبؓ کو حضور اقدس ﷺ نے نکاح کا پیغام دیا تو حضرت زینب نے عرض کیا نہیں میں ابھی نکاح کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی جب تک کہ اپنے رب سے مشورہ نہ کرلوں اور پھر حضرت زینب نے استخارہ فرمایا۔

رہبرِ اعظم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اسی لئے فرمایا کہ اگر تمہارے پاس ایسا شخص آئے جس کے اخلاق اور دینداری تم کو پسند آئے تو تم اپنی لڑکی کا نکاح اس سے کردو ورنہ زمین میں فتنہ وفساد پھیلے گا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا واقعہ بھی اس مسئلہ کے لئے دلیل بن سکتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک خاتون کے لئے نکاح کا پیام دیا (پیام دینے کا ارادہ کیا) تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے اس کو دیکھا ہے میں نے عرض کیا کہ میں نے دیکھا تو نہیں ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا ایک نظر دیکھ لو یہ اس مقصد کے لئے زیادہ مفید ہوگا کہ تم دونوں میں الفت اور محبت اور خوشگواری رہے گی (ترمذی مسند احمد) اور ابنِ ماجہ میں تو پیامِ نکاح سے متعلق پیغام رسول ﷺ واضح انداز میں موجود ہے جس کے راوی حضرت محمد بن مسلمہؓ ہیں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی آدمی کے دل میں کسی عورت کے لئے نکاح کا پیام دینے کا خیال ڈالے تو اس کے واسطے گناہ نہیں کہ ایک نظر اس کو دیکھ لے۔

نکاح کا اعلان: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا نکاح کا اعلان کیا کرو اور نکاح مسجدوں میں کیا کرو اور دف بجایا کرو، ہ نکاح چوری چھپے کرنے میں کئی قسم کی نامناسب باتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور طرح طرح کے مفاسد کا خطرہ ہوتا ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ نکاح علی الاعلان کیا جائے اور اسکی سب سے بہتر مفید اور آسان شکل یہی ہے کہ مسجد میں کسی نماز کے بعد اعلان کر دیا جائے اس سے ایک طرف مسجد کی برکت بھی حاصل ہوگی اور لوگوں کو جمع کرنے میں جو عموماً دشواریاں پیش آتی ہیں وہ دشواریاں بھی نہ ہونگی اور نمازیوں کی ایک مجلس ہی اس کے نکاح کی گواہ رہے گی اور اعلانِ نکاح کی غرض یہی ہے کہ مرد عورت کے درمیان ہر قسم کے خفیہ تعلقات کی جڑ کٹ جائے اور چونکہ حضور ﷺ کے زمانے میں نکاح اور شادی کی تقریب کے موقع پر دف بجانے کا رواج تھا جس سے اس خوشی کے موقع پر تفریح کا کچھ سامان بھی ہو جاتا تھا اس لئے آپ ﷺ نے دف بجانے کی اجازت دی۔

مہر کی حقیقت : نکاح کرنے والا مرد اپنی بیوی کو جو معین رقم ادا کرتا ہے اس کو مہر کہتے ہیں زمانۂ جاہلیت میں بھی عربوں میں یہ شریفانہ رواج قائم تھا کہ نکاح کرنے والا مرد اپنی بیوی کو ایک معین رقم ادا کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتا تھا۔ اس طریقہ کو اسلام نے نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اسک کو لازم بھی قرار دیا شوہر کا اپنی بیوی کو مہر کی رقم دینا اس کی اس بات کی علامت ہے کہ وہ اس بیوی کا طالب اور خواستگار رہے بیویوں کے حقوق میں سب سے پہلا حق مہر ہے جو شوہر کے ذمہ لازم ہوتا ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک مہر کی رقم کم سے کم مقدار دس درہم (تقریباً دو تولے ساڑھے سات ماشے چاندی) ہے اور زیادہ مہر کی کوئی مقدار مقرر نہیں، حسبِ حیثیت جتنا مہر چاہے رکھ سکتے ہیں۔ شریعت نے مہر کی کوئی خاص مقدار متعین نہیں فرمائی

اس کی وجہ ظاہر ہے ہر ایک کی حالت ایک سی نہیں ہوتی بلکہ ہر ایک کی گنجائش اور وسعت جداگانہ ہوتی ہے حضور اکرم ﷺ کا عمل اس بارے میں یہ رہا کہ آپ نے اپنی صاحبزادیوں کا مہر پانچ سو درہم مقرر فرمایا نیز آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کا مہر بھی اتنا ہی تھا لیکن اتنی ہی مقدار کی پابندی نہیں تھی اس معاملے میں جس اہم پہلو پر نظر رکھنی چاہئے وہ یہ ہے کہ مہر کے معنی صرف مہر مقرر کرنے کے نہیں ہیں بلکہ مہر مقرر کرنے کے بعد اس کا ادا کرنا بھی لازمی ہے اس کا مطلب یہ نکلا کہ اگر مہر فوراً نہ دیا جائے تو یہ قرض کی طرح ہے کہ سہولت ملنے پر اس کا ادا کرنا لازمی ہے ہاں اگر بیوی خود ہی وصول نہ کرے اور معاف کر دے تو دوسری بات ہے۔ قرآن مجید میں مہر دینے کا حکم صراحتاً موجود ہے واٰتو النِسَاءَ صَدَقَاتِهِنَّ نِحْلَةً (النساء) اپنی بیویوں کے مہر خوشدلی سے ان کو ادا کرو۔

میمون کردیؓ اپنے والد سے روایت کرتی ہیں کہ وہ بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے کسی عورت سے کم یا زیادہ مہر پر نکاح کیا اور اس کے دل میں اس حق مہر کی ادائیگی کا ارادہ ہی نہیں ہے تو قیامت میں اللہ کے حضور وہ زنا کار کی حیثیت سے پیش ہوگا۔

جو لوگ یہ سمجھ کر مہر کے ادا کرنے کو ٹال دیتے ہیں اور مہر بے حساب مقرر کر لیتے ہیں کہ دینا دلانا کس کو ہے؟ جب دینا ہی نہیں ہے تو پھر کم اور زیادہ سے کیا فرق پڑتا ہے انہیں یہ حدیث بار بار پڑھنی چاہئے اور حقیقت حال سے باخبر ہو کر توبہ کرنا چاہئے اور اگر اب تک مہر ادا نہیں کیا ہے تو فوراً ادا کرنا چاہئے مہر کا معاملہ زبانی جمع خرچ یا رسمی معاہدہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک حق ہے اگر ادا نہ کیا گیا تو شوہر حق تلفی کرنے والا شمار ہوگا اور بیوی اپنے حق سے محروم مظلومہ ہوگی اور ظالم کو اس کے ظلم کی سزا قیامت کے دن بھگتنی پڑے گی۔

جہیز کی رسم: شادی کے موقع پر اسلام مرد پر مہر کی ادائیگی ولیمہ کے اخراجات کا بوجھ ڈالتا ہے اور اس کے مقابلے میں عورت پر ایسی کوئی ذمہ داری نہیں اس لئے کہ عورت مرد کے مقابلہ میں کمزور پیدا کی گئی ہے اس لئے اس پر کوئی معاشی ذمہ داری نہیں ہے۔آج کل باقاعدہ جہیز کے سامان کی نمائش کی جانے لگی ہے اور لوگ بھی شادی کا پیغام دینے سے پہلے یہ دیکھنے لگے ہیں کہ کہاں سے کتنی دولت مل سکتی ہے اور جب ایسے لوگوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ جہیز کی مانگ کیوں کرتے ہو تو پر اعتماد لہجے میں یہ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی تو جہیز دیا ہے جہیز دینا بھی تو سنت ہے حالانکہ حضور ﷺ نے حضرت فاطمہ ؓ کے علاوہ اور کسی کو جہیز دیا ہو اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اور جو کچھ حضور ﷺ نے حضرت فاطمہ ؓ کو دیا تھا اس کی وجہ یہی تھی کہ حضرت علی ؓ کی پرورش اور تعلیم وتربیت بھی رسول اللہ ﷺ کے گھر پر آپ ہی کی نگرانی میں ہوئی تھی اور جب آپ ؓ جوان ہوئے تو حضرت فاطمہ سے آپ کا نکاح ہوا۔اس وقت حضرت علیؓ کا نہ اپنا کوئی مکان تھا اور نہ ہی ان کے پاس کوئی گھریلو سامان تھا شادی کے موقع پر ایک صحابی نے آپ کو ایک مکان رہائش کے لئے دے دیا تھا،اب ظاہر ہے کہ خالی مکان میں دلہن کو لے جا کر بٹھایا نہیں جاسکتا تھا اس لئے رخصتی کے وقت کچھ گھریلو سامان حضرت فاطمہ کو دے دیا۔جہیز کے نام پر خوش حال لوگوں کا لاکھوں روپیوں کی مالیت پر مشتمل سامان آرائش دینا یقیناً غریب گھرانوں کی لڑکیوں کی شادی کی محرومی کا ذریعہ ہے اس طرح غریب لڑکیاں بن بیاہی رہ جائیں گی۔اور یہ ایک طرح ظلم ہے اور اسلام ظلم کو پسند نہیں کرتا بلکہ اسلام دنیا میں ایک ایسا صالح معاشرہ وجود میں لانا چاہتا ہے جس میں ہر شخص کو عدل وانصاف حاصل ہو کسی ایک فرد پر بھی ظلم وجبر نہ ہو۔

ویڈیوگرافی ایک ناسورآج کل شادی وولیمہ کی تقریبوں میں ویڈیوگرافی کا سلسلہ زوروں پر چل پڑا ہے وہ لوگ جو اپنی شادی کے رقعوں پر اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ جیسی حدیثیں بڑے اہتمام سے لکھتے ہیں وہ بھی ان تقریبوں میں ویڈیوگرافی میں مبتلا ہیں، اورآج کل اس کوایک ضرورت کی چیز بنالیا گیا ہے ویڈیوگرافی کے بارے میں شریعت کے احکامات یہی ہیں کہ بلاضرورت شرعی تصویر کھینچنا کھنچوانا دونوں کبیرہ گناہ ہیں، بلکہ حرام!

اللہ تعالی کے نزدیک تصویرکشی کرنے والا عذاب کا مستحق ہے (بخاری) آج کل لوگوں کے اندر یہ احساس ہی مردہ ہوچکا ہے۔ وہ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ جس مبارک ومسنون نکاح کی مجلس میں ہم بیٹھے ہیں اِتَّقُوا اللّٰہَ والی آیتوں کے ذریعہ باربارتقوی اختیارکرنے کا حکم دیاجارہاہے وہیں اللہ تعالی سے نہ ڈرنے کے مناظر پیش کئے جارہے ہیں۔ قاضی صاحب خطبہ نکاح پڑھ رہے ہیں اور اللہ کا کلام پڑھ رہے ہیں جس کا سننا واجب اور باعثِ ثواب ہے اسی مجلس میں ویڈیوگرافی ہورہی ہے۔ بات تقوی کی عمل خلافِ تقوی ہورہاہے اور ایمان کی کمزوری اس قدر ہے کہ دولہا یا سرپرست روک نہیں سکتے نہ مدعوحضرات اور نہ ہی اس مجمع میں موجود دیندار حضرات روک سکتے ہیں، سب کی زبانیں خاموش ہیں!

نکاح کو آسان بنائیے : دنیا کا اصول یہ ہے کہ جو چیز جتنی اہم اور ضروری ہوتی ہے اس چیز کے حاصل کرنے کی آسان تدبیریں کی جاتی ہیں اور ہرآدمی یہی چاہتاہے کہ ہرچیز بہ آسانی حاصل ہوجائے چونکہ فطری جذبات کی وجہ سے ہرمرداور عورت کے لئے نکاح ایک اہم ضرورت ہے لہٰذا عقلمندی کا تقاضا یہی ہے کہ اس اہم

ضرورت کو مشکل بنانے کے بجائے سہل ترین بنانے کی عملاً کوشش ہر جانب سے کی جائے۔

لیکن صد ہزار افسوس کہ یہ دور جیسے جیسے دورِ رسالت مآب ﷺ سے دور، قیامت سے قریب ہوتا جارہا ہے اسی قدر اس اہم مسئلہ کو پیچیدہ بنایا جارہا ہے حالاں کہ نبی رحمت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اَعْظَمُ النِّکَاحِ بَرْکَۃً اَیْسَرُہٗ مَؤُنَۃً (بیہقی) وہ نکاح بہت بابرکت ہے جس کا بوجھ کم سے کم پڑے۔

جو لوگ نکاح کو مشکل بنالیتے ہیں وہ یقیناً برکتوں سے محروم ہوجاتے ہیں آج ہم جن الجھنوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہیں اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ جو ہدایات آپ ﷺ نے ہمیں دیں، ہم ان سے منہ موڑ کے آسمانی برکات اور خداوندی عنایات سے محروم ہوگئے ہیں اللہ تعالی ہم سب کو دین پر چلنا آسان فرمائے نفسانی خواہشات سے اور شیطان کی اتباع کرنے سے ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

مہر کی شرعی حیثیت

حق مہر۔ بیویوں کے حق میں سب سے پہلا حق مہر ہے، جوشوہر کے ذمہ لازم ہوتا ہے۔ یوں تو کوئی نکاح بغیر مہر کے نہیں ہوتا؛ اس کے بارے میں بہت سی کوتاہیاں اور بے احتیاطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ ان کو یہاں ذکر کر رہے ہیں اللہ تعالی ہم سب کو ان کوتاہیوں اور بے احتیاطیوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے اور سو فی صد حضور پاک ﷺ کے نورانی ومبارک طریقوں پر عمل کرنے کی ہمت وتوفیق عطا فرمائے (آمین)۔

جب مسلمان فیصلہ کر لیتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کو راضی کر کے زندگی گذارنی ہے، اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلے میں رواج، معاشرہ، برادری، قوم؛ کسی کو نہیں دیکھنا، صرف اور صرف پاک پروردگار کے حکم کو دیکھنا ہے اور حضور پرنور ﷺ کو دیکھ کر ان کے موافق زندگی گذارنی ہے۔ سارے خاندان والوں میں، اپنی قوم میں، محبت اور حکمت کے ساتھ ایسی محنت کرنی ہے جس سے مسلمانوں کی شادیوں میں اور زندگی کے تمام مراحل میں سو فیصد سنتیں زندہ ہو جائیں، تو اللہ تعالیٰ ایسے مسلمان کی مدد فرماتے ہیں اور اس کو ہدایت کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس کے ہر عمل سے سنتیں زندہ ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضور ﷺ کی سنتوں پر زندہ رکھے اور اسی پر موت عطا فرمائے۔

(۱) ایک کوتاہی لڑکی کے والدین اور اس کے عزیز واقارب کی جانب سے ہوتی ہے کہ مہر مقرر کرتے وقت لڑکے کی حیثیت کا لحاظ نہیں رکھتے، بلکہ زیادہ سے زیادہ مقدار مقرر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بسا اوقات اس میں جھگڑے کی شکل بھی پیدا ہو جاتی

ہے بلکہ اس سے بڑھ کر بعض موقعوں پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اسی جھگڑے میں شادی رک جاتی ہے لوگ زیادہ مہر مقرر کرنے کو فخر کی چیز سمجھتے ہیں لیکن یہ جاہلیت کا فخر ہے، جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے، ورنہ اگر مہر کا زیادہ ہونا شرف وسیادت کی بات ہوتی تو حضور پاک ﷺ کی ازواج مطہرات اور آپ ﷺ کی صاحبزادیوں کا زیادہ مہر ہوتا، حالانکہ آپ ﷺ نے اپنی کسی بیوی کا اور کسی صاحبزادی کا مہر پانچ سو درہم سے زیادہ مقرر نہیں کیا۔ پانچ سو درہم کی ایک سو اکتیس تولے تین ماشے چاندی بنتی ہے، اگر چاندی کا بھاؤ پچاس روپیہ تولہ ہو تو پانچ سو درہم یعنی ایک سو اکتیس تولے چاندی کے چھ ہزار پانچ سو تریسٹھ روپے بنتے ہیں۔ (قیمت کی کمی بیشی کے مطابق اس مقدار میں کمی بیشی ہوسکتی ہے، بہر حال ایک سو اکتیس تولے چاندی کا حساب رکھنا چاہئے) اسی کو مہر فاطمی کہا جاتا ہے۔ بعض اکابر کا معمول رہا ہے کہ اگر ان سے نکاح پڑھانے کی فرمائش کی جائے تو فرماتے ہیں کہ اگر مہر فاطمی رکھو تو نکاح پڑھائیں گے ورنہ کسی اور سے پڑھوالو۔

الغرض مسلمانوں کے لئے آنحضرت ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہی لائق فخر ہونا چاہئے اور مہر کی مقدار اتنی رکھنی چاہئے جتنی آپ ﷺ نے اپنے مقدس ازواج مطہرات اور پیاری صاحب زادیوں کے لئے رکھی۔ آپ ﷺ سے بڑھ کر کس کی عزت ہے؟ گو اس سے زیادہ مہر رکھنے میں بھی کوئی گناہ نہیں، لیکن زیادتی کو فخر کی چیز سمجھنا اس پر جھگڑے کھڑے کرنا اور باہمی رنجش کی بنیاد بنالینا جاہلیت کے جراثیم ہیں، جن سے مسلمانوں کو بچنا چاہئے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم یعنی بیس تولے ساڑھے سات ماشے چاندی ہے۔ جس کے آج کے حساب سے تقریباً دوسو روپے بنتے ہیں اور اس سے کم مہر مقرر کرنا صحیح نہیں۔ اور اگر کسی نے اس سے کم مقرر کرلیا تو دس درہم کی مالیت مہر واجب ہوگا۔

(۲) ایک زبردست کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ مہر ادا کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی بلکہ رواج یہی بن گیا ہے کہ بیویاں حق مہر معاف کردیا کرتی ہیں۔ یہ مسئلہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ بیوی کا مہر بھی شوہر کے ذمہ اسی طرح کا ایک قرض ہے جس طرح دوسرے قرض واجب الاداء ہوتے ہیں یوں تو اگر بیوی کل مہر یا اس کا کچھ حصہ شوہر کو معاف کردے تو صحیح ہے لیکن شروع ہی سے اس کو واجب الادا نہ سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص نکاح کرے اور مہر ادا نہ کرنے کی نیت رکھتا ہو وہ زانی ہے۔

(۳) ہمارے معاشرے میں جو اور بہت سی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ عورتوں کے لئے مہر لینا بھی عیب سمجھا جاتا ہے اور میراث کا حصہ لینا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے اس لئے وہ مجبوراً معاف کردینا ہی ضروری سمجھتی ہیں۔ دیندار طبقے کا فرض ہے کہ اس معاشرتی برائی کو مٹائیں اور لڑکیوں کو مہر بھی دلوائیں اور میراث کا حصہ بھی دلوائیں اگر وہ معاف کرنا چاہیں تو ان سے کہہ دیا جائے کہ وہ اپنا حق وصول کرلیں اور کچھ عرصہ تک اپنے تصرف میں رکھنے کے بعد اگر چاہیں تو واپس لوٹا دیں اس سلسلے میں ان پر قطعاً جبر نہ کیا جائے۔

(۴) مہر کے بارے میں ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ اگر بیوی مر جائے اور اس کا مہر ادا نہ کیا گیا ہو تو اس کو ہضم کر جاتے ہیں، حالانکہ شرعی مسئلہ یہ ہے کہ اگر خانہ آبادی سے میاں بیوی کی یکجائی سے پہلے بیوی کا انتقال ہو جائے تو نصف مہر واجب ہوگا اور اگر میاں بیوی کی خلوتِ صحیحہ کے بعد اس کا انتقال ہوا ہو تو پورا مہر ادا کرنا واجب ہوگا اور یہ مہر بھی اس کے ترکے میں شامل ہو کر اس کے شرعی ورثہ پر تقسیم ہوگا۔

بعض مقامات پر ایسا ہوتا ہے کہ اگر لڑکی کا انتقال سسرال میں ہو تو اس کا سارا اثاثہ

ان کے قبضے میں آجاتا ہے اور وہ لڑکی کے وارثوں کو کچھ نہیں دیتے اور اگر اس کا انتقال میکے میں ہو تو وہ قابض ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور شوہر کا حق دینے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ حالانکہ مردے کے مال پر ناجائز قبضہ جمالینا بڑی گری ہوئی بات بھی ہے۔ اور ناجائز مال ہمیشہ نحوست اور بے برکتی کا سبب بنتا ہے بلکہ بعض اوقات دوسرے مال کو بھی ساتھ لے ڈوبتا ہے۔ اللہ تعالیٰ عقل اور ایمان نصیب فرمائے اور جاہلیت کے غلط رسوم ورواج سے محفوظ رکھے۔

مہر کے متعلق احادیث میں کئی تفصیلات آئے ہیں مثلاً:

حضرت ابوسلمہؓ کہتے ہیں کہ میں نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت ﷺ کا مہر (اپنی ازواج مطہرات کے لئے) کتنا تھا؟ فرمایا ساڑھے بارہ اوقیہ اور یہ پانچ سو درہم ہوتے ہیں۔ (صحیح مسلم، مشکوٰۃ ص ۲۷۷)

حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ دیکھو عورتوں کے مہر زیادہ نہ بڑھایا کرو کیونکہ یہ اگر دنیا میں عزت کا موجب اور اللہ تعالےٰ کے نزدیک تقوے کی چیز ہوتی تو نبی کریم ﷺ تم سے زیادہ اس کے مستحق تھے۔ مجھے علم نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی سے بارہ اوقیہ سے زیادہ پر نکاح کیا ہو یا اپنی صاحبزادیوں میں سے کسی کا نکاح اس سے زیادہ مہر پر کیا ہو (مشکوٰۃ ص ۲۷۷)

مہر دراصل ایک اعزازیہ (Honoraium) ہے ایک شوہر اپنی بیوی کو پیش کرتا ہے اور اس کا مقصد عورت کا اعزاز واکرام ہے نہ تو یہ عورت کی قیمت ہے جسے ادا کر کے یہ سمجھا جائے کے شوہر کے ہاتھوں بک گئی اور اب اس کی حیثیت ایک کنیز باندی کی ہے اور نہ یہ محض ایک فرضی کاروائی ہے جس کے بارے میں یہ سمجھا جائے کہ اسے عملاً ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ شوہر کے ذمہ بیوی کا مہر لازم کرنے سے شریعت کا منشاء یہ ہے

کہ جب کوئی شخص بیوی کو اپنے گھر میں لائے تو اس کا مناسب اکرام کرے اور اسے ایک ایسا ہدیہ پیش کرے جو اسکے اعزاز واکرام کے مناسب ہو۔

لہٰذا شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ مہر کی رقم نہ تو اتنی کم رکھی جائے جس سے اعزاز واکرام کا یہ پہلو بالکل مفقود ہو اور نہ تو اتنی زیادہ رکھی جائے کہ شوہر اسے ادا کرنے پر قادر نہ ہو اور بالآخر یا تو مہر ادا کئے بغیر دنیا سے رخصت ہو جائے یا آخر میں بیوی سے معاف کرانے پر مجبور ہو شرعی نقطۂ نظر سے ہر عورت کا اصل حق یہ ہے کہ اسے مہر مثل ادا کیا جائے ۔ مہر مثل کا مطلب مہر کی وہ مقدار ہے جو اس عورت کے خاندان میں عام طور سے اس جیسی خواتین کے نکاح کے وقت مقرر کی جاتی رہی ہو اور اگر اس عورت کے خاندان میں دوسری عورتیں نہ ہو تو خاندان سے باہر اس کے ہم پلہ خواتین کا جو مہر عام طور سے مقرر کیا جاتا ہو وہ اس عورت کا مہر مثل ہے اور شرعی اعتبار سے بیوی مہر مثل وصول کرنے کی حقدار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر نکاح کے وقت باہمی رضامندی سے مہر کا تعین نہ کیا گیا ہو یا مہر کا ذکر کئے بغیر نکاح کر لیا گیا ہو تو مہر مثل خود بہ خود لازم ہو جاتا ہے اور شوہر کے ذمہ شرعاً ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ بیوی کو اس کا مہر مثل ادا کرے البتہ اگر خود بیوی مہر مثل سے کم پر خوشدلی سے راضی ہو جائے یا شوہر خوشدلی سے مہر مثل سے زیادہ مہر مقرر کر لے تو باہمی رضامندی سے مہر مثل سے کم یا زیادہ مقرر کر لینا بھی شرعاً جائز ہے۔

مہر کی مقدار کا مسئلہ : یہاں بھی شریعت نے زیادہ سے زیادہ مہر کی کوئی حد مقرر نہیں کی البتہ کم سے کم مہر کی حد مقرر کر دی ہے اور وہ حد (حنفی فقہ کے مطابق) دس درہم ہے۔

دس درہم کا مطلب دو تولہ ساڑھے سات ماشہ چاندی ہے، اس کم سے کم

مقدار کا طلب یہ نہیں ہے کہ اتنا مہر رکھنا شرعاً پسندیدہ ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس سے کم مہر پر اگر عورت خود بھی راضی ہو جائے تو شریعت راضی نہیں ہے کیونکہ اس سے مہر کا مقصد یعنی عورت کا اعزاز و اکرام پورا نہیں ہوتا یہ کم سے کم حد بھی ان لوگوں کا خیال کر کے رکھی گئی ہے جو مالی اعتبار سے کمزور ہیں اور زیادہ رقم خرچ کرنے کے متحمل نہیں ان کے لئے یہ گنجائش پیدا کر دی گئی ہے کہ اگر عورت راضی ہو تو کم از کم اس مقدار پر نکاح ہو سکتا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب لینا کسی طرح درست نہیں ہے کہ شریعت کو منظور ہی یہ ہے کہ مہر کی مقدار دس درہم رکھی جائے اور اس سے اسے اس معنی میں مہر شرعی قرار دیا جائے۔

گویا شریعت نے مہر کی جو کم سے کم مقدار مقرر کی تھی اس کا مطلب یہ سمجھ لیا کہ شرعاً پسندیدہ ہی یہ ہے کہ اس سے زیادہ مہر مقرر نہ کیا جائے حالانکہ یہ تصور قطعی طور پر بے بنیاد ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود آپ ﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہرہ کا مہر پانچ سو درہم مقرر فرمایا تھا جو ایک سو اکیس تولہ تین ماشہ چاندی کے برابر ہوتا ہے، خود آپ ﷺ نے اپنی متعدد ازواج مطہرات کا مہر بھی اس کے قریب قریب ہی مقرر فرمایا جو اوسط درجے کے لحاظ سے ایک قابلِ لحاظ مقدار ہے۔ بعض حضرات اس مہرِ فاطمی ہی کو مہرِ شرعی کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اور غالباً اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شرعی اعتبار سے اس سے کم یا زیادہ مقرر کرنا پسندیدہ نہیں ہے یہ تصور بھی صحیح نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر فریقین مہر فاطمی کے برابر مہر مقرر کریں اور نیت یہ ہو کہ آنحضرت ﷺ کی مقرر کی ہوئی مقدار بابرکت اور معتدل ہوگی نیز یہ کہ اس سے اتباعِ سنت کا اجر ملنے کی توقع ہے تو یقیناً یہ جذبہ بہت مبارک اور مستحسن ہے؛ لیکن یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ یہ مقدار اس معنی میں مہر شرعی ہے کہ اس سے کم یا زیادہ مقرر کرنا شرعاً

ناپسندیدہ ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس سے کم یا زیادہ مہر مقرر کرنے میں بھی شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

ہاں یہ اصول مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ مہر اتنا ہو جس سے بیوی کا اعزاز واکرام بھی ہو اور شوہر کی استطاعت سے باہر بھی نا ہو؛ جن بزرگوں نے بہت زیادہ مہر باندھنے سے منع کیا ان کا مقصد یہی تھا کہ استطاعت سے زیادہ مہر مقرر کرلیا جائے تو وہ محض ایک کاغذی کاروائی ہوکر رہ جاتی ہے، حقیقت میں اسے دینے کی کبھی نوبت ہی نہیں آتی اور مہر ادانا کرنے کا گناہ شوہر کی گردن پر رہ جاتا ہے۔

دوسرے بعض اوقات بہت زیادہ مہر مقرر کرنے کے پیچھے دکھاوے کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے اور لوگ محض اپنی شان وشوکت کے اظہار کے لئے غیر معمولی مہر کر لیتے ہیں ظاہر ہے کے یہ دونوں باتیں اسلام کے مزاج کے خلاف ہیں اس لئے متعدد بزرگوں نے غیر معمولی مہر مقرر کرنے سے منع فرمایا ہے لیکن اس سلسلے میں حضرت عمر کا ایک واقعہ یادرکھنے کے لائق ہے

حضرت عمر نے اپنے خلافت کے زمانے میں ایک مرتبہ تقریر کے دوران لوگوں سے کہا کہ وہ نکاح میں بہت زیادہ مہر نہ باندھا کریں؛ اس پر ایک خاتون نے اعتراض کیا کہ قران کریم نے ایک جگہ مہر کے لئے قنطار سونے چاندی کا ڈھیر کا لفظا ستعمال کیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ چاندی کا ڈھیر بھی ہوسکتا ہے پھر بھی آپ زیادہ مہر مقرر کرنے سے کیوں روکتے ہیں؟ حضرت عمر نے خاتون کی بات سن کر فرمایا کہ واقعی خاتون کا استدلال درست ہے اور زیادہ مہر باندھنے سے کلی طور پر منع کرنا درست نہیں۔

مطلب یہ تھا کہ اگر دکھاوا مقصود نا ہو اور ادائیگی کی نیت بھی ہو اور استطاعت بھی

ہوتو وہ مہر مقرر کرنا بھی جائز ہے البتہ ان میں سے کوئی بات مقصود ہوتو نا جائز ہے۔

جب مہر کا ذکر چل رہا ہے تو ایک اور نکتے کی وضاحت بھی ہو جائے اور وہ یہ ہے کہ مہر کی دو قسمیں مشہور ہیں مہر معجّل اور مہر مؤجل یہ الفاظ چونکہ صرف نکاح کی مجلس میں سنائی دیتے ہیں اس لئے بہت سے لوگوں کو ان کا مطلب معلوم نہیں ہوتا شرعی اعتبار سے مہر معجّل اس مہر کو کہتے ہیں جو نکاح ہوتے ہی شوہر کے ذمہ لازم ہو جاتا ہے اور یہ اس کا فریضہ ہے کہ یا تو نکاح کے وقت ہی بیوی کو ادا کر دے یا اس کے بعد وہ جب چاہے اس کا مطالبہ کرے چونکہ عام طور سے ہمارے معاشرے میں خواتین مطالبہ نہیں کرتیں اس لئے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس کی ادائیگی ہمارے لئے ضروری نہیں بلکہ شوہر کا یہ فرض ہے کہ وہ عورت کے مطالبے کا انتظار کئے بغیر بھی جس قدر جلد ممکن ہو اس غرض سے سبکدوش ہو جائے مہر مؤجل اس مہر کو کہا جاتا ہے جس کی ادائیگی کے لئے فریقین نے آئندہ کوئی تاریخ متعین کر لی ہو جو تاریخ اس طرح متعین کر لی جائے اس سے پہلے اس کی ادائیگی شوہر کے ذمے لازم نہیں ہوتی نہ بیوی اس سے پہلے مطالبہ کر سکتی ہے لہذا مہر مؤجل ہونے کا اصل مطلب تو یہی ہے کہ اس کی ادائیگی شوہر کے لئے وقت مقررہ سے پہلے لازم نہیں ہوتی نہ بیوی اس سے پہلے مطالبہ کر سکتی ہے لہذا مہر مؤجل ہونے کا اصل مطلب تو یہی ہے کہ اس کی ادائیگی شوہر کیلئے وقت مقررہ سے پہلے لازم نہیں ہوتی نہ بیوی اس سے پہلے مطالبہ کر سکتی ہے۔

لہذا مہر کے مؤجل ہونے کا اصل مطلب تو یہی ہے کہ اس کی ادائیگی کے لئے کوئی تاریخ نکاح کے وقت ہی مقرر کر لی جائے لیکن ہمارے معاشرے میں عام طور سے کوئے تاریخ مقرر کئے بغیر صرف یہ کہ دیا جاتا ہے کہ اتنا مہر مؤجل ہے ہمارے یہاں کے

رواج کے مطابق اس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ مہر کی یہ مقدار اس وقت واجب الادا ہوگی جب نکاح ختم ہوگا یا اگر طلاق ہوجائے تب مہر مؤجل کی ادائیگی لازم ہوگی یا میاں بیوی میں سے کسی کا انتقال ہوجائے تب اس کی ادائیگی لازم سمجھی جاتی ہے۔

ایک اور نکتہ یہ قابل ذکر یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں شوہر کی طرف سے دلہن کو جو زیور دیا جاتا ہے اس کا بذاتِ خود مہر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس زیور سے مہر ادا نہیں ہوتا ہاں اگر شوہر بیوی سے صراحتاً یہ کہہ دے کہ یہ زیور میں نے بطورِ مہر تمہاری ملکیت میں دیدیا تو پھر اسے مہر میں شمار کر سکتے ہیں اس صورت میں بیوی اس زیور کی مالکہ بن کر اس میں ہر طرح کا تصرف کر سکتی ہے اور اسے کسی بھی حالت میں اس سے واپس نہیں لیا جاسکتا اس کے علاوہ اگر شوہر اس زیور کے بارے میں بیوی سے اس بات کی صراحت کردے کہ یہ تمہاری ملکیت ہے اور اس کو مہر میں شمار نہ کرے تو پھر یہ بیوی کی ملکیت شمار ہوگا اور مہر الگ سے دینا ہوگا۔ بہرِ صورت یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ مہر کا تعین محض ایک فرضی یا رسمی کاروائی نہیں ہے جو سوچے سمجھے بغیر کرلی جائے بلکہ یہ ایک دینی فریضہ ہے جو پوری سنجیدگی کا متقاضی ہے۔ یہ ایک معاملے کی بات ہے اس کے پورے پہلو صاف اور واضح ہونے چاہئے اور اس کی ادائیگی کی فکر کرنی چاہئے یہ بڑی ناانصافی کی بات ہے کہ اس حق کی ادائیگی سے ساری عمر بے فکر رہنے کے بعد بستر مرگ پر بیوی سے اس کی معافی حاصل کرلی جائے جب ماحول کے جبر سے اس کے پاس معاف کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔

مہر ادا کرنے کے آسان طریقے : یہاں پر ہم ان شوہروں کے لئے مہر ادا کرنے کے چند آسان حل تحریر کرتے ہیں کہ جب ان کی شادیاں ہوئیں اس وقت

اتنی مہر مقرر کر لیا گیا جو کہ ان صاحب کی مالی استطاعت سے بہت زیادہ تھا اور اب شوہر صاحب کو یہ مضمون کو پڑھ کر یا کسی عالم صاحب کا بیان سن کر مہر ادا کرنے کی فکر لگ گئی ہے،

(۱) بیوی کو ہر ماہ کچھ رقم دے کر بتا دیا جائے کہ میں قسطوں میں آپ کا مہر ادا کروں گا۔

(۲) جو جیب خرچی آپ بیوی کو دیتے ہیں اس میں مہر ادا کرنے کی نیت کر لی جائے اور بیوی کو بھی بتا دیا جائے۔

(۳) کسی خوشی کے موقع پر یا اسلامی تہوار کے موقع پر کوئی قیمتی ہدیہ جو آپ اپنی بیوی کو دیتے ہیں اس میں مہر ادا کرنے کی نیت کر لیں اور بیوی کو بھی بتا دیا جائے۔

آج کل دولہے والے یہ سمجھتے ہیں کہ نکاح نامہ میں جس طرح وکیل اور گواہ کا کالم ہوتا ہے اسی طرح مہر کا بھی ایک کالم ہے جس کو صرف پر کرنا مقصد ہے سمجھتے ہیں، یا نہیں تو شاید دولہا یہ سمجھتا ہے کہ اس کے ادا کرنے کی ذمہ داری وکیل یا گواہوں کے ذمہ ہے یہ ایک غلط فہمی ہے اسی طرح شوہر مختصر مہر ہی نکاح نامے میں درج کراتا ہے مگر ادا نہیں کرتا حالانکہ مہر ادا کئے بغیر ہزاروں کے زیورات لاکھوں کے زمینات بیوی کو دیتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ بیوی سے کہہ دے کہ یہ تمہارے مہر کے بدلے زمین ہو یا یا زیور یا رقم ادا کر دیں ورنہ اخیر میں بڑی بی کے ذریعہ مہر بخشوانے کی نوبت آئے گی۔

مہر کی رقم جتنی بھی کیوں نہ ہو آج کل ایک فیشن عام ہو گیا ہے کہ مہر کی رقم کے ساتھ اخیر میں 786 (سات سو چھیاسی روپیہ) لکھتے ہیں۔ اس عدد کے تعلق سے نہ تو قرآن میں ہے نہ ہی حدیث میں ہے اور نہ ہی اس کے متعلق ہم نے علماء سے سنا ہے۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اللہ تعالی کے احکامات پر حضور پر نور ﷺ کے طریقے پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

طلاق کے استعمال کا شرعی طریقہ

طلاق مرد کا ایک ایسا اختیار ہے جس کا استعمال بڑی احتیاط کے ساتھ بہت سوچ سمجھ کے بعد کرنا چاہئے۔ یہ شریعت کی بتائی ہوئی وہ راہ ہے جسے خود شریعت نے مجبوری کی حالت میں اپنانے کی اجازت دی ہے اور اللہ تعالی کے نزدیک طلاق جائز چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے طلاق کے ذریعہ اس رشتہ کو توڑا جاتا ہے جسے خدا کا نام لیکر قائم کیا گیا تھا اس طرح طلاق کا استعمال ایک نازک ذمہ داری اس ذمہ داری کو انجام دینے کے لئے ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہئے آنے والے دنوں میں جو مسائل گھر کے اندر اور باہر پیدا ہو سکتے ہیں ان پر غور کر لینا چاہئے اور پھر اگر نباہ کی کوئی شکل نظر نہ آئے تو بیوی کو طلاق دینی چاہئے یہ وہ شرعی ہدایات ہیں جو طلاق کے سلسلے میں دی گئی ہیں۔

اسلام میں نکاح وہ مقدس رشتہ اور مضبوط بندھن ہے جس میں مرد اور عورت ایک دوسرے کے ساتھ پاکیزہ زندگی گذارنے اور خوش گوار تعلقات نباہنے کا عہد کرتے ہیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے ''اور وہ تم سے میثاق غلیظ یعنی پختہ عہد لے چکی ہیں۔'' نکاح مرد اور عورت کے درمیان محبت والفت کے جذبات وکیفیات پیدا کرتا ہے اور سکون واطمینان کی دولت نصیب کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالی ''اس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ اس کے پاس سکون حاصل کرے'' (سورۂ اعراف پارہ ۹ رکوع ۱۴)

انسانی زندگی کے لئے سکون واطمنان ایسی دولت ہے کہ اگر انسان کو کچھ نہ ملے

اور یہ مل جائے تو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کو سب کچھ مل گیا گھر کا آرام مل گیا، سکھ کی نیند مل گئی اور ایسی شریک زندگی مل گئی۔ مرد کو یہ عظیم نعمت عورت (بیوی) سے ملتی ہے اسی لئے مردوں کو سمجھایا گیا کہ ہم نے تمہارے جوڑے کو تمہاری ہی جنس سے بنایا تا کہ تم عورت کے وجود کے ساتھ غربت و اجنبیت محسوس نہ کرو اور اس کے سراپا میں تمہارے لئے سکون رکھ دیا کہ یہ دولت تم کو بیوی سے ملے گی۔ اس رنج بھری دنیا میں دکھ درد سے بھری زندگی میں افسردگی و مایوسی کے عالم میں سکھ چین چاہتے ہو تو صنف لطیف جس کو ہم نے تمہارے ساتھ جوڑ دیا ہے اور رفیقۂ حیات بنا دیا ہے اس کے وجود میں تم کو سکون و قرار مل جائے گا اور ساری کلفت دور اور سارا غم غلط ہو جائے گا۔

بیوی رنج و غم کی ساتھی: قرآن مجید نے میاں بیوی کے باہمی تعلقات اور فطری ضرورتوں کی تکمیل کے لئے جو طرز تعبیر اور عنوان اختیار کیا ہے وہ بہت ہی جامع اور نہایت مہذب اور پاکیزہ ہے۔ ''وہ عورتیں تمہارے لباس ہیں اور تم ان کے لباس ہو'' (سورۂ بقرہ پارہ ۲ رکوع ۶)

لباس جس طرح ہر مرد اور عورت کے لئے بنیادی ضرورت ہے اسی طرح مرد اور عورت بھی باہم بنیادی ضرورت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے نکاح کا طریقہ رکھا ہے جس کے ذریعے صرف جنسی خواہشات کی تکمیل نہیں ہوتی بلکہ زندگی کی تکمیل ہوتی ہے دونوں ایک دوسرے کے ہمدرد و غم خوار دکھ سکھ کے ساتھی ہو جاتے ہیں اور انس و محبت لطف و رحمت کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ آیت میں اسی طرف اشارہ ہے کہ دونوں کا آپسی تعلق شریک رنج و غم عیش و راحت کا ہو وقتی نفع و نقصان کا نہ ہو ساتھ ہی اس طرف بھی متوجہ کرنا ہے کہ لباس چونکہ پردہ پوشی اور راز داری کے لئے

بھی ہوتا ہے لہذا زوجین کے درمیان بھی پردہ پوشی کا معاملہ ہونا چاہئے اور زندگی ایسی ساز گار گذارنی چاہئے کہ ہر فرد اس میں زینت اور خوبصورتی محسوس کرے۔

حسن معاشرت کی ہدایت: دو اجنبی جو رشتۂ نکاح میں مربوط ہوئے ہیں الگ الگ دل و دماغ اور فکر و عمل رکھتے ہیں ان دونوں کے طرز معاشرت میں بھی کسی نہ کسی درجہ میں فرق ہوتا ہے اس لیے دونوں کا پورے طور پر ایک دوسرے کے ہم خیال ہونا ہر معاملہ میں ہم آہنگ ہونا بہت ہی مشکل ہے۔ انہیں دشوایوں کو پیش نظر رکھ کر اسلام نے مرد اور عورت کے حقوق و فرائض کی نشاندہی کرتے ہوئے واضح ہدایتیں دیں تاکہ دونوں اپنے اپنے دائرے میں رہ کر فرائض و حقوق کو پورا کرنے کی ذمہ داری محسوس کریں اس طرح باہمی نزع و خلفشار کی گنجائش کم سے کم نکلتی ہے لیکن ایک جگہ ایک ساتھ رہنے سے کبھی نہ کبھی کشیدگی پیدا ہوگی، عورتیں نازک طبع، تندخو، اور متلون مزاج ہوتی ہیں۔ اسلام نے عورتوں کی اس فطری کمزوری کو نظر انداز نہیں کیا اس نے عورتوں کی اس خلقی کمزوری کو پیش نظر رکھ کر ہدایت دی کہ اگر عورتوں کے قول و فعل سے اذیت پہونچے، دل کو ٹھیس لگے، تو ایسے موقع پر صبر و ضبط، حلم و بردباری سے کام لے۔

اللہ رب العزت نے اپنے کلام پاک میں ارشاد فرمایا ہے کہ عورتوں کے ساتھ حسن و خوبی کے ساتھ گذر بسر کرو۔ مل جل کر معروف کے ساتھ زندگی گزارنے کا مطلب یہ ہے کہ گفتگو میں لطف و محبت کا انداز ہو حاکمانہ اور ظالمانہ لب و لہجہ اور درشتی یعنی سختی نہ ہو ایک دوسرے کی بات کو پوری سنیں ہر بات خوشی و مسرت کے ساتھ شروع کی جائے اور پوری خوشگواری اور باہمی اعتماد کے ماحول میں ختم کی جائے۔ جس میں نہ ترشی کی بو آئے اور نہ بدمزاجی کی جھلک اور نہ ہی اس کا میلان کسی دوسرے کی طرف ہو۔ اگر وہ یہ محسوس کرے کہ شوہر کا رجحان اس کے بجائے دوسری جانب ہے تو دنیا کی ساری راحت اس کے

لئے اذیت بن جاتی ہے۔

آیت میں یہ بھی ہدایت ہے کہ مردوں کو اگر بیویاں ناپسند ہوں تو ایسے وقت جذبات کی جگہ عقل وشعور سے کام لینا چاہئے اور خلافِ طبیعت بات کو گوارا کرنا چاہئے۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی مسلمان مرد کسی مسلمان عورت کو اس لئے ناپسند نہ کرے کہ اس کی کوئی عادت ناگوارطبع ہے اس لئے کہ اگر ایک عادت ناپسند ہے تو اس کی دوسرے عادت پسندیدہ ہوگی۔

عورت کی فطری کمزوری: ہم اپنی زندگی میں رات دن دیکھتے ہیں کہ عورتیں عموماً ضدی، اپنی بات پر اڑ جانے والی ہوتی ہیں۔ ان کو کسی ایک حالت میں قرار نہیں رہتا، عورتوں کی اس خلقی اور فطری کمزوری کو آنحضرت ﷺ نے ظاہر فرمایا، عورتیں شوہر کی ناشکر گذار ہوتی ہیں، ان کے فضل واحسان کی منکر، تم اگر ان کے ساتھ زندگی بھر احسان کرو پھر اگر کوئی بات تمہارے طرف سے ان کی طبیعت کے خلاف سامنے آگئی تو اس کو یہ بولتے ہوئے کوئی تامل نہ ہوگا کہ میں نے کبھی بھی تم سے کوئی بہتری نہیں دیکھی۔ اس فطری کمزوری کو دیکھتے ہوئے آپ ﷺ نے مردوں کو یہ نصیحت فرمائی تم وصیت قبول کرو کہ عورتوں کے ساتھ بھلائی کروگے کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں اور پسلی میں سب سے ٹیڑھا حصہ اوپر والا ہے۔ اگر تم اسے سیدھا کرنا چاہو گے تو توڑ ڈالو گے اور اگر یوں ہی چھوڑ دو گے تو ہمیشہ کے لئے کجی (ٹیڑھاپن) رہ جائے گی۔

ظلم وزیادتی کی ممانعت: کیونکہ عورتیں صنف نازک ہیں ان کے احساسات بڑے نازک ہوتے ہیں وہ کسی معمولی بات پر بیحد خوش ہوسکتی ہیں اور کسی وقت معمولی کام سے ناراض بھی ہوسکتی ہیں اس لئے مرد کو ہر وقت ان کے ساتھ حسن معاشرت خوشگوار تعلق

اور اچھا برتاو کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ان کے ساتھ ظلم وزیادتی کرنا انسانیت سوز حرکت ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے ان کو تکلیف پہونچانے کی غرض سے مت روکو اور نہ اس ارادہ سے کہ ان پرظلم کیا کروگے۔ جو شخص ایسا کرے گا سو اپنا ہی نقصان کرے گا اور حق تعالی کے احکام کو ہنسی مذاق نہ سمجھو۔ (البقرہ پ۲ ص۱۲)

زدوکوب پر سخت روک: اسی لئے رحمتِ دوعالم نے مار پیٹ اور بے جا تشدد سے سخت منع فرمایا اور زمانۂ جاہلیت میں عرب کے لوگ جو اپنی بیویوں کو بے محابا زدوکوب کرتے اوران کے ساتھ سخت بدسلوکی کرتے اس ظالمانہ اور جابرانہ طریقے پر روک لگائی ۔ چہرے پر مت مارو برا بھلا نہ کہو اور نہ اس سے الگ ہو کر رہو الا یہ کہ علاحدگی گھر ہی کے اندر ہو۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے عورتوں کو زدوکوب سے روکتے ہوئے یہ فرمایا ''تم میں سے کوئی اپنی بیوی کو اس طرح سے نہ پیٹے جس طرح غلام کو مارا جاتا ہے اور پھر دوسرے دن جنسی میلان کی تکمیل کے لئے اس کے پاس پہنچے'' (بخاری) پیغمبرِ اسلام ﷺ نے بار بار اسی لئے تاکید فرمایا کہ مرد بہرِ صورت عورت کو زدوکوب سے احتراز کرے اور بات بات پر ناراض ہوکر نہ تھپڑ لگائے نہ ڈنڈا اچلائے۔

اگر عورت کی ہٹ دھرمی نافرمانی اور سرکشی بہت بڑھ جائے تو شوہر اصلاحِ حال کے لئے درج ذیل طریقہ اختیار کرسکتا ہے

(الف) عورت کو زبان سے سمجھائے اور راہِ راست پر لانے کی کوشش کرے۔

(ب) اگر زبانی فہمائش بے اثر ہوکر رہ جائے اور عورت اپنے حالات بدلنے کے لئے تیار نہ ہو تو اپنی خوابگاہ میں عورت کے ساتھ سونا چھوڑ دے۔

(ج) علیحدگی کی جب یہ شکل بھی ناکام ہوجائے تب زدوکوب کرسکتا ہے لیکن اس کی نوعیت کیا ہوگی خود جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے تشریح فرمائی وَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْباً غَيْرَ مُبَرِّحٍ اس کو مارو اس طرح کہ جلد نہ پھوٹے، حاصل یہ کہ معمولی سرزنش (چاہے گوشمالی کہہ لیجئے) سے آگے نہ بڑھنا چاہئے حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے جو گرانقدر نصیحت فرمائی ہے اس کا ایک حصہ موقع کی مناسبت سے نقل کرنا ضروری ہے۔

'' سنو عورتوں کے متعلق حسنِ سلوک اور بھلائی کرنے کا تاکیدی حکم قبول کرو وہ تمہارے گھر میں بطورِ قیدی ہیں اگر وہ کھلی ہوئی نافرمانی پر اتر آئیں تو ان کو بستر پر تنہا چھوڑ دو اور معمولی تنبیہ کرو اگر وہ اطاعت کرلیں تو پھر زیادتی کی ضرورت نہیں سنو تمہاری عورتوں پر تمہارے حقوق ہیں اور اسی طرح تمہاری عورتوں کے تم پر تمہارے حقوق میں سے یہ ہے کہ وہ ان کو تمہارے بستر پر نہ بیٹھنے دیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو اور تمہارے گھروں میں ان کو نہ بلائیں جن کا آنا تم پسند نہیں کرتے ہو اور تم پر حق یہ ہے کہ تم ان کو کپڑا دینے اور کھانا دینے میں احسان کرو (ترمذی شریف)

میاں بیوی میں اختلاف ہو تو کیا کریں: اس ہدایت کے باوجود اگر میاں بیوی میں اختلاف پیدا ہو جائے کشیدگی کافی بڑھ جائے اور بظاہر میل ملاپ محبت اور تعلق کی صورت نظر نہ آئے تو ایسے نازک موڑ پر بھی شوہر جلد بازی اور ناعاقبت اندیشی سے کام نہ لے بلکہ دونوں کے طرف سے پنچ مقرر کیا جائے جو اصلاحِ حال کی کوشش کریں اور اختلافات کی وجوہ معلوم کرے۔ حکمِ خداوندی ہے اگر تم اوپر والوں کو ان دونوں (زوجین میں) کشیدگی کا اندیشہ ہو تو تم لوگ ایک آدمی (جو تصفیہ کی لیاقت رکھتا ہو) مرد کے خاندان سے ایک آدمی (منصف) عورت کے خاندان سے بھیجو۔ منصف بھی مخلص ہو ورنہ فائدے کے

بجائے نقصان کا شدید خطرہ ہے۔

جب نباہ کی راہ نہ رہے تو حکمین نے اصلاح اور معاملات کو ساز گار بنانے کی جدو جہد کی لیکن دونوں (شوہر و بیوی) کے دل نفرت سے بھرے ہوئے ہیں مزاج میں شدید اختلاف اور کافی بُعد ہے دور دور تک میل وملاپ ربط وتعلق کی کوئی کرن نظر نہیں آتی ہے ایسی صورت حال میں اب شوہر کے لئے دو ہی راستے ہیں یا تو اس بے کیف وتلخ زندگی کو گوارا کرتے ہوئے بیوی کو نہ علیحدگی کا پروانہ دے اور نہ اس سے محبت والفت کا معاملہ کرے بلکہ معلقہ بنائے رکھے یا اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے دونوں مستقبل کو اطمینان بخش بنانے کے لئے بہت ہی غور وفکر اور سوچ سمجھ کر بیوی کو علیحدہ کر دے جو خود اس کے لئے اور بیوی کے لئے سوچا سمجھا ہوا فیصلہ ہو کوئی جذباتی اور غصہ سے متاثر اقدام نہ ہو۔

ان دونوں صورتوں میں پہلی صورت کو بہتر نہیں کہا جا سکتا اس لئے دوسری صورت ہی کو بدرجہ مجبوری اختیار کرنا ہوگا کہ شوہر طلاق دے کر بیوی کی علیحدگی کا فیصلہ کر دے اس کے بعد ہی دونوں اپنے معاملات پر از سرِ نو غور وفکر کریں گے اور مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے سوچ سمجھ کر ایسا راستہ اختیار کریں گے جس میں دونوں کی کامیابی ممکن ہو۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے ''اس کو خبر نہیں شاید اللہ تعالیٰ پیدا کر دے اس طلاق کے بعد نئی صورت، اگر دونوں علاحدگی اختیار کرلیں تو اللہ تعالیٰ ہر ایک کو بے نیاز فرمادیں گے''

طلاق سخت ناپسندیدہ فعل: شریعت نے مرد کو یہ اختیار ضرور دیا ہے کہ وہ طلاق دے کر رشتۂ نکاح کو ختم کر دے مگر اس حق کا استعمال کرنے اور رشتہ نکاح کو کاٹنے سے پہلے اس پر بہت سی پابندیاں بھی لگا دی ہیں اور حتی الامکان اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے۔ شریعت اسلامی نے یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ یہ ایک ناپسندیدہ چیز ہے اس

لئے اس اختیار کو آخری چارہ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہئے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''حلال اور جائز چیزوں میں اللہ تعالی کو سب سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ چیز طلاق ہے'' حضرت ثوبان ؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو عورت اپنے شوہر سے کسی سخت تکلیف کے بغیر طلاق کا مطالبہ کرے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جب تک عورتوں سے کھلی ہوئی بے حیائی نہ دیکھو طلاق نہ دو۔

طلاق خدا اور رسول اللہ ﷺ کو اس لئے ناپسند ہے کہ اس رشتہ کے کٹ جانے کے معنی صرف یہی نہیں ہے کہ دو آدمی ایک دوسرے سے جدا ہو گئے بلکہ اس کی وجہ سے نہ جانے کتنے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں بعض دفعہ خاندان اور معاشرے میں بغض وعداوت کی ایک مستقل بنیاد پڑ جاتی ہے۔ ایک رشتہ نکاح کی وجہ سے میاں بیوی کے کتنے اعزاء واقارب ایک دوسرے سے قریب ہو جاتے ہیں ان میں مہر ومحبت پیدا ہو جاتی ہے، کتنے بیگانے یگانے ہو جاتے ہیں طلاق کے ذریعہ مذکورہ امور ہی یک لخت ختم ہو جاتے ہیں بلکہ اب الفت ومحبت کے بجائے بغض وعداوت کی بنیاد پڑ جاتی ہے ان کی یگانگت بیگانگی سے بدل جاتی ہے پھر دونوں کی شادی کا مسئلہ ہوتا ہے پھر اگر بچے ہوں تو ان کی پرورش اور دیکھ بھال کا سوال کھڑا ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ ایک طلاق کے ذریعہ معاشرے میں کئی مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس لئے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ بے وجہ طلاق کا استعمال سخت ناپسندیدہ ہے امام ابوحنیفہؒ نے بے وجہ طلاق دینے کو حرام قرار دیا ہے۔

طلاق دینے کا غلط وقت: حالت حیض میں طلاق دینا ناجائز اور سخت گناہ کی بات ہے اگر غلطی سے کوئی ایسا کرے تو اس کو رجعت کر لینی چاہئے پھر اگر طلاق دینے کی

رائے پر قائم ہو تو اس طہر میں طلاق دینی چاہئے جس میں صحبت کی نوبت نہ آئی ہو۔اس کی حکمت اور نکتہ بھی ظاہر ہے کہ ناپاکی کی حالت میں عورت قابل رغبت نہیں ہوتی۔طہر کی حالت میں اس کا کافی امکان ہے کہ شوہر کے دل میں رغبت پیدا ہو جائے اور طلاق دینے کا خیال ہی ختم ہو جائے۔اللہ اور رسول ﷺ کی خوشی کا احساس اور جذبہ پیدا ہو جائے۔ایک حدیث میں آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو (جب انہوں نے اپنی بیوی کو ناپاکی کی حالت میں طلاق دی) رجعت کا حکم فرمایا اور فرمایا ''کہ اگر طلاق دینا چاہتے ہو تو طہر میں طلاق دو'' اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو حیض کے ایام میں طلاق دینا ناجائز اور سخت گناہ کی بات ہے لیکن یہ طلاق واقع ہو جاتی ہے اگر طلاق واقع نہ ہوتی تو رجعت کی ضرورت ہی نہ ہوتی اور آپ ﷺ رجعت کا حکم دینے کے بجائے یہ فرماتے کہ طلاق واقع نہیں ہوئی۔

تین طلاق دینا سخت گناہ: اسی طرح بیک وقت تین طلاق دینا سخت گناہ اور قرآن مجید کے بتلائے ہوئے طریقۂ طلاق کے خلاف ہے کیونکہ **اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ الی قوله تعالی فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَاتَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدِ اَن تنكح زوجا غيره** کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک سے زیادہ طلاقیں دینی ہوں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ میں نہیں بلکہ متعدد دفعہ اور مختلف وقتوں میں دی جائے۔

بیک وقت تین طلاق پر رسول اکرم ﷺ کی ناراضگی: ایک شخص کے بارے میں حضور اقدس ﷺ کو اطلاع ملی کہ اس نے ایک ساتھ تین طلاقیں دے دی ہیں تو آپ ﷺ سخت غصہ کی حالت میں کھڑے ہو گئے اور ارشاد فرمایا کہ ابھی جب کہ میں (یعنی نبی کریم ﷺ) تمہارے درمیان موجود ہوں کیا کتاب اللہ سے کھیلا جائے گا؟ یعنی ایک

ساتھ تین طلاق دینا اس کتاب اللہ کے ساتھ گستاخانہ کھیل اور مذاق ہے جس میں طلاق کا طریقہ اور قانون پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ایک صحابی کھڑے ہو گئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں اس آدمی کو قتل ہی نہ کر دوں جس نے یہ حرکت کی۔

''سنن بیہقی'' میں ہے کہ ایک شخص نے عمران بن حصین سے عرض کیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو سو ۱۰۰ طلاقیں دیں تو حضرت عمران نے فرمایا اس نے گناہ کیا اور اس کی بیوی اس پر حرام ہو گئی۔امام طحاویؒ نے روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص حضرت ابن عباسؓ کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میرے چچا نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے ڈالے ہیں۔انہوں نے جواب دیا ''تیرے چچا نے اللہ کی نافرمانی کی اور گناہ کا ارتکاب کیا اور شیطان کی پیروی کی۔

ان تمام روایات کو گہری نظر سے دیکھا جائے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ اسلام جس نے سخت مجبوری کی حالت میں رخصتِ طلاق استعمال کرنے کی اجازت دی ہے اور پھر اسی نے بیک وقت تین طلاق دینے سے سخت منع بھی کیا اور اس کے لئے کیسی شدید وعید بیان کی ہے اور اس سے باز رہنے کی کتنی سخت ہدایت کی ہے۔اس کے باوجود مسلم معاشرے میں بعض دفعہ معمولی باتوں پر طلاق دے دی جاتی ہے۔اور وہ بھی بیک وقت تین طلاق اس سے معاشرے میں برا اثر پیدا ہو رہا ہے یقیناً تین طلاق دینے والوں کا یہ فعل شریعت کی نظر میں انتہائی مذموم اور قبیح ہے یہ خلافِ سنت، کھلی بدعت اور صریح گناہ کا کام ہے اور شریعت کے تفویض کردہ اختیار کا غلط، بے جا اور بے محل استعمال ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اس نازک اور اہم مسئلہ کو سمجھیں۔ناگزیر مجبوری اور سخت ضرورت کے وقت اپنے اختیار طلاق کو استعمال کریں۔جس طریقے پر شریعت نے اسے استعمال کرنے کو مباح قرار

دیا ہے اور بیک وقت تین طلاق نہ دیں۔ جو بدعت اور خلاف سنت ہے۔

طلاق دینے کا صحیح طریقہ: جیسا کہ آپ پڑھتے آرہے ہیں کہ بیک وقت تین طلاق دینا خلاف سنت اور بدعت ہے لہٰذا جب مرد کے لئے طلاق ناگریز ہوتو اسے طلاق کا شرعی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ ﴿۱﴾ صرف ایک طلاق دی جائے یعنی شوہر بیوی سے کہے کہ میں نے تجھے طلاق دی۔ ﴿۲﴾ طلاق دو گواہوں کی موجودگی میں دی جائے۔ ﴿۳﴾ طلاق حالت طہر میں دی جائے یعنی جب عورت کو ماہواری نہ آرہی ہو اور اس پاکی کے زمانے میں شوہر نے اس سے صحبت بھی نہ کی ہو۔ ﴿۴﴾ ایک طلاق دینے کے بعد عدت گذرنے دی جائے عدت اگر ماہواری آرہی ہوتو تین کامل حیض ہے، اور اگر عورت حمل سے ہے تو وضع حمل ہے اگر ماہواری نہ آتی ہو تو اس کی عدت تین ماہ ہے۔ (عدت کے اندر شوہر رجوع کرسکتا ہے رجوع کے لئے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ میں نے رجوع کرلیا رجوع بھی دو گواہوں کی موجودگی میں ہو تو بہتر ہے)

﴿۵﴾ عدت کے اندر رجوع نہیں کیا تو عدت گذرتے ہی طلاق رجعی طلاق بائن سے بدل جائے گی۔ اب مرد کو رجوع کا حق باقی نہیں رہے گا البتہ زوجین باہمی رضامندی سے نئے طور پر نئے مہر کے ساتھ تجدید نکاح کرسکتے ہیں۔

طلاق کا یہ بہتر طریقہ ہے کہ اس میں مرد کو بار بار اپنے فیصلہ پر غور کرنے کا موقع بھی ملے گا۔ اور اس کا یہ عمل سوچا سمجھا اور غور وفکر کیا ہوا عمل ہوگا۔ جس میں نہ تو جذبات اور نفسانیت کارفرما ہوگی نہ اسے وقتی غصہ اور کسی فوری داعیہ کا نتیجہ کہا جائے گا اور نہ اس کے بعد دونوں کو اس حرکت پر پچھتاوا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ صحیح دینی سمجھ کے ساتھ ہم سب کو اپنے احکامات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

طلاق نامہ ایڈووکیٹ کا، فتوی مفتی کا

آج کل نوجوان لڑکا ہو یا لڑکی، ان کا رشتہ بڑی مشکل ہی سے ملتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ شہر میں ایس ٹی ڈی بوتھوں کی طرح مسلم میاریج بیورو، نکاح سنٹر نہ جانے اور کیا کیا نام سے رشتے طے کرنے کے ادارے قائم ہیں، ان کے علاوہ مداوتوں کی تو بھرمار ہے ،بغیر پونجی کے اچھی تجارت شروع ہو جاتی ہے۔

یہ شادیوں کی دلالی صرف ایک کاروبار ہی نہیں بلکہ اچھا نفع بخش کاروبار بن گیا ہے۔ یہ رشتہ لگانے والے لوگ پرسنٹیج کے اعتبار سے اپنا کمیشن لیتے ہیں، یہ لوگ پہلے تو لڑکا لڑکے کی صفات بیان کرنے میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں، اور جب شادی کے بعد کوئی خرابی ظاہر ہوتی ہے تو صاف مکر جاتے ہیں کہ بھائی ہمارا کام تو صرف رشتہ لگانا ہے، اب ہر ایک کا بیک گروانڈ ہم تلاش نہیں کر سکتے۔ تحقیقات کرنا تو آپ کا کام ہے۔ بہر حال آمدم برسرِ مطلب، ماں باپ جو اپنے بچوں بڑے ناز سے پالتے ہیں، اپنی بچی کو بیاہ کر کے اجنبی آدمی کو اپنا داماد بنا کر اپنی لخت جگر کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں، مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ماں باپ اپنے بچوں کو نہ دینی تعلیم سے آراستہ کرتے ہیں اور نہ صحیح اخلاق سکھاتے ہیں، خصوصاً لڑکیوں کو شوہر کے حقوق اور ازدواجی زندگی کے مسائل سے آگاہ نہیں کیا جاتا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شادی تو بڑی دھوم دھام سے ہوتی ہے مگر چند دن بھی نہیں گذرتے کہ میاں بیوی میں اختلافات شروع ہو جاتے ہیں، اور لڑکی میکے آ کر سسرال میں چند دنوں کی داستان الم اس طرح پیش کرتی ہے کہ گویا وہ کئی سالوں سے

کانٹوں کے بستر پر زندگی گذار رہی ہے۔ والدین بھی پوری طرح تحقیق کیے بغیر فوراً لڑکے والوں کے خلاف قانونی کارروائی شروع کر دیتے ہیں، اور اکثر بلا وجہ لڑکے کے خلاف جہیز ہراسانی کے کیس درج دفعہ چار سو اٹھانوے، اے کے تحت درج کرا دیتے ہیں۔لڑکا پریشان ہوکر کسی وکیل کے پاس جاتا ہےتو وہ ایڈوکیٹ صاحب دونوں فریق کو بلاکر دونوں کی پوری بات سننے کے بجائے یک طرفہ صرف لڑکے کی بات سن کر بیک وقت تین طلاق والا طلاق نامہ جاری کر دیتے ہیں، نہ مہر ادا ہوتا ہے اور نہ نفقۂ عدت اور نہ ہی اس عورت کا ساز وسامان واپس لوٹایا جاتا ہے۔بس طلاق نامہ روانہ کر کے کسی دار العلوم یا مفتی صاحب سے فتویٰ حاصل کر کے اپنے موکل کو اطمینان دلا دیتے ہیں کہ تمہارا کام ہوگیا۔لڑکا وقتی طور پر خوش ہوجاتا ہے،لیکن جیسے ہی وہ ہوش میں آتا ہے، واویلا مچاتا پھرتا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ایڈوکیٹ صاحبان دونوں فریق کو بلاکر بات کرنے اور فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں ہیں، مگر ایسے معاملات جب مسلم ایڈوکیٹس کے پاس آئیں تو ان کی ذمہ داری ہے کہ ان کو شرعی دار القضاء کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کریں، مگر افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے مسلم معاشرے کے بعض افراد کو تو اس ادارے (شرعی دار القضا) کے وجود کی بھی خبر نہیں ہے۔

بہر حال اگر ایڈوکیٹ صاحبان کو طلاق نامہ روانہ کرنا ہی ہو تو بہتر طریقہ یہ تھا کہ اسلام میں طلاق کا جو شرعی طریقہ ہے، اس کو استعمال کرتے اور قسط وار طلاق نامہ جاری کرتے، مگر ہوتا یہ ہے کہ ایک ہی وقت تینوں گولیاں چلا دیے، یہ سراسر غلط ہے اور ناپسندیدہ طریقہ ہے۔ اس لیے ایڈوکیٹ حضرات سے گذارش ہے کہ ایسے معاملات کو دار القضاء روانہ کریں تو دونوں فریق کو بلاکر دونوں کے باتیں سن کر فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ اگر

ایڈوکیٹ حضرات علماء کرام کی رہنمائی میں کام کریں تو میں سمجھتا ہوں اس میں دونوں (میاں بیوی) کا بھلا ہوگا۔اور اس طلاق سے کئی معصوم بچیوں کی تباہ و بربادی سے بچ جائیں گے۔ میں نے ہماری قوم کی ایک بڑی کمزوری یہ بھی دیکھی ہے کہ بعض لوگ غیر مسلم ایڈوکیٹ سے طلاق نامہ روانہ کرتے ہیں اور اس میں مضمون ایسا ہوتا ہے کہ گویا وہ طلاق نامہ بھی ہے اور خلع نامہ بھی۔ان لوگوں کو ہر طرح سے صرف اپنے موکل کو بچانے کی فکر رہتی ہے اور مقدمہ کو طول دے کر آمدنی کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

اگر ایڈوکیٹ حضرات فریقین کو دارالقضاء روانہ کریں گے تو یہ ان کے لیے موجب اجر بھی ہوگا اور فریقین کے درمیان شرعی طور پر فیصلہ بھی ہو سکے گا، اگر ایڈوکیٹ حضرات کو میری بات کڑوی نہ لگے تو ضرور راقم الحروف کے مشورے پر عمل کریں، نیز دارالقضاء اور علماء کرام سے اپنا رابطہ رکھیں، ورنہ آج کل کے ماحول میں کنواری لڑکیوں کا اٹھنا ہی مشکل ہے، اگر شادی شدہ لڑکیاں مطلقہ کا لیبل لگا کر واپس آجائیں تو ان کے ماں باپ پر کیا گذرتی ہے، اس حالت میں غریب لڑکیاں اقدامِ خودکشی کر لیتی ہیں، بلکہ اسی طرح بہت ساری لڑکیاں بے موت مر بھی چکی ہیں۔

مطبوعہ روزنامہ سالار 22/07/2001

کیا عورتوں کی ملازمت مناسب ہے؟

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ان گنت مخلوقات کو پیدا کیا ہے، لیکن تمام مخلوقات میں انسان ہی کو اشرف المخلوقات ہونے کا شرف حاصل ہے، یہ شرف اس کو اس کی عقل ودانائی اور قوتِ گویائی کی بناء پر دیا گیا ہے، اب اگر کسی میں یہ دونوں چیزیں یا کوئی ایک چیز نہیں رہی تو اس کو کامل انسان نہیں کہا جائے گا، جب یہ کامل انسان نہ ہوا تو پھر اس کو کوئی اہم کام کا ذمہ داری یا کوئی عہدہ دینا غلطی ہوگی۔

یہ بات تو طے ہے کہ عورت جس کو صنف نازک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے ناقص العقل قرار دیا ہے، یعنی مرد کی بہ نسبت کم عقل اور کم سمجھ اور قوت میں کمزور بنایا ہے۔ اب جس کو جتنی طاقت ہو اس کو اتنا ہی کام دینا چاہیے، اگر ہم اس کی طاقت سے زیادہ کام اس کے سپرد کریں گے تو یہ سراسر ظلم ہوگا، لہٰذا عورتوں کو گھریلو کام، بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی پرورش کی حد تک ہی اس کو عقل اور قوت دی گئی ہے۔ اگر ہم اسے گھر سے باہر نکال کر آفس یا دفتر میں لا کھڑا کریں گے تو یہ صنف نازک پر بے جا ظلم ہوگا اور خدا ظلم کو ہرگز معاف کرنے والے نہیں۔

یہ رہی علم کی بات، اب ذرا آگے چلیے کہ ہم ذرا ٹھنڈے دل ودماغ کے ساتھ غور وخوض کریں تو پتہ چلے گا کہ دنیا میں جتنی برائیاں ہو رہی ہیں اس کا اصل سبب عورت کا چراغِ خانہ سے شمعِ محفل ہو جانا ہی ہے، عورت اگر آج عورت بن کر رہے تو دنیا کی ۷۵ فیصد برائیاں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ آج آفسوں میں، بینکوں میں اور نہ جانے کہاں

کہاں عورتوں کو ملازمتیں دی جارہی ہیں، جس سے پاک دامنی تارتار ہورہی ہے۔ اور نتیجہ یہ کہ میاں بیوی کے درمیان کھٹ پٹ ہوجاتی ہے۔ اور تنگ آکر میاں صاحب اپنے اختیار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تین تیر چلا بیٹھتے ہیں اور جب انہیں اس کا حکم معلوم ہوتا ہے تو فوراً روتے دھوتے ہوئے دارالقضاء کی طرف راہِ اختیار فرار کرتے ہیں، آخر کار وہی ہوتا ہے جو قطعاً نہ ہونا تھا اور جس پر خدائے تعالیٰ کا غیض وغضب نازل ہوتا ہے۔

غرض معلوم ہوا کہ عورت کے باہر نکلنے سے ہی یہ نوبت آئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عورتیں فطری طور پرست ہوتی ہیں، پھر کام بھی کم کرتی ہیں، حکومت انہیں اتنی تنخواہ دے کر کیوں رکھتی ہے خدا جانے؟ ان کے بجائے کسی نوجوان مرد کو ملازمت پر رکھے تو وہ بے چارہ اپنے بیوی بچوں کے لیے پوری دلچسپی اور محنت کے ساتھ کام کرے گا۔

لٰہذا حکومتِ ہند سے عموماً اور حکومتِ کرناٹک سے خصوصاً میری گذارش ہے کہ کسی بھی ادارے میں خواہ وہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری، عورت کو ملازمت نہ دی جائے، ان کے لیے گھر کے اندر کے کام ہی بہت ہیں۔ اس کے بعد دیکھیں کام کتنے جلد ہوں گے اور کسی قسم کی بدنظمی بھی نہیں ہوگی۔ امید کہ حکومت ان باتوں پر غور کرے گی۔

جہیز کی خرابیاں، والدین کی پریشانیاں

ہمارے مسلم معاشرے میں شادی بیاہ کے سلسلے میں جو بیشمار خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں اور جن غیر شرعی رسم ورواج نے اسے مشکل بلکہ قیامت صغریٰ بنادیا ہے، ان میں سے ایک جہیز کی لعنت بھی ہے۔ جس کی وجہ سے بہت سی غریب لڑکیوں کی شادی نہیں ہو پائی یا ان کے لیے اچھے رشتے نہیں مل پاتے یا اس کے لیے رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جو لڑکیاں اپنے میکے سے جہیز لے کر سسرال جاتی ہیں ان میں بھی اکثر غیر مطمئن اور لعنتوں کا شکار بنتی ہیں۔ اس لیے کہ جہیز کے حریص لڑکوں اور ان کے والدین کی خواہشات کا پیٹ کبھی نہیں بھر سکتا۔ اس بناء پر ان کو بہت کچھ پانے کے باوجود بھی کمی محسوس ہوتی ہے، اس کمی کا غصہ ان لڑکیوں پر اتارتے ہیں اور پورا ماحول ان کے شیشۂ دل کو مجروح کرتا رہتا ہے۔ جس کی بناء پر مجبور لڑکیاں ایک قسم کی گھٹن محسوس کرتی رہتی ہیں۔ ان میں کتنے مہلک امراض کا شکار ہو جاتے ہیں اور کتنے ان حالات کو برداشت نہ کرتے ہوئے خودکشی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن مجید میں اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک اور صنف نازک کے جذبات کو ٹھیس نہ لگانے کی جو تاکید آئی ہے اور خاص طور پر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنی بچیوں اور یتیم بہنوں کی تعلیم وتربیت اور حسن سلوک کی جو اہمیت اور فضیلت بیان کی گئی، اسے آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس پہلو کو نظر انداز کر کے لڑکے اور ان کے والدین معصوم بچیوں کی عزت وحرمت کو جہیز کی کمیت اور کیفیت پر تولنے لگتے ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ماں

اپنی بچی کو کس لاڈ و پیار سے اور ناز و نعمت سے پالتی ہے اور اس کے لیے ماں نے اپنی کتنی راتوں کی نیندیں حرام کی ہوں گی اور باپ نے اپنے خون پسینے کی کمائی کے کتنے ہزاروں روپے اس میں صرف نہ کیے ہوں گے۔ اور بچی جب جوان ہو جاتی ہے اس کے لیے رشتہ تلاش کرنے میں کتنے مصائب و آلام کا سامنا کیا ہوگا۔

یہ تمام پریشانیاں اٹھانے کے بعد ماں باپ اپنی نور نظر لخت جوان بچی جو ایک اجنبی مرد کو شوہر بنا کر ایک اجنبی خاندان کو اپنا خاندان بنا کر اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اب اس میں ہونے والے شوہر اور اس نئے خاندان کے لیے کتنی بے غیرتی اور بے شرمی کی بات ہے کہ اتنی قیمتی نعمت کو پا کر اس حقیر ترین چیزوں کا مطالبہ کریں اور اس کو لڑکی کی عزت وحرمت کی قیمت قرار دیں۔ اور شریعت اور اخلاق اور مروت کی ساری قدروں کو چند کوڑیوں اور فنا ہونے والی چیزوں کے بدلے میں پامال کر ڈالیں۔ جب کہ ہر لڑکے کو یہی بات اپنی بہن کے بارے میں سوچتا ہے، اس وقت معاملہ الٹا ہوتا ہے، اس میں ہر طرح کی آسانی چاہتا ہے۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لوگوں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو تو تم مسلمان ہو جاوگے۔ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، تم مومن ہو جاؤ گے۔ ایسے مہلک مرض کو ختم کرنے کے لیے علماء اور دانشور حضرات کو ایک مہم چلانا چاہیے اور امت بھی علماء کرام کی باتوں پر عمل کرے تو دونوں جہاں میں سرخرو ہوگی۔

جہیز کے معنی اسباب اور سامان کے ہیں، اصطلاحاً اس سامان کو کہتے ہیں جو لڑکی کو نکاح میں اس کے ہمراہ دیا جاتا ہے ۔ ہر ملک ہر علاقے میں جہیز مختلف صورتوں میں دیا جاتا ہے۔ لیکن عام طور پر زیورات، نقدی، کپڑوں اور زنانہ استعمال کے کپڑوں پر مشتمل

ہوتا ہے۔فقہ السنہ میں سید سابق لکھتے ہیں کہ جہیز وہ سامان ہے جسے خود عورت یا اس کے گھر والے تیار کرتے ہیں ۔ تا کہ جب وہ بیاہ کر کے خاوند کا گھر بسائے تو یہ سامان اس کے ساتھ ہو۔ تہذیب وتمدن ، معاشرت وثقافت میں جب ترقی ہوئی تو دولت وثروت کی فراوانی ہونے لگتی ہے، بچہ پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک نئے نئے رسوم اور طریقے ایجاد ہوتے ہیں ۔ بلکہ مرنے کے بعد بھی اس کا سلسلہ باقی رہتا ہے۔پیغمبر اسلام نے بچہ پیدا ہونے سے اس کے مرنے تک جو اسلامی طریقے بتائے ہیں وہ معدودے چند ہیں جو انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں ۔ بچہ پیدا ہونے پر کانوں میں اذان دینا، کھجور چبا کر اس کو چٹانا، اچھا نام رکھنا، پھر عقیقہ کرنا، (اگر گنجائش ہوتو ، ورنہ یہ ضروری نہیں) ان سارے امور کے بعد تعلیم وتربیت وغیرہ اور بالغ ہونے کے بعد نکاح کا حکم ملتا ہے ۔ نکاح کے لیے چند شرائط اور مختصر سے احکام ہیں ۔ مثلاً عقدِ نکاح میں فریقین کی جانب سے دینداری کو ترجیح دینا۔ کفو کا خیال رکھنا، منکوحہ کو ایک نظر دیکھ لینا، عقد پر شیرینی یا کھجور تقسیم کرنا، اور نکاح کے بعد حسب استطاعت ولیمہ کرنا، بس یہ ہے اسلام یا مسلمانوں کے سیدھے سادے مراسم، لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، دولت وثروت میں اضافہ ہونے لگا نیز مذہب اسلام کا دائرہ دور دور تک پھیل گیا تو سماجی مراسم میں بھی دیگر اقوام سے میل جول کی وجہ سے اضافہ ہوتا گیا۔ ہندوستان میں زیادہ تر مغل، شہنشاہ اکبر اور دکن میں سلطان محمد قطب شاہ نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو ملانے کے لیے اس میں اتحاد واتفاق کی فضا کو قائم کرنے کے لیے بہت سی ہندو رسمات کو اپنا لیا تھا، یکجہتی پیدا کرنے کے لیے ایسے رسومات اختیار کئے جانے لگے جن کا اسلامی تہذیب یا مسلمانوں میں کہیں وجود نہیں تھا۔ مثلاً شادی اور نکاح کے موقع پر رسم مہندی، مانجھا، حلوہ، وغیرہ وغیرہ۔انہیں رسومات میں سے ایک مروجہ رسم جہیز کی تھی۔

ہندو چونکہ لڑکیوں کو اپنی جائداد میں سے حصہ نہیں دیتے تھے،اس لیے شادی کے وقت اکٹھا ہی جو کچھ میسر ہوتا جہیز کے نام سے لڑکیوں کے حوالے کر دیتے۔ ہندوؤں کی دیکھا دیکھی یہ رسم مسلمانوں میں جڑ پکڑنے لگی۔ یہاں تک کہ جہیز کو شادی سے جدا نہ ہونے والی چیز بنا دیا گیا۔

اس قبیح رسم کا حاصل یہ ہے کہ یہ رسم غریب والدین کے لیے مستقل دردِ سر بن گئی ہے۔ بظاہر اس سے چھٹکارا پانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اسلام ایک مکمل دین ہے جس نے زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی فرمائی ہے۔اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا طرز عمل ہمارے سامنے موجود ہے۔اور بعد میں ہمارے ائمہ مجتہدین اور فقہاء کرام نے کوئی ایسا مسئلہ نہیں چھوڑا جس کی قرآن وحدیث کی روشنی میں تفصیلات نہ بتا دی ہوں۔ مسائل اور ضروریات زندگی میں نکاح انسان کی طبعی،فطری اور بنیادی ضرورت ہے ،کوئی وجہ نہیں کہ اسلام جو کہ ایک فطری دین ہے اس سلسلے میں اپنے ماننے والوں کو رہنمائی نہ کیا ہو۔ انسانی نسل اور زندگی کو قائم رکھنے کے لیے نکاح چونکہ ایک لابدی چیز ہے،اس لیے شریعت اسلامیہ نے اسے کما حقہ اہمیت دی ہے،نکاح اور نکاح سے متعلق احکامات قرآن وحدیث میں بڑی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے جملہ حقوق کا تعین فرمایا۔ لیکن متاخرین فقہاء کی چند کتابوں میں جہیز کے سلسلے میں کچھ جزوی احکامات ملتے ہیں،اسے چھوڑ کر دیکھا جائے تو قرآن مجید میں،احادیثِ شریفہ میں اور فقہائے امت کی بڑی بڑی کتابوں میں کہیں مروجہ جہیز کا وجود نہیں ملتا۔ صحاح ستہ اور ائمہ اربعہ کی امہات کتب میں کہیں ''باب الجہیز'' کے عنوان سے کوئی باب نہیں۔ اگر یہ کوئی شرعی حکم ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ جہاں دیگر احکامات کے متعلق مثلاً نان

نفقہ مہر حسن معاشرت طلاق اور عدت وغیرہ تفصیلات بیان ہوئے وہاں جہیز کا بیان نہ ہوتا۔

سنن نسائی جلد دوم باب جہاز البنت کے ماتحت آنے والی حدیث سے ''مروجہ جہیز'' کو شرعی حکم سمجھا غلط ہے۔ بیوی کے جملہ جائز ضروریات اور اخراجات کا شرعاً ذمہ دار خاوند ہے، فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے، بیوی مسلمان ہو یا کتابیہ، اس کا ہر قسم کا خرچہ خاوند پر واجب ہے، جب کہ وہ (بیوی) اپنے آپ کو شوہر کے سپرد کردے اور اس کے گھر منتقل ہو جائے، اس خرچے میں روٹی، کپڑا اور مکان شامل ہے۔ اور اس حکم کی بنیاد باری تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ وسعت والے کو اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ جب رہنے کا مکان خاوند کے ذمہ ہے تو ایک رہنے کے مکان کے لیے جو بھی ضرورت کی چیزیں ہوتی ہیں اور اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے اور سونے کے لیے جن چیزوں کا استعمال میں لانا ضروری ہے اور جن کو ہماری اصطلاح میں ''جہیز'' کہا جاتا ہے، وہ بھی خاوند ہی کے ذمہ ہے۔ مالکی فقہاء کے نزدیک اگرچہ جہیز کے سامان کی تیاری عورت کے ذمہ ہے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ یہ سامان پیشگی رقمِ مہر سے بنائے گی، نہ کہ اپنے ذاتی مال یا والدین کے مال سے۔ اگر شوہر کی طرف سے کوئی پیشگی رقم رخصتی سے قبل اس کے پاس نہ بھیجی جائے تو اس پر سامانِ جہیز لازم نہیں ہے۔ اگر عورت نے پیشگی مہر میں سے کوئی چیز نہ لی ہو تو اس پر جہیز کا سامان مہیا کرنا لازم نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم تمام کو جہیز کی لعنت سے بچائے اور مروجہ جہیز کی تمام نحوستوں سے دور رکھے۔

مطبوعہ روزنامہ سالار 23/10/1998

جہیز ایک لعنت عظمیٰ

ہمارے مسلم معاشرے میں شادی بیاہ کے سلسلے میں جو بے شمار خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں اور جن غیر شرعی رسم و رواج نے اسے مشکل بلکہ قیامتِ صغریٰ بنادیا ہے ان میں ایک جہیز کی لعنت بھی ہے جس کی وجہ سے بہت سی غریب لڑکیوں کی شادی نہیں ہو پاتی یا ان کے لئے اچھے رشتے نہیں مل پاتے یا اس میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جو لڑکیاں اپنے میکے سے جہیز لے جاتی ہیں ان میں بھی اکثر غیر مطمئن اور لعنتوں کا شکار بنی رہتی ہیں اس لئے کہ جہیز کے حریص لڑکوں اور ان کے گھر والوں کی خواہش پورا کرنا مشکل ہے۔ ان لڑکوں کو بہت کچھ پانے کے باوجود کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس کمی کا غصہ ان لڑکیوں پر اتارتے رہتے ہیں اور پورا ماحول اس کے شیشۂ دل کو مجروح کرتا رہتا ہے، جس کی بناء پر مجبور لڑکیاں ایک قسم کی گھٹن محسوس کرتی رہتی ہیں۔ ان میں کتنی مہلک امراض کا شکار ہو جاتی ہیں اور کتنی لڑکیاں ان حالات کو برداشت نہ کرتے ہوئے خودکشی کر لیتی ہیں۔

اس سلسلے میں قرآن مجید میں اور احادیث نبوی ﷺ میں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک اور صنف نازک کے جذبات کو ٹھیس نہ لگانے کی جو تاکید آئی ہے اور خاص طور پر حدیث نبوی ﷺ میں اپنی بچیوں اور یتیم بہنوں کی تعلیم و تربیت اور حسن سلوک کی اہمیت اور فضیلت بیان کی گئی ہے اسے آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بتایا گیا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس پہلو کو نظر انداز کر کے لڑکے اور ان کے والدین معصوم بچیوں کی عزت و حرمت کو

جہیز کی کمیت و کیفیت کو تو لنے لگتے ہیں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ ماں اپنی بچی کو کس لاڈ و پیار سے اور ناز و نعمت سے پالتی ہے اور اس کے لئے ماں نے اپنی راتوں کی کتنی نیندیں حرام کرتی ہے اور باپ اپنے خون پسینے کی کمائی اس کی تعلیم اور تربیت پر صرف نہیں کرتا اور بچی جب جوان ہو جاتی ہے اس کے لئے رشتہ تلاش کرنے میں کتنے مصائب و آلام کا مقابلہ کرتا ہے۔

ان تمام پریشانیوں کے اٹھانے کے بعد ماں باپ اپنی نور نظر لخت جگر بچی کو ایک اجنبی مرد کو شوہر بنا کر ایک اجنبی خاندان کو اپنا خاندان بنا کر اس کے حوالے کر دیتے ہیں اب اس ہونے والے شوہر اور اس نئے خاندان کے لئے کتنی بے غیرتی کی بات ہے کہ اتنی قیمتی نعمت پا کر اس حقیر ترین چیزوں کا مطالبہ کریں اور اس کو لڑکی کی عزت و حرمت کی قیمت قرار دیں اور شریعت اور اخلاص اور مروت کی ساری قدروں کو چند کوڑیوں اور فنا ہونے والی چیز کے لئے پامال کر ڈالے جبکہ ہر لڑکے کو یہی بات اپنی بہن کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ اس وقت معاملہ الٹا ہوتا ہے اس میں ہر طرح کی آسانی چاہتا ہے کاش کہ یہ حدیث شریف ہم لوگوں کو یاد ہوتی ،فرمایا حضور ﷺ نے کہ لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو تو تم مسلمان ہو جاؤ گے۔ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو تو مومن ہو جاؤ گے۔ ایسے مہلک مرض کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کیلئے علما دانشور حضرات کو ایک مہم چلانا چاہئے اور امت بھی علمائے کرام کی باتوں پر عمل کریں تو دونوں جہان میں سرخ روئی ہوگی۔

جہیز کے معنی اسباب اور سامان کے ہیں اصطلاحاً اس سروسامان کو کہتے ہیں جو لڑکی کے نکاح میں اس کے ہمراہ دیا جاتا ہے۔ ہر ملک ہر علاقے میں جہیز مختلف صورتوں میں دیا جاتا ہے لیکن عام طور پر زیورات نقدی اور کپڑوں اور روزانہ استعمال کے برتنوں پر مشتمل ہے۔

فقہ السنہ میں سید سابق لکھتے ہیں کہ جہیز وہ سامان ہے جسے عورت خود یا اس کے گھر والے تیار کرتے ہیں تا کہ جب وہ بیاہ کر خاوند کا گھر بسائے تو یہ سامان اس کے ساتھ ہو تہذیب وتمدن معاشرت وثقافت میں جب ترقی ہوتی ہے تو دولت وثروت کی فراوانی ہونے لگتی ہے بچے کے پیدا ہونے سے مرنے تک نئے نئے رسوم اور طریقے ایجاد ہوتے ہیں بلکہ مرنے کے بعد اس کا سلسلہ باقی رہتا ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے بچے کے پیدا ہونے سے مرنے تک جو مراسم انجام دے کر رہبری فرماتی ہے وہ معدود گنے چنے ہیں، جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں بچہ پیدا ہونے پر کانوں میں اذان دینا کھجور چبا کر اس کو چٹانا اچھا نام رکھنا پھر عقیقہ کرنا (اگر گنجائش ہو تو ورنہ یہ ضروری نہیں) ان سارے امور کے بعد تعلیم وتربیت وغیرہ اور بالغ ہونے کے بعد نکاح کا حکم ملتا ہے۔ نکاح کے لئے چند شرائط اور مختصر سے احکام ہیں مثلاً عقد نکاح میں فریقین کی جانب سے دینداری کو ترجیح دینا، کفو کو خیال رکھنا، منکوحہ کو ایک نظر دیکھ لینا، عقد پر شیرینی یا کھجور تقسیم کرنا اور نکاح کے بعد حسب استطاعت دعوت ولیمہ کرنا بس یہ ہے اسلام یا مسلمانوں کے سیدھے سادے مراسم، لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا دولت و ثروت میں اضافہ ہونے لگا نیز مذہب اسلام کا دائرہ دور دور تک پھیل گیا تو سماجی مراسم میں بھی اضافہ ہوتا گیا ہندوستان میں زیادہ تر مغل شہنشاہ اکبر اور دکن میں سلطان محمد قطب شاہ نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو ملانے کے لئے اس میں اتحاد اور اتفاق کی فضا کو قائم رکھنے کے لئے بہت سی ہندو رسومات کو اپنا لیا تھا۔ یکجہتی پیدا کرنے کی خاطر ایسے رسومات اختیار کرنے لگے جن کا اسلامی تہذیب یا مسلمانوں میں پہلے سے کہیں وجود نہیں تھا، مثلاً شادی اور نکاح کے موقع پر رسم مہندی، مانجھا، حلوہ وغیرہ وغیرہ

انہیں رسومات میں ایک مروجہ رسم جہیز کی تھی ہندو چونکہ لڑکیوں کو اپنی جائیداد میں سے حصہ نہیں دیتے تھے اس لئے شادی کے وقت اکٹھا ہی جو کچھ میسر ہوسکا جہیز کے نام سے لڑکی کے حوالے کر دیا کرتے تھے ہندوؤں کی دیکھا دیکھی یہ رسم مسلمانوں میں جڑ پکڑنے لگی یہاں تک کہ جہیز کو شادی سے جدا نہ ہونے والی چیز بنا دیا گیا اور اس رسمِ قبیح کا حاصل یہ ہوا کہ غریب والدین کے لئے دردِ سر بن گئی۔

بظاہر اس سے چھٹکارہ پانے کی کوئی صورت ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے اسلام ایک مکمل دین ہے جس نے انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی فرمائی ہے اور خود نبی کریم ﷺ اور حضرات صحابہ کرام کا طرزِ عمل ہمارے سامنے ہے اور بعد میں ہمارے ائمہ مجتہدین اور فقہائے عظام نے کوئی ایسا مسئلہ نہیں چھوڑا جس کی قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت نہ فرمادی ہو۔ضروریات انسانی میں نکاح اور شادی انسان کی طبعی فطری اور بنیادی ضرورت ہے کوئی وجہ نہیں کہ اسلام جو ایک فطری دین ہے اس سلسلے میں اپنے ماننے والوں کی رہنمائی نہ فرمائے ، انسانی نسل اور زندگی کو قائم رکھنے کے لئے نکاح چونکہ ایک لابدی چیز ہے اس لئے شریعت اسلامیہ نے اسے کما حقہ اہمیت دی ہے۔

نکاح اور نکاح سے متعلق احکامات قرآن اور حدیث میں بڑی تفصیل سے بیان ہوئے اور رحمتِ دوعالم ﷺ نے عورتوں کے جملہ حقوق کا تعین فرمایا اور کوئی شعبہ نہ چھوڑا لیکن متاخرین فقہاء کی چند کتابوں میں جہیز کے سلسلے میں کچھ جزوی احکامات ملتے ہیں ورنہ قرآن مجید میں، کتب احادیث میں، فقہا متقدین کی کتابوں میں کہیں مروجہ جہیز کا وجود نہیں ملتا۔

صحاح ستہ اور ائمہ اربعہ کی امہات الکتب میں کہیں باب الجهيز کے عنوان

سے کوئی کتاب نہیں اگر یہ کوئی شرعی حکم ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کی جہاں نکاح سے متعلق دیگر احکامات مثلاً نان ونفقہ مہر حسن معاشرت طلاق اور عدت وغیرہ کا تفصیلی بیان ہے وہاں جہیز کا بیان نہ ہو۔ سنن نسائی جلد دوم باب جھاز البنت کے ماتحت آنے والی حدیث سے مروجہ جہیز کو شرعی حکم سمجھنا غلط ہے بیوی کے جملہ جائز ضروریات اور اخراجات کا شرعاً ذمہ دار خاوند ہے۔ فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے بیوی مسلمان ہو یا کتابیہ اس کا ہر قسم کا خرچہ خاوند پر واجب ہے جبکہ وہ (بیوی) اپنے آپ کو شوہر کے سپرد کر دے اور اس کے گھر منتقل ہو جائے اس خرچہ میں روٹی کپڑا اور مکان داخل ہے اور اس حکم کی بنیاد پر باری تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ ''وسعت والے کو اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرنا چاہئے'' ظاہر ہے کہ جب رہنے کا مکان خاوند کے ذمہ ہے تو ایک مکان میں رہنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہو سکتی ہے اور اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے اور سونے کے لئے جن چیزوں کا استعمال میں لانا ضروری ہے اور جن کو ہمارے اصطلاح میں جہیز کہا جاتا ہے وہ بھی خاوند کے ہی ذمہ ہے۔

مالکی فقہا کے نزدیک اگرچہ جہیز کے سامان کی تیاری عورت کے ذمہ ہے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ یہ سامان پیشگی رقم مہر سے بنائے گی نہ کے اپنے ذاتی مال یا والدین کے مال سے اگر شوہر کی طرف سے پیش کی گئی کوئی رقم رخصتی سے قبل اس کے پاس نہ بھیجی جائے تو اس پر سامان جہیز لازم نہیں ہے۔ اگر عورت نے پیشگی مہر میں سے کوئی جہیز نہ لی ہو تو اس پر جہیز کا مہیا کرنا لازم نہیں۔ سید سابق نے اسی کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے لکھتے ہیں کہ شرعی طور پر گھر کے لئے ہر اس کا مہیا کرنا جس کی احتیاج ہوتی ہے مثلاً سامان بسترے برتن وغیرہ کا ذمہ دار خاوند ہے ان مذکورہ چیزوں کے بارے میں عورت سے سوال

نہیں کیا جائے گا حتی کہ اگر مہر کی رقم سامان بیت (گھریلو سامان) کی نیت سے زیادہ رکھی جائے تو بھی عورت پر گھریلو سامان لازم نہیں کیوں کہ مہر کی رقم اس عورت سے فائدہ اٹھائے جانے کے مقابلے میں ہے نہ کہ سامان جہیز کی تیاری کے لئے ہے۔ مہر میں صرف اور صرف بیوی کا حق ہے اس میں نہ والدین کا حق ہے نہ شوہر کا حق ہے۔

یہ بات تو ثابت ہوگئی ہے کہ سامانِ جہیز شرعاً شوہر کے ذمہ واجب ہے۔ جب بیوی اس کے گھر جائے تو جملہ جائز ضروریات کا وہ ضامن ہے مگر اس پر یہ لازم نہیں کہ عین شادی کے موقع پر (جیسا کہ ہمارے معاشرے میں رواج ہے لوگوں کے سامنے اس کی نمائش کرتے رہے غریب لوگ بھی ان سارے زیورات اور کپڑے فرنیچر اسکوٹر کار وغیرہ چیزوں کو دیکھ کر اپنے دلوں میں ارماں لگائے افسوس کرتے رہ جاتے ہیں) دورِ نبوی ﷺ میں سوائے حضرت فاطمہ زہرہؓ کی شادی کے موقع پر کوئی شادی ایسی نظر نہیں آئی کہ عین شادی کے موقع پر خاوند کی طرف سے جہیز کا سامان دیا گیا ہو۔ حضرت فاطمہ زہرہؓ کے سامان کی پیشگی تیاری کی ضرورت بھی صرف اس لئے آئی کہ حضرت علی المرتضیٰ حضور ﷺ کے زیر کفالت تھے، ان کا الگ مکان یا گھریلو ساز و سامان نہ تھا اور نہ حضور ﷺ ازواجِ مطہرات کی باقی تینوں بناتِ اطہر کی شادیوں کے موقع پر ایسا ہوا نہ ہی اپنی ازواجِ مطہرات کے ساتھ نکاح کے موقع پر کسی قسم کا جہیز دیا گیا ہے۔

آخر زندگی بھر میں بیوی کو جو کچھ کھانا پینا دوا کرنا ہے وغیرہ وغیرہ اسے تو کوئی نہیں دکھاتا۔ امام غزالی نے لکھا ہے کہ حضرت بلال حبشیؓ اور حضرت صہیبؓ ایک قبیلے کے پاس آئے اور انہیں پیغامِ نکاح دیا انہوں نے پوچھا تم کون لوگ ہو؟ ان لوگوں نے کہا کہ ہم گمراہ تھے، ہمیں اللہ نے ہدایت نصیب فرمائی؛ ہم غلام تھے، اللہ نے ہمیں آزاد فرمایا؛ ہم غریب پریشان حال تھے، اللہ نے ہمیں مالدار غنی بنایا؛ اگر تم ہم سے اپنی لڑکیوں کی شادی

کردوتو الحمد اللہ اور اگر نہ کروتو سبحان اللہ! ان لوگوں نے (قبیلے والوں نے) کہا گھبراؤ نہیں تمہاری شادی کردی جائے گی اور سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔

اس واقع میں کہیں جہیز لانے کا ذکر نہیں ہے اگر اس دور میں جہیز کا رواج ہوتا تو ضرور جہیز کے تعلق سے بات ہوتی معلوم ہوا کہ جہیز کی لعنت اب شروع ہوئی ہے اگر کوئی آدمی عورت کے نان ونفقہ کی استطاعت نہیں رکھتا تو وہ شادی کا مکلّف ہی نہیں ہے (مشکوٰۃ ۲٦۷)

یہ بات معلوم ہوگئی کہ سامان شوہر کے ذمہ ہے **المحلی لا بن حزم** میں ہے کہ عورت کو اس بات پر مجبور کرنا جائز نہیں ہے کہ وہ خاوند کے پاس سامان لائے نہ ہی اس مہر کی رقم سے جو خاوند نے اسے دی ہے اور اس کے دوسرے اپنے مال سے سامان لائے مہر سارے کا سارا اس کی ملکیت ہے اس میں وہ (بیوی) اپنی مرضی سے جو چاہے کرے۔

نکاح شریعت میں محض شہوت کی تسکین کا ذریعہ نہیں بلکہ اس بندھن سے متعدد دینی، دنیاوی، ظاہری، باطنی ،جسمانی، روحانی، معاشرتی، تمدنی اور عمرانی فوائد مقصود ہیں۔ قرآنی مفہوم میں نکاح اولاً میاں بیوی کا درمیان اور زوجین کے خاندانوں کے درمیان تسکین وطمانیت قلوب محبت ومورت شفقت و رحمت کا ایک موثر سبب ہے آنحضرت ﷺ نے سب شادیاں اسی نقطہ نظر سے فرمائیں ۔یہی وجہ ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے سوا حضورِ کونین ﷺ کی تمام ازواج مطہرات بیوہ تھیں اسلامی نقطہ نظر سے اس پاکیزہ رشتہ کو تجارت کا درجہ دیدینا یا ذریعہ تجارت بنالینا جائز نہیں۔

تمام کتب حدیث میں کتاب النکاح کے اندر ایسی بہت سی روایتیں ملتی ہیں جس میں رحمتِ عالمین ﷺ نے مال ومنال اور دولت وثروت کے حصول اور طمع و لالچ

میں نکاح کرنے کو ناپسند فرمایا ہے صرف ناپسند نہیں بلک بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے منع فرمایا مثلاً عورتوں کے ساتھ محض ان کے حسن و جمال کی وجہ سے نکاح نہ کرو اور نہ ہی ان کے اموال کے لالچ میں ان سے نکاح کرو پھر یہ کہ نکاح سے مقصود نسلِ انسانی کی بقاء اور تناسل ہے نہ کہ مال و دولت حاصل کرنے کے اور بہت سے راستے ہیں۔

نکاح کے مقاصد میں سب سے بڑا مقصد چونکہ لینا حصولِ اولاد اوران کی تربیت اور اچھے افراد معاشرے میں پیدا کرنا ہے اس لئے نکاح میں شرعاً سب سے زیادہ قابلِ لحاظ دینداری اور حسنِ اخلاق ہے حدیث شریف میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''عموماً چار چیزوں کی وجہ سے نکاح کیا جاسکتا ہے (۱) اس کے مال کی وجہ سے (۲) اس کے حسب و نسب کی وجہ سے (۳) اس کے حسن و جمال کی وجہ سے (۴) اس کی دینداری کی وجہ سے پس دین والی عورت کے ساتھ نکاح کر کے کامیاب ہوں۔

اسی طرح لڑکی کے لئے ہدایت ہے کہ وہ انتہائی جدید تعلیم یافتہ کسی اعلیٰ منصب پر فائز ملک سے باہر یا سرمایہ دار اور جاگیر دار کاروباری لڑکے ہی کو تلاش نہ کرتے رہیں اس سے بچی کی عمر ختم ہوتی چلی جاتی ہے یا وہ کسی گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ رہتا ہے بلکہ اگر میں کہوں تو یہ خطرہ بڑھتا چلا جا رہا ہے اگر کسی دیندار لڑکے کا رشتہ آئے تو فوراً اس رشتے کو قبول کریں۔ (لڑکے کے سارے حالات اور اس کا بیک گراونڈ جاننے کے بعد) تا کہ معاشرہ میں جنسی بے راہ روی جنم نہ لے

ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ اگر تمہاری طرف کوئی ایسا آدمی پیغامِ نکاح بھیجے جس کے دین اور اخلاق کو پسند کرے تو اس سے اپنی لڑکی کا نکاح کر دو اگر ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور فساد پھیلے گا جیسا کہ آج کل مشاہدہ کیا جا رہا ہے ہر طرف فتنہ و فساد عام ہوتا جا

رہا ہے حدیثوں میں واضح طور سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح میں دینداری ہی قابلِ اعتبار ہے نہ کہ صرف مال و دولت اور حسن و جمال۔ حضور ﷺ کے اس ارشاد پر غور کیا جائے تو لڑکے اور لڑکیوں کے شادی کے مسائل آج کل اس قدر پریشان کن نہ ہوتے اور صحیح طریقے سے غور کریں گے تو اسطرح معاشرتی اور جنسی برائیوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔

شادی کے موقع پر والدین اپنی بچی کو سامان خرید کر یا جمع کر کے دیتے ہیں اس کو سنت سمجھتے ہیں حالانکہ یہ سنت نہیں ہے اس غلط فہمی کو امام حنبل اور دوسرے ائمہ اپنی اپنی روایتوں میں دور کیا ہے۔

حضرت علی المرتضیٰؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت فاطمہؓ کو تیار کیا تو ایک چادر مشکیزے اور ان کے تکیے میں اذخر کے گھاس بھر کر تھے اس روایت سے مروجہ جہیز سمجھنا غلط ہے، حضرت فاطمہؓ کو جو مذکورہ چیزیں دی گئیں وہ حضور ﷺ کی طرف نہیں دی گئی تھیں، اگر اس طرح ہوتا تو حضور ﷺ اپنی دوسری صاحبزادی کو بھی دیتے تھے۔

حضرت علی نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا کہ کیا آپ ﷺ فاطمہؓ کا رشتہ مجھے پسند فرمائیں گے؟ آپ ﷺ نے پوچھا کیا تمہارے پاس (مہر کے لئے) کچھ مال ہے۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا گھوڑا اور زرہ ہے۔ فرمایا کہ گھوڑے کی تمہیں بہر حال ضرورت رہے گی اس زرہ کو فروخت کردو۔ چنانچہ یہ زرہ حضرت عثمان بن عفانؓ کے ہاتھ ۴۸۰ درہم میں فروخت کردی گئی، بعد میں حضرت عثمانؓ نے یہ زرہ دوبارہ حضرت علیؓ کو لوٹا دی تھی۔ حضرت علیؓ وہ رقم لیکر آپ ﷺ کی خدمت میں آئے حضور ﷺ نے حضرت عثمانؓ کے حق میں دعائے خیر کی۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی نے رقم کو حضور ﷺ کی گود میں رکھ دی۔

حضورﷺ نے اس میں ایک مٹھی بھر کر فرمایا کہ بلالؓ! اس رقم کی خوشبو خرید کر ہمارے پاس لاؤ اور پھر حضور اقدس ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ فاطمہؓ کا سامان تیار کرو۔ چنانچہ ان کے لئے ایک بنی ہوئی چارپائی اور ایک چرمی تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی تیار کیے گئے۔

عموماً رسوم کی ابتداء نیک جذبات باہمی رضامندی و تعاون اور اعلیٰ مقصد کے ماتحت کی جاتی ہے لیکن زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ اسراف تکلف اور دکھاوہ آتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ پورے معاشرے کے لئے کئی ایک مسائل کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی رسم جہیز کا ہوا ہے ہمارے ہاں کچھ نوابوں، مالداروں، جاگیر داروں، سودخوروں اور رشوت خوروں نے اپنی بے محنت اور ناجائز طریقے سے کمائی ہوئی دولت کی نمائش اپنی بیٹیوں کی شادیوں میں جہیز کی شکل میں اس طریقے سے کی کہ ان کی دیکھا دیکھی متوسط طبقے کے لوگ بھی ان کے نقشِ قدم پر چل نکلے اب بیرونی ممالک کے ڈالر پونڈ ریال نے اس کو وبالِ جان کر دیا ہے۔ جہیز کی شکل میں اپنی دولت کی نمائش اور اظہارِ برتری (لوگوں میں جھوٹی شان) کی ایک دوڑ لگ گئی ہے۔

ہر آدمی ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی فکر میں ہے، جہیز صرف ضرورت کی چیزوں تک محدود نہ رہا بلکہ جہیز کے نام پر عیش وعشرت کے سامان مثلاً کار بنگلہ پلاٹ فریج ٹی وی، وی سی آر اور اے سی وغیرہ وغیرہ کے انبار لگنا شروع ہوگئے ہیں۔

مسندِ احمد کی مختصر شرح احمد عبدالرحمان نے ایک سچی تصویر کھینچی ہے فرماتے ہیں ہمارے زمانے کے لوگ جہیز کے معاملے میں ایسے اسراف اور فضول خرچی میں پڑ گئے ہیں جسکی کوئی ضرورت نہیں اور مقصود صرف اپنی بڑائی کو ظاہر کرنا ہے یہاں تک کہ فقیر اور غریب آدمی اپنی بیٹی کو جہیز دینے کے لئے اپنے گھر کے سامان تک فروخت کر دیتا ہے اور

قرض کا بڑا بوجھ اٹھاتا ہے حالانکہ اس کا یہ کام (قرض لینا دکھاوے کے لئے) حرام ہے۔

اب ذرا یہ بھی دیکھئے کہ اگر ایسا نہیں کرتا تو برادری میں سوسائٹی میں اس کی ناک کٹتی ہے، لوگوں میں جھوٹی شان کے لئے اپنی پوزیشن کو باقی رکھنے کے لئے اور اپنے آپ کو بڑا مالدار بتانے کے لئے شہرت حاصل کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا جاتا۔ حلال و حرام میں فرق کئے بغیر دولت کماتا ہے چیزوں میں ملاوٹ اصل دکھا کر نقل دیتا ہے ترازو میں کمی کرتا ہے لوگوں کو دھوکا دیتا ہے وغیرہ وغیرہ

اس سے بڑھ کر یہ کہ جہیز مہیا کرنے کے لئے لڑکی خود ملازمت کرتی ہے دفاتر بینکوں میں اور شاپنگ سینٹرس میں غیر مردوں کے ساتھ میل جول ہوتا ہے بسوں میں دھکے کھانے پڑتے ہیں وغیرہ۔ بعض بیچاری مجبور ہیں اگر ایسا نہیں کریں تو سامانِ جہیز نہیں بنتا اگر سامانِ جہیز نہیں بنتا تو انہیں بطورِ بیوی کوئی قبول کرنے تیار نہیں ہوتا۔ بہت سی ایسی لڑکیاں بھی ہیں جن کے ارمانوں کا محض جہیز نہ ہونے کی وجہ سے خون ہوتا رہتا ہے۔

لوگوں میں اپنا نام اونچا رکھنے کے لئے قرض جیسا بوجھ اٹھایا جاتا ہے قرض دار کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ محبّ الفقراء والغربا والمساکین کی ذاتِ بابرکت نے بھی مقروض کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے گریز فرمایا ہے بعض مرتبہ جہیز کے لئے قرض کا بوجھ اٹھانے والا والد بھائی اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے بعد میں اس کی اولاد یا بھائی بہن طویل مدت اس بوجھ تلے دبی کراہتی رہتی ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ شادی پر لڑکی کو والدین کا جہیز دینا کوئی شرعی حکم نہیں ہے نہ ہی یہ نکاح کے لوازم میں سے ہے اور نا ہی سنت ہے جہیز کا جملہ سامان مہیا کرنے کا ذمہ دار شوہر ہے گھریلو سامان تو الگ رہا نبی آخر الزماں ﷺ نے حضرت

فاطمہؓ کے لئے خوشبو بھی مہر کی رقم سے منگوائی یہ سب کچھ تعلیم امت کے لئے تھا ورنہ آپ ﷺ اگر چاہتے تو احد کے پہاڑ کو سونا بنا کر حضرت فاطمہؓ کو جہیز میں دے دیتے۔ اس کے باوجود یہ رسم (والدین کا شادی کے موقع پر سامان جہیز دینا) ہمارے معاشرے میں جڑ پکڑ چکی ہے دوسری بات یہ ہے کہ پوری تقاضے کے تحت کوئی باپ یہ نہیں چاہتا کہ وہ اپنی نورِ نظر لختِ جگر کو ہمیشہ کے لئے رخصت کرتے وقت بطورِ نشانی دکھ نا دے تو اس رسم کو چند قیود کے ساتھ (الاصل فی الاشیاء الاباحت) کے تحت مباح کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

جس ہندو معاشرہ سے یہ رسم آئی تھی جس کے بغیر شادی ہی نہیں ہو سکتی اور جس کی وجہ سے معاشرہ میں کئی ایک معاشی معاشرتی اور اخلاقی برائیاں جنم لے رہی ہیں بلا ضرورت زیادہ ساز و سامان شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہے ایسے سامان کی کیا ضرورت کیا فائدہ جس کے استعمال کی زندگی بھر نوبت نہ آئے اور وہ صرف کمروں کی زینت بنا رہے نہ دین کا فائدہ نہ دنیا کا فائدہ اور پھر اس مقصد کے لئے بلا ضرورت اتنا قرض اٹھانے کی کے ضرورت کہ انسان بعد میں ساری زندگی قرض کے بوجھ تلے کراہتا رہے شادی کے موقع پر سامان جہیز برادری یا اہل محلّہ کو دکھانے کی قطعی پابندی لگائی جائے یہی دکھاوا فساد کی جڑ ہے اسی سے مسابقت کا جذبہ اور رجحان پیدا ہوتا ہے والدین آخر اپنی بیٹیوں کو صرف شادی کے موقع پر ہی نہیں دیتے وہ تو ساری زندگی حسبِ استطاعت وحسبِ توفیق اپنی بیٹیوں کو ہدایہ تحائف دیتے رہتے ہیں شادی کے بعد کچھ دیا جاتا ہے تو وہ کبھی نہیں دکھایا گیا جب معاملہ یوں ہے تو شادی کے موقع پر یہ ساز و سامان کی نمائش کی کیا ضرورت؟ جب یہ پابندیاں لگ جائیں تو پھر اس چیز کی بھی ضرورت نہ رہے گی تو اتنی مالیت کا جہیز ہو سکتا ہے ورنہ تو قانوناً ہوگا۔

زیوارت کپڑے فرنیچر، اثاث البیت ظواہر معیشت ہیں اسلام میں معاشی مساوات تونہیں مگر ظواہر معیشت اور ظاہری بودو باش میں مساوات ضروری ہے اجنبی آدمی کوصحابہ کرام رضی اللہ عنھم اجمعین کی مجلس بیٹھے ہوئے نبی کریم ﷺ کون ہے کر کے دریافت کرنا پڑتا تھا ایک صحابیؓ نے اپنے مکان پر بالا خانہ بنوالیا تو اس صحابیؓ سے حضور ﷺ نے اعراض (منہ موڑ لیا) فرمایا۔یہی حال خلفائے راشدین کا تھا قیصر و کسریٰ کے خزانے ہونے کے باوجود خلیفۃ المسلین اور دیگر عام آدمیوں میں کوئی ظاہری اور نمایاں فرق نہ تھا کوفہ وبصریٰ کے شہر آباد کئے گئے تو ہدایت دی گئی کہ تین کمروں سے زیادہ کمرے والا مکان نہ بنایا جائے لہٰذا ظواہر معیشت میں مساوات قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سامان جہیز ہی نہیں بلکہ تقریب نکاح میں شامل مستورات کے زیورات اور ملبوسات میں بھی میانہ روی کو رواج دیا جائے اور لوگوں کے سامنے زیب و زینت اور تکبر سے بچا جائے کیونکہ یہ شیوۂ قارون ہے قرآن کہتا ہے **وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ** کے مترادف ہے۔

افسوس ہے کہ ہمیں دنیا کے سامنے تو اپنی ناک اونچی رکھنے کی فکر ہے مگر میدان محشر میں اپنے آقا و مولا کے روبرو ناک سرخ رو ہونے کی فکر نہیں رکھتے۔آیئے ہم عہد کریں جو بھی کام کریں خدا کی خوش نودی ہمارا مقصود و مطلوب ہو اور جہیز جیسے کینسر کے خاتمہ کا بھی عہد کریں ۔خدا تعالی ہمیں لوگوں سے بھیک مانگنے والے کے بجائے لوگوں کو دینے والا بنائے اور مخلوق کے بجائے خالق کے خزانۂ قدرت سے ہمیں اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے والا بنائے۔(آمین)

معاشرے کی بدنظمیاں اور ان کا سدباب

جب بچی جوان ہوجاتی ہے تو والدین کو یہ فکر ستانے لگتی ہے کہ جلد سے جلد جہاں کہیں سے بھی رشتہ آئے چاہے برسرِ روزگار ہو یا نہ ہو، دیندار متقی پرہیزگار ہو یا نہ ہو، بچی کی شادی کر کے اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں۔ پوری طرح سے یہ تحقیق بھی نہیں کرتے کہ لڑکے کا بیک گراونڈ کیسا ہے۔ اس کے اخلاق و کردار کیسے ہیں اور وہ لڑکا کچھ کماتا بھی ہے یا نہیں۔

اس لیے منگنی سے پہلے والدین کی یہ ذمہ داری ہے کہ لڑکے کے متعلق صحیح طریقے پر اور پوری طرح سے تسلی کرلیں، اور مکمل طور پر تسلی ہو جانے کے بعد رشتہ مضبوط اور پکا کریں۔ منگنی ہو جانے کے بعد لڑکا اور لڑکی دونوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ میاں بیوی کو ان کے آپس کے حقوق سمجھاتے رہیں۔ لڑکی کو یہ بتایا جائے کہ شوہر کیا ہوتا ہے، اس کا مقام و مرتبہ کیا ہے۔ سسرال میں لڑکی کو کس طرح رہنا چاہیے اور ساس اور سسر کا مرتبہ کیا ہے؟ لڑکے کے والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ لڑکے کو سمجھائیں کہ بیوی کی حیثیت کیا ہوتی ہے، اور اس کے حقوق کیا ہیں اور بیوی کے ساتھ کس طرح زندگی گزارنا چاہیے۔ اگر شادی سے پہلے ہی دونوں کو ان تمام باتوں کا علم ہو جائے تو انشاء اللہ قوی امید ہے کہ شادی کے بعد کسی طرح کا مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ اور معاشرہ بہت ساری خرابیوں سے پاک ہو جائے گا۔

حضرات علماء کرام کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کو زندگی کے ہر مرحلے کی رہنمائی کریں، خصوصاً ازدواجی زندگی کے مسائل وغیرہ معلوم کرانا ضروری ہے۔ نکاح کی محفل اس کے لیے ایک بہترین موقع ہوتا ہے۔ اس لیے نکاح پڑھانے والے کو چاہیے کہ نکاح سے

پہلے آدابِ نکاح، شوہر و بیوی کے حقوق اور مہر کی شرعی حیثیت وغیرہ اچھی طرح سمجھائیں۔ دراصل خطبۂ نکاح کا مقصد بھی یہی ہے، اس لیے بہتر ہے خطبۂ نکاح میں اللہ رب العزت کیا بتانا چاہتا ہے، اسے بیان کریں اور خطبے کا ترجمہ بھی پڑھ کر سنا دیں تاکہ نئی زندگی کا سبق قرآن ہی سے حاصل کیا جائے، اس طرح کریں گے تو ایمان میں تازگی آتی ہے۔

نکاح خوان کو چاہیے کہ طرفین کو ترغیب دلا کر مہر لڑکے سے حسب استطاعت متعین کرائیں اور نکاح کی مجلس ہی میں مہر ادا کر دیا جائے ورنہ اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ بہت سارے لوگ جو دادا اور نانا بن گئے ہیں اس بات سے واقف ہی نہیں ہے کہ مہر بھی کوئی ادا کرنے کی چیز ہے۔ اگر میں اپنے بزرگوں کو اس بات کی طرف متوجہ کروں تو بے ادبی نہ ہوگی کہ وہ اپنی بیویوں کو ہزاروں کے زیورات اور اشیاء دلاتے ہیں مگر مقررہ مہر ادا نہیں کرتے، جب شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے تو بڑی خواتین، بچی کو جنازے کے پاس لاکر کھڑا کر دیتے ہیں اور مہر بخشوانے کہتے ہیں جو کہ سراسر غلط ہے۔

بعض جگہ لڑکی والے مہر کی رقم لکھوانے میں بہت ہی ہٹ دھرمی کرتے ہیں پچیس ہزار، پچاس ہزار لکھیں۔ (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی بچی کا سودا کر رہے ہیں) جب کہ اس کے ادا کرنے کی لڑکے میں بالکل طاقت نہیں ہوتی۔ اس طرح مہر کی رقم کے ساتھ اخیر میں ۷۸۶ لکھاتے ہیں، جس کی نہ قرآن میں دلیل ہے نہ حدیث میں۔ بہتر یہ ہے کہ اس رواج کو ختم کیا جائے۔

اگر ان باتوں کے ساتھ قاضی، نکاح خواں، لوگوں کو طلاق کے مسائل سے بھی آگاہ کر دیں اور لوگوں کو معلوم کرا دیں کہ نکاح کے بعد ان دونوں کا رشتہ کیا ہوگا اور ان پر کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں تو بہتر ہے۔ ورنہ آج کل یہ عام ہو گیا ہے کہ لوگ علماء کرام کو یہ پوچھ پوچھ کر پریشان کرتے رہتے ہیں کہ میں نے غصے کی حالت میں طلاق دی، اب مجھے

اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے، لہٰذا ہمیں ملا کر چھوڑ دیں۔ اب بتایئے بھلا تین گولیاں بلا سوچے سمجھے چلا دے تو اب پچھتانے سے کیا فائدہ۔ گولی چلانے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔

میں نے یہاں تک بھی دیکھا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان آپسی اختلافات کی بناء پر شوہر تین طلاق پکار دیتا ہے، اس کے باوجود بھی اپنی بیوی کے ساتھ مل کر رہتا ہے، جب کہ دونوں کا مل کر رہنا حرام ہے، بعض عورتوں کو میں نے یہ بھی کہتے ہوئے سنا کہ جب سے شادی ہوئی ہے، میرے شوہر غصے اور نشے کی حالت میں بار بار طلاق پکارتے ہیں اور میں انہیں معاف کر کے زندگی گزار رہی ہوں۔ گویا یہ سمجھتے ہیں کہ طلاق کا لفظ پکارتے رہو اور معافی تلافی کر کے زندگی گزارتے رہو۔ اگر پہلے ہی دونوں کو ان باتوں سے آگاہ کر دیا جائے تو امید ہے کہ یہ ساری باتیں نہ ہوں گی۔

مسجد کے ذمہ داروں سے گزارش ہے کہ نکاح نامے کی کاپیاں نکاح کے فوری بعد زوجین کے سرپرستوں کے حوالے کر دی جائیں، تاکہ آئندہ پریشانی نہ ہو۔ اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ لڑکا لڑکی جب سعودی جاتے ہیں تو اس وقت نکاح نامہ حاصل کرنے کے لیے مسجد کے چکر کاٹتے ہیں، کبھی صدر صاحب نہیں کبھی متولی صاحب نہیں۔ سکریٹری صاحب کبھی متولی صاحب نہیں، کبھی سکریٹری صاحب نہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ اسی وقت زوجین کے ذمہ داروں کو اس کی نقل دے دیں۔ اگر والدین، نوجوان، علماء کرام اور مساجد کے ذمہ دار حضرات ان تمام باتوں کا خیال رکھیں تو انشاء اللہ ازدواجی زندگی کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ کسی کو پولیس، تھانہ، کورٹ یا دارالقضاء کے چکر کاٹنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ معاشرہ کی اصلاح کا یہ ایک تشنہ پہلو ہے، جس کی طرف توجہ دینا نہایت ضروری ہے۔

مطبوعہ روزنامہ سالار 25/10/1998

مصیبتیں اور ان سے نجات کا راستہ

دنیا میں جب بھی کوئی حادثہ پیش آتا ہے، کوئی بین الاقوامی، ملکی، ریاستی، ضلعی، علاقائی سیاسی یا غیر سیاسی واقعہ رونما ہوتا ہے تو عام لوگوں کی نظر ملک کے حکمرانوں، قوم کے سرداروں کا کسی تنظیم کے سربراہوں پر پڑتی ہے، اور سب لوگ اس واقعہ یا حادثے کا سبب اور ذریعہ ان میں سے کسی ایک کو سمجھنے لگتے ہیں، وہ لوگ جو کسی واقعے کے سرزد ہونے پر اپنی نظریں صرف اور صرف اصل محرک کے بجائے کسی اور طرف لے جاتے ہیں، ان کی عقلیں ابھی کچی اور ناپختہ ہوتی ہیں، یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے ہر چھوٹے بڑے، معمولی غیر معمولی واقعات و حادثات کا اصل سبب اور محرک اللہ رب العزت ہے، جس کے تصرف میں زمین و آسمان اور اس کے درمیان کی ہر چھوٹی بڑی چیز ہے۔ ایک عام انسان کی نظر اور ایک مومن و مسلمان کی نظر میں اتنا فرق ضرور ہونا چاہیے کہ کسی بھی واقعے کے رونما ہوتے ہی اس کی نگاہ اس خالق و مالک حقیقی کی طرف جائے جس کے ارادے سے دنیا کا ہر حادثہ اور واقعہ وقوع پذیر ہوتا ہے، جو لوگ صرف اسباب پر نظر رکھتے ہیں ان کی نظریں محجوب نظریں ہیں۔ ان کے اور ان کے رب کے درمیان اسباب دیوار کی طرح حائل ہیں۔ ان کے نزدیک اسباب کی اہمیت مسبب الاسباب سے زیادہ ہے۔ ان کی یہ نظر نہ صرف محجوب بلکہ محدود بھی ہے، اسباب کی حد سے آگے وہ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ اور وہ لوگ جن کی نظریں اسباب کے بجائے اسباب کے پیدا کرنے والے پر پڑتیں ہیں، ان کی نظریں بالغ اور لا محدود ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ نظریں محبوب ہیں۔

دنیا کے اسباب اور مادی چیزیں فنا ہونے والی ہیں، اور جو شخص ان فانی چیزوں سے رشتہ جوڑتا ہے اسے مایوسی کا شکار ہونا پڑتا ہے، اس لیے دنیا کے مادہ پرست نہ گفتہ بہ حالات میں مایوسی کا شکار ہوتے ہیں، تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ لیکن ایسے حالات میں اگر کوئی مسلمان مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے تو واقعی یہ تعجب ہی نہیں بلکہ افسوس کا مقام ہوتا ہے، اس لیے کہ مسلمان کی بنیاد روحانیت پر ہوتی ہے، اور وہ ایک ایسی غیبی طاقت پر کامل و مکمل بھروسہ رکھنے والا اور ایک ایسی ذات پر ایمان رکھنے والا ہوتا ہے جو مختار کل، قادر مطلق، علام الغیوب، ستار العیوب، مالک الکل اور رب العالمین ہے۔ جب ایک مومن و مسلمان پر کوئی مصیبت کی گھڑی آتی ہے، غم والم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے، مصیبتیں اس کے سر پر منڈلانے لگتی ہیں، ظالموں کا ظلم حد سے بڑھنے لگتا ہے، تو اس مومن اور مسلمان کے لیے نجات اور سلامتی کی ایک ہی راہ ہے کہ وہ اپنے سارے معاملے کو اپنے پروردگار کے حوالے کر دے۔ ان حالات میں عموماً لوگ اپنی بے بسی، بیچارگی پر نظر رکھے ہوتے ہیں، اور ناامیدی کی ظلمتوں میں جا پڑتے ہیں، جب کہ ایک مومن کا شیوہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان حالات میں اپنی کمزوری پر نہیں بلکہ اپنے رب ذوالجلال کی بے حد وحساب قوت وقدرت پر نظر رکھے اور یہ فیصلہ کر لے کہ ہر چیز اللہ پاک کی طرف سے ہوتی ہے۔ وہ یہ سوچے کہ اگر مجھ پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹا ہے تو اس میں اللہ پاک کا ارادہ شامل ہے، یہ میرا ایمان ہے کہ میں اللہ پاک کے ارادے کے بغیر مصیبت کا شکار نہیں ہو سکتا۔ جس کے ارادے سے مجھ پر مصیبت آئی ہے وہ میرے مصائب سے پوری طرح باخبر ہے۔

جب کسی مسلمان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اسے یہ یقین ہونا چاہیے کہ میری یہ مصیبت اسی وقت ٹل سکتی ہے جب میرا پروردگار اس کو ٹال دے۔ اور جب دنیا میں کوئی عذاب اور اللہ پاک کا کوئی قہر کسی ناگہانی صورت میں نازل ہونے لگتا ہے اور کوئی بلا اترتی ہے اور حالات دگرگوں ہو جاتے

ہیں تو ہماری نظر اس بلا اور مصیبت کے بھیجنے والے مالک کی طرف جانی چاہیے۔اس لیے کہ اللہ پاک کی مرضی ہی سے عذاب نازل ہوتا ہے اور اللہ ہی چاہے تو بندوں پر رحم کرتا ہے، اور جب مصیبتوں میں ہر شخص ہم سے دور ہو جاتا ہے اور کوئی ہمارا پرسانِ حال نہیں ہوتا اور پوری دنیا ہم کو اکیلا چھوڑ دیتی ہے، اور ساری دنیا ہمیں تنہا اور اکیلا تصور کرنے لگتی ہے، اس وقت ایک مومن اور مسلمان کو اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ اس حالت میں بھی وہ تنہا نہیں، اللہ رب العزت اس کے ساتھ ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بیماری کے ساتھ علاج بھی پیدا کیا ہے، موت کے ساتھ زندگی اور غربت کے ساتھ دولت کا وجود بخشا ہے، اسی طرح مصیبتوں، آفتوں اور الجھنوں کے ساتھ آرام وراحت، ہنسی خوشی اور نجات وسلامتی بھی پیدا فرمائی ہے، جہاں مصیبت ہے وہاں مصیبت سے چھٹکارے کے اسباب بھی ہیں، جہاں آفتیں ہیں وہیں آفتوں کے سے رہائی کے دروازے بھی ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ مادہ پرست لوگ محض مادی وسائل واسباب کے پیچھے پڑتے ہیں، جب کہ اہل ایمان ہر ایسے موقع پر ظاہری اسباب کو اختیار کرتے ہوئے اپنے حقیقی پروردگار کے سامنے دونوں ہاتھ اٹھا کر سلامتی کی راہ پانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اللہ پاک کی یہ عادت ہے کہ جو شخص سختیوں، آفتوں، اور مصیبتوں میں صبر کرتا ہے اور سچے دل سے اللہ پاک پر اعتماد اور یقین رکھتا ہے اور ہر طرف سے کٹ کر اسی ایک رب ذوالجلال سے لو لگا لیتا ہے، اور اسی کے فضل کا امیدوار رہتا ہے اور کامیابی میں دیر ہو جانے سے آس نہیں توڑتا، مایوس اور شکستہ دل نہیں ہوتا اور امید کا دامن تھامے رہتا ہے، تو اللہ پاک ضرور اس کی مدد ونصرت فرماتے ہیں، اور اس کے حق میں آسانی پیدا کر دیتے ہیں، اس لیے مصیبتوں کے وقت جس کی ضرورت ہے وہ رجوع الی اللہ، کامل صبر، اعمال پر مداومت، اور اللہ تعالیٰ کے حضور دعا ومناجات ہے۔

مطبوعہ: روزنامہ سالار بنگلور مورخہ 28/03/2003، روزنامہ پاسبان بنگلور مورخہ 2/4/2003

اسلام میں آزادی کا تصور

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو آزاد پیدا فرمایا، لیکن انسانوں نے خود غلامی کی ہتکڑیاں اور بیڑیاں پہن لیں یا پھر جابر انسانوں اور ظلاموں نے اپنے ہم جنس انسانوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھا۔ یہی حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت انسانوں کا تھا۔ ایک طرف ظالم حکمرانوں نے اپنے ماتحتوں کو غلام بنائے رکھا تھا، دوسری طرف مذہبی پیشواؤں نے لوگوں کے دل و دماغ کو توہمات کی زنجیروں میں باندھ رکھا تھا۔ غرض یہ کہ انسانیت تہذیبی تمدنی، اخلاقی، فکری، جسمانی، نظری ہر طرح کی غلامی کے اندھیروں میں ذلیل وخوار ہو چکی تھی۔ وہ انسان جس کو اشرف المخلوقات اور'' خلیفة الله على الارض '' بنا کر بھیجا گیا تھا سنگ وحجر کے سامنے اپنے آپ کو مسخر کر چکا تھا۔

فکری اور اعتقادی آزادی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو واضح فرمایا کہ بتوں کی غلامی کی کوئی حیثیت نہیں بلکہ اصل دین توحید ہے، جس قدر یہ عقیدہ کسی میں راسخ ہوتا چلا جائے گا، اسی قدر وہ شخص آزاد ہوتا چلا جائے گا، صاحب توحید کو کسی قسم کی دنیوی قوت کے ذریعہ ڈرایا نہیں جاسکتا، اسی لئے مؤمنین کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿فَلا خَوفٌ عَلَيهِم وَلا هُم يَحزَنُونَ ﴾ انسانیت کا کمال یہی ہے کہ وہ ہر قسم کے وہم اور غیر اصلی خوف سے آزاد ہو جائے، اس لئے کہ خدا کا ڈر تمام قسم کے خوف سے نجات دلاتا ہے۔ یہ ایک توہمی اور ذہنی غلامی تھی جس کا طوق ہر کس و

ناکس کے گلے میں پڑ گیا تھا، پس آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے اس سے سب سے پہلے نجات دلائی اور ارشاد فرمایا'' یَا اَیُّھَا النَّاسُ قُولُوا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا ''(رواہ احمد رقم الحدیث ۱۵۴۴۸)، لوگو! کہو اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، تم کامیاب ہو جاؤ گے۔

ایک حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دیہاتی اور گنوار صحابی کو مختصر اور جامع نصیحت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (رواہ احمد رقم الحدیث ١٤٨٦٩) ، کہو کہ اللہ پر ایمان لایا اور اسی پر استقامت سے رہو۔ یعنی ایمان اور اس پر استقامت کامیابی کے لئے ضروری اور اہم شئی ہے۔

جسمانی آزادی

آزادی کے سلسلے میں دوسرا اہم پہلو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا وہ غلاموں کی آزادی کا ہے، یعنی سب سے پہلے فکری اور توہمی بے قاعدگیوں سے نجات دلانے کے بعد جسمانی اور بدنی آزادی کی طرف بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی توجہ مبذول فرما کر انسانیت کو آزادی کا عمدہ درس دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کو آزاد کرنا بہت بڑے ثواب کا کام قرار دیا، اس کو خیرات کا بہترین مصرف بنایا۔ یہ قانون بنا دیا کہ کسی آزاد شخص کو بالجبر غلام نہیں بنایا جا سکتا یہاں تک کہ عقوبتوں اور غلطیوں سے نکلنے کا راستہ بھی غلاموں کی آزادی کے ساتھ مربوط کر دیا، اور بہت سے گناہوں کا کفارہ قرار دیا مثلاً کسی نے عمداً روزہ توڑ دیا تو غلام آزاد کرے وغیرہ۔ غرض یہ کہ غلامی کی نحوست کو ختم کرنے کے لئے اسلام نے ایک ایسا عمدہ نظام اور اسلوب عطا فرمایا اسلام سے پہلے کسی مذہب میں اس کے مماثل کوئی تعلیم نہیں ملتی۔

غلاموں کے سلسلے میں ایک اہم حکم یہ دیا گیا کہ غلام رکھنے والے وہی کھانا غلاموں کو کھلائیں گے جو خود کھاتے ہیں، وہ پہنائیں گے جو خود پہنتے ہیں۔اس شرط پر بھلا کون کسی کو غلام رکھنا چاہے گا؟ مقصد یہی تھا کہ غلامی کو صفحۂ ہستی سے مٹایا جائے اور اس کے لئے اسلام نے یہ حکیمانہ طریقہ اختیار کیا۔اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلام بھی خاندان کا ایک رکن سمجھا جانے لگا، غلام تعلیم یافتہ ہونے لگے، یہاں تک کہ غلاموں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گورنر کا عظیم منصب بھی عطا فرمایا، غلاموں کی ایسی حوصلہ افزائی فرمائی کہ غلام سپہ سالار بھی بنے، مذھبی پیشوا اور قابل اقتدار بھی بنے، امیر و وزیر بنے، غرض یہ کہ غلامی کی جو بھیانک شکل وصورت تھی اس میں شدت سے کمی آئی اور آہستہ آہستہ دنیا سے غلامی کا خاتمہ ہوا۔

آمریت کی ممانعت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس عین عروج کے زمانے میں ایک اعرابی پہنچے اور عرض کیا انــت مـلك ، آپ ہمارے بادشاہ ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں بادشاہ نہیں بلکہ اللہ بادشاہ ہیں۔ یہ قول ایک ایسے پیغمبر کی زبان سے نکلا ہے جن کے وضو کا جھوٹا پانی بھی اپنے بدن پر ملنے کو قوم سعادت سمجھتی تھی۔جن کے ایک اشارے پر اپنی جانیں قربان کرنے میں عین کامیابی کا یقین تھا، ان سب کے باوجود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ شاہانہ زندگی کو اپنے لئے پسند فرمایا نہ کسی طرح اس کی مشابہت کو اپنائی بلکہ حد تو یہ کہ بادشاہ کہلوانا بھی پسند نہیں فرمایا۔اسی طرز عمل کو خلفاء راشدین نے بھی اپنایا۔

یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس قسم کے اقتدار سے اللہ تعالیٰ نے نوازا ، اگر کسی اور کو عطا کیا جاتا تو اس کا سب سے پہلا قدم اپنے لئے

ایک محل کی تعمیر کی طرف گامزن ہوتا، وہ اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لئے اس بات کو یقینی بناتا کہ پوری مملکت میں اس جیسا طاقتور اور مالدار نہ ہو، لذیذ کھانے پینے کی اشیاء اسی کے پاس زیادہ ہوں، زندگی کی تمام آرائشیں اس کی رہائش گاہ میں سب سے پہلے لائی جائیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی آمریت کا خاتمہ فرمادیا اور آپ کے متبعین خلفاء نے بھی اسی راستے کو اپنایا۔ یہ قدیم روایت کے خلاف سب سے اہم اقدام تھا کہ آمریت اور ڈکٹیٹر شپ کا خاتمہ کیا جائے، بے جا لوگوں کے مال کو غصب نہ کیا جائے بلکہ شرعی قوانین کی بالادستی کو حکمران بھی قبول کریں۔

عدلیہ اور قانونی آزادی

مدینہ منورہ کے معزز قبیلہ بنومخزوم کی عورت نے چوری کی اور اس کی سزا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کے ہاتھ کاٹنے کا حکم فرمایا۔ چونکہ ایک معزز خاندان کی عورت تھی بعض لوگوں نے حضور پاک علیہ السلام کی خدمت اقدس میں اس عورت کی سفارش کرنا چاہا اور اس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے صحابی حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے گذارش کی گئی۔ جیسے ہی حضرت اسامہؓ نے سفارش کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا اور آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا یَا اُسَامَةُ اَتَشْفَعُ فِی حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللّٰہِ ۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبے کے لئے کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلے اقوام کی ہلاکت اسی بنیاد پر ہوئی کہ وہ لوگ جب کوئی شریف اور باعزت گناہ کرتا تو اس سے چشم پوشی کرتے اور جب کوئی ضعیف گناہ میں مبتلا ہوتا تو حد جاری کرتے تھے۔ آگے فرمایا کہ وَایْمُ اللّٰہِ لَو اَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتِ مُحَمَّدٍ سَرِقَتْ لَقَطَّعْتُ یَدَھَا اللہ کی قسم فاطمہ بنت محمد بھی اگر چوری کرے میں اس کے ہاتھ

کاٹنے کا حکم صادر کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ تعلیمات میں عدلیہ کی آزادی کو ثابت کرنے کے لئے یہ ایک واقعہ کافی ہے۔

قانون کی بالادستی کا جو تصور اسلام نے پیش کیا تاریخ گواہ ہے کہ اس جیسا نظام کسی اور نے ماضی میں پیش نہیں کیا اور قیامت تک کوئی قوم یا دستور ساز اسمبلی پیش نہیں کرسکتی۔

جس قوم کا عدلیہ آزاد نہ ہو وہ خواہ ہزاروں آزادی کے نعروں کے باوجود آزاد نہیں ہے ۔آزادی کے لئے قانون کی بالادستی چاہئے ،آزادی صرف چند مالداروں کی خوشحالی کا نام نہیں ہے بلکہ ہر غریب سے غریب تر انسان کا انسان ہونے کی حیثیت سے بنیادی حق ہے ۔ہم نے آزادی کو نعروں تک محدود رکھا ہے، ہمارا لیگل نظام آزاد نہیں ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پوری آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کریں

معاشی آزادی

معاشی استحکام انسان کی آزادی کا ایک اہم حصہ ہے، جب تک قوم معاشی طور پر مستحکم نہیں ہوجاتے یا مستحکم کرنے کا کوئی مؤثر لائحہ عمل پیش نہیں کیا جاتا اس وقت تک آزادی کا دعویٰ عبث کے سوا کچھ نہیں ہے۔اس لئے کہ وہ غریب جو سودی قرضوں کی لعنت میں جکڑا ہوا ہو اس کو آزاد کیسے کہا جاسکتا ہے، وہ تو ہر طریقے سے مہاجنوں اور بینکوں کا غلام ہوگا۔سود پر قرض لینے والی عورتیں اپنے قرض کی ادائیگی کے لئے جسم فروشی پر آمادہ ہوجاتی ہیں، یہ صرف نظریہ نہیں بلکہ واقعہ ہے اور حقیقت پر مبنی واقعہ ہے کہ عورتوں کی عزتیں محفوظ نہیں، شریفوں کی شرافت تار تار ہے، سود کی شکل میں لوگوں کا خون چوسا جارہا ہے اور پھر یہ دعویٰ ہے کہ ہم آزاد ہیں؟

آج سے تقریباً ۱۴۰۰ سال پہلے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دکھتی رگ

پر ہاتھ رکھا معاشرہ کو سود کی لعنت سے پاک کیا، ہر تاجر کو اس کا حق دیا اور معیشت کی بنیاد زکوٰۃ پر رکھ کر ایک ایسا عمدہ معاشرہ تعمیر فرمایا، اگر انہیں اصولوں کو آج بھی اپنایا جائے تو وہی مثبت اثرات پیدا ہوں گے جو دور نبوت اور اس کے بعد ظاہر ہوئے تھے۔ لوگوں کو اپنی زکوٰۃ لے کر غریبوں کو تلاش کرنا پڑتا تھا کیوں کہ غریب کوئی ملتا ہی نہیں۔ خوشحالی ہی خوشحالی ہے۔ اسلئے کہ سود سے پاک معاشرہ میں مال گردش میں ہوتا اور غریب اپنی محنت کی مکمل کمائی استعمال کرتا ہے۔ جب غریب کو محنت کے باوجود پورا فائدہ نہ حاصل نہ ہو اور مالدار صرف سرمایہ کی بنیاد پر اپنے مال میں اضافہ کرتے چلے جائیں تو یہ مال ایک جگہ جمع ہو جائے گا۔ جب مال ایک جگہ جمع ہو جائے تو پھر بازار میں مال نہیں ہوگا، مہنگائی آئے گی، انسان معاشی غلامی کی تاریک سرنگوں میں بھٹکتے رہ جائے گا۔ اسلئے کہ ارتکاز مال (مال کا ایک جمع ہو جانا) اور احتکار مال (ذخیرہ اندوزی کرنا تا کہ زیادہ فائدہ ملے) معاشی آزادی کی اہم رکاوٹیں ہیں۔

خواہشات نفسانی سے آزادی

ایک اشکال یہ ہوسکتا ہے کہ اسلام میں آزادی کا جو تصور ہے وہ محدود ہے اور اسلام تو پابندیوں کے ایک مجموعے کا نام ہے۔ قرآن و حدیث میں جگہ جگہ بہت سے افعال و اشیاء کا حرام ہونا مذکور ہے۔ اس کے باوجود یہ دعویٰ کیسے صحیح ہوگا کہ اسلام آزادی کا علم بردار ہے؟ یہ اشکال دراصل ایک غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ آزادی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان جو چاہے کرتا رہے اور اس کی کوئی پوچھ نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو کسی بھی آزاد ملک میں کوئی قانون نافذ نہیں کیا جا سکتا تھا، اور جب تک قانون کا نفاذ نہ ہو ملک کو چلانا کیسے ممکن ہے؟ اس لئے کہ کسی بھی آزاد قوم کے پاس جب تک دستور نہیں اور قانون نہیں اس

وقت تک وہ ایک عمدہ معاشرہ قائم نہیں کرسکتی پس احکامات کے نفاذ کو آزادی کے سلسلے میں رکاوٹ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ آزادی کا تصور صرف ایک آدمی کی بنیاد پر نہیں کیا جاسکتا، اگر آزادی کو فرد واحد پر منحصر کردیا جائے تو اس فرد واحد کی آزادی دوسرے افراد کے لئے آزاری کا باعث ہوگی، وہ فرد واحد من مانی کرے گا، قانون کی خلاف ورزی کرے گا تو اس صورت میں دیگر افراد کی آزادی متأثر ہوگی۔ معلوم ہوا کہ قوانین شرعی مجموعی حیثیت سے کسی کی آزادی کے خلاف نہیں ہیں۔

اگر گناہوں پر روک نہ لگایا جائے اور برائیوں کو لگام نہ دی جائے تو انسان خواہشات کا غلام بن جائے گا، اور خواہشات کی غلامی بھی ایک بڑی وبا ہے جس سے چھٹکارا پانا اور آزادی حاصل کرنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح جسمانی آزادی حاصل کرنا ضروری ہے۔ اسی لئے خواہشات کی غلامی سے روکا گیا اور نفسیاتی طور پر اسلام نے انسانوں کی تربیت کی اور آزادی کی آڑ میں خواہشات کی پیروی کرنے سے روکا گیا۔

خواہشات کی غلامی سے روکنے کا نظریہ صرف اور صرف اسلام نے کامل طریقے سے پیش فرمایا، ترقی پسند لوگوں کی سمجھ میں آج تک یہ بات ہرگز نہیں آئی۔ اسی وجہ سے اظہار رائے کی آزادی کے پردہ میں دوسروں کی تذلیل و تفسیق کا معاملہ گرم ہے، مثال کے طور پر ہم تسلیمہ نسرین اور سلمان رشدی کا نام لے سکتے ہیں، ایک دنیا کی دنیا ہے جنہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ آخر انہوں نے کیا ایسا کام کیا ہے کہ مسلمان ان کے مخالف ہوگئے ہیں، بس انہوں نے ایک کتاب ہی تو لکھی ہے اور تو کچھ نہیں کیا۔

بات سمجھنے کی ہے کہ اپنے آراء کا اظہار کرنا ہر ایک کے لیے جائز ہے لیکن اظہارِ

رائے کے نام پر دوسروں کی تذلیل و تفسیق کرنا کسی طور درست نہیں۔ نیز ایسی برگزیدہ ہستی جن کو موجودہ عالم کی ربع آبادی اپنا پیغمبر اور نبی مانتی ہے؟ بلکہ حق تو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی تمام عالم جن وانس کے لیے آخری پیغمبر کی حیثیت رکھتی ہے، ایسی ذات اقدس پر اپنی رائے کا اظہار کرنا یقیناً خواہشاتِ نفسانی کی پیروی اور خواہشاتِ نفسانی کی غلامی کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آزادی کے ہر مفہوم سے باخبر رہنے اور صحیح طور پر آزادی کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مطبوعہ: روزنامہ سالار 04/06/2003

مسلم خواتین مندر میں

ایک عرصہ دراز سے راقم الحروف کی آمد ورفت ٹیانری روڈ بنگلور کی مصروف ترین سڑک سے ہوتی رہتی ہے۔اور ایک مدت سے یہ قابل افسوس اور قابل شرم بات دل اور دماغ میں کھٹکتی ہے کہ مسجد نمک منڈی کے روبرو جو مندر ہے وہاں توحید و رسالت کا پاک کلمہ پڑھنے والی نادان عورتیں جو اسلام اور اس کی شریعت کے حکم کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے برقعہ بھی اوڑھتی ہیں۔

لیکن ان کے دلوں میں غلط عقیدہ پیوست ہوگیا ہے کہ اپنے بچوں کو اس مندر میں لے جانے سے شفایاب ہوتے ہیں۔اس کے برعکس ہندو دھرم کا عقیدہ رکھنے والی کافر عورتیں تمام نمازوں کے وقت عموماً مغرب کی نماز کے خصوصاً اپنے نونہال بچوں کو گود میں لیے بارش میں بھیگتے سردی میں ٹھٹھرتے،نمازیوں کی منتظر کھڑی ہیں اور انہیں مکمل یقین ہے کہ ان نمازیوں کی ایک پھونک ہی ان کے بچوں کو شفایاب وصحت یاب کرسکتی ہیں۔

کیا ان عورتوں کو راہِ راست پر لانے والا بنگلور میں خصوصاً نمک منڈی میں کوئی نہیں ہے؟ کیا ان عورتوں یا ان کے گھر والوں کو ان کے ایمان کے سلب ہونے کی اور ایمان خطرہ میں پڑجانے کا کچھ غم نہیں ہے۔کیا وہاں کی رہنے والی عورتوں کو اپنی ماں، بہنوں کی فکر نہیں ہے۔مجھے امید ہے کہ وہاں کی دانش مند عورتیں اس طرف توجہ دیں گی اور خود کو اور اپنی ماؤں بہنوں کو جہنم کا ایندھن بننے سے بچائیں گے۔

(مطبوعہ روزنامہ سالار 20/02/1993)

لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

ہمیشہ سے اس بات کا مشاہدہ ہوا ہے کہ جب بھی سارے ہندوستان میں عموماً ہماری ریاست میں خصوصاً انتخابات کا اعلان ہوتا ہے تو ہر سیاسی پارٹی ملک کے ہر شہر اور گاؤں میں مہم چلاتی ہے۔ ہر پارٹی والا اپنی پارٹی کو صحیح اور مستحکم پارٹی کہتا ہے اور دوسری پارٹی کے خلاف کہتا ہے۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتا ہے۔ مگر ہر ایک اپنی اپنی مہم میں کوشاں ہے کہ انتخابات میں کامیاب ہو جائے مگر ان کی کاوشیں کیا ثمرہ لائیں گی۔ ہونے والے انتخابات کے بعد ہی پتہ چلے گا۔ یہاں یہ اگر افسوس کے ساتھ لکھوں تو بے جا نہ ہوگا کہ مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کے فقدان کے وجہ سے مسلمان سارے پارٹیوں کے لیے کھلونا بن گئے ہیں۔ مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کے لیے کوئی بھی سیاسی پارٹی نہیں۔ ہمیں مسلم لیگ پر تھوڑا بہت بھروسہ تھا، مگر افسوس صد افسوس اس میں بھی پھوٹ پڑ گئی اور اس کے دو حصے ہو گئے۔ مسلمانوں کی رہنمائی کرنے کے لیے کوئی بھی ایک پارٹی مستحکم نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے ووٹ بھی بٹ جاتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے ووٹ کی جو وقعت ہے وہ بھی ہماری کوتاہی کی وجہ سے ختم ہو جائے۔

اس لیے مسلمانوں سے ایک ہمدردانہ التماس ہے کہ وہ پورے اتحاد و اتفاق سے کام لیتے ہوئے آنے والے انتخابات میں ایک یادگار رول ادا کریں۔ اگر مسلمانوں کے اندر اتحاد و اتفاق کا جذبہ پیدا ہو جائے تو وہ دن دور نہیں کہ ہر جگہ ہماری ہی حکومتیں قائم

ہوں گی۔ مگر ایسا نہیں ہو پاتا، کیونکہ آپ حضرات دیکھتے ہوں گے کہ اگر کسی بھلے مانس نے کسی محلے میں کوئی ادارہ یا کمیٹی قائم کیا، تنظیم بنائی تو فوراً اس کی مخالفت میں دوسرے دن دوسرا شخص ہمارا ہی آدمی وہ بھی ایک کمیٹی، ادارہ قائم کر لیتا ہے۔ اسی نااتفاقی کی وجہ سے آج مسلمان غیروں کی نظر میں کمزور ہے۔ بہرکیف آپ خود یہ فیصلہ کریں کہ آنے والے انتخابات میں کس کو اپنا قیمتی ووٹ دینا ہے، کیونکہ ایک منٹ کی غلطی کا خمیازہ پانچ سال تک بھگتنا پڑے گا۔ اس لیے غلطی کر کے پچھتانے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ پہلے ہی سوچ لیں کہ ہم غلطی کر رہے ہیں یا صحیح آدمی کو ووٹ دے رہے ہیں۔

انتخابات کے دنوں میں تو سیاسی لیڈران محلوں میں دورے پر دورے کرتے رہتے ہیں، جھوٹے وعدے کرتے ہیں اور دوسروں کی حکومت پر تنقید کرتے ہیں ۔ پھر انتخابات کے بعد وہ امیدوار اس محلے کی طرف منھ پھیر کر بھی نہیں دیکھتا۔ اسی طرح فسادات میں بھی ایسے ہی رسمی طور پر اپنا چہرہ دکھا کر چلے جاتے ہیں، چاہے وہ فسادات ایودھیا کے ہوں، ہبلی کے ہوں، بھدراوتی کے ہوں یا بنگلور (۷ اکتوبر) کے۔ اس لیے مسلمان سب متحد ہو کر اپنے گراں قدر ووٹ دیں تب ہمارے ووٹ کی قدر ہوگی اور ووٹ بعد میں کام آئے گا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگر ایک حلقے میں کوئی مسلمان امیدوار کھڑا ہوا ہے تو دوسرے مسلمان بھائی کو اس حلقے میں دوسری پارٹی کی طرف سے کھڑا ہونے کی سنگین غلطی نہیں کرنا چاہیے، ورنہ ووٹ بٹ جائیں گے اور دشمنوں کا فائدہ ہوگا، اس کے بعد کیا ہوگا یہ آپ حضرات خود جانتے ہیں ۔ اگر ان مشوروں کا خیال رکھیں تو انشاء اللہ کامیابی و کامرانی ہمارے قدم چومے گی۔

(مطبوعہ روزنامہ سالار 14/10/1994)

وائے رے ستم ظریفی

جہاں تک میرا ناقص علم ہے میں سمجھتا ہوں کہ اب تک کے بنگلور کے فسادات اور خصوصاً ۷ اکتوبر ۱۹۹۴ سے ہوئے فسادات میں معصوم بچوں، بوڑھوں اور بوڑھی عورتوں کو مسلمانوں کی جائیداد کو، تباہ و برباد کرنے میں سر پسندوں سے زیادہ خاکی وردی والوں کا ہاتھ ہے، کیونکہ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ جہاں بھی فساد برپا ہوا، وہاں وہ لوگ تماشائی بنے رہے، بلکہ بعض موقعوں پر خود خاکی وردی والے شر پسندوں کا ساتھ دے رہے تھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ فسادات منظم سازش سے ہوئے ہیں اور بہت سے نوجوانوں کو خواہ مخواہ گرفتار کر کے سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا ہے، ان سارے کرتوتوں میں حکومت اور بی جے پی کا ہاتھ ہونا صاف ظاہر ہے، کیونکہ جب کسی جگہ غیر مسلموں کی ریالی نکلتی ہے اور جلسے جلوس میں گڑبڑ ہوتی ہے تو اس وقت پانی کی بوچھار اور ربر کی گولیوں کا استعمال ہوتا ہے، یہاں ہمارے شہر میں فائرنگ کی ضرورت ہی نہیں تھی مگر پولیس نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی، اس سے بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ خاکی وردی والے مسلمانوں کے دشمن ہیں ۔ اور اخباروں میں یہ بھی پڑھنے میں آیا ہے کہ جب ریپڈ ایکشن فورس کے دستے متاثرہ علاقوں میں فلیگ مارچ کرنے آئے تو خاکی وردی والوں نے ان کو روک دیا تھا تاکہ لوٹ مار اور آتشزدگی کا بازار گرم رہے اور مسلمانوں کی جان و مال محفوظ نہ ہونے پائے۔

انتخابات سے پہلے تو ہر سیاسی لیڈر جہاں تک ہو سکے لوگوں کو اپنی جیب میں

اتارنے کی کوشش کرتے ہیں، اردو نیوز بھی اسی طرح کی ایک سیاسی چال تھی، سیاسی کھیل تھا، حکومت نے مسلمانوں کے ووٹ جیتنے کے لیے اردو خبریں شروع کیں۔ اور اب یہ بھی ستم ظریفی دیکھئے کہ حکومت نے کنڑنوازوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور یک طرفہ فیصلہ کرتے ہوئے اردو نیوز بند کردیا۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ یہ گندی سیاست مفاد پرست ہے۔ جب نیوز شروع ہو چکے تھے تو پھر بند کرنے کی کیا ضرورت تھی؟۔ اگر آپ کو انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے ہی اتنی ہی چاہت تھی تو آپ اقلیتوں کے مسائل کو حل کرتے اور غریبوں کی مدد کرتے اور یتیموں کی امداد کرتے۔ نہ جانے کس کی دعا میں اثر ہو اور آپ کا بیڑا پار ہو جائے۔ اس طرح کے جھوٹے خواب دکھا کر کیوں لڑاتے ہیں؟؟

پورے فسادات کے بعد جب لاکھوں کی املاک جل کر خاک ہو چکی ہوتی ہے اور بے گناہ معصوموں کی جانیں تلف ہو چکی ہوتی ہیں، بے قصور افراد پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن کر ہسپتالوں میں جا چکے ہوتے ہیں تو اس وقت دواخانوں میں آکر مگرمچھ کے آنسو بہانے سے کیا فائدہ؟ بہتر تو یہ تھا کہ جب بے گناہوں اور معصوموں کے گھروں کو لوٹا جا رہا تھا اس وقت آکر ان کی حفاظت کرتے۔ اب بہتر تو یہی ہے کہ آپ اپنی کرسی کی حفاظت کرنے کے بجائے اپنے اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے دیں۔ ورنہ وہ دن دور نہیں جب خدا تمہارے اوپر بھی کسی ظالم کو مسلط کر دے گا۔ اس لیے خدا کو حاضر و ناظر جانتے ہوئے خلوص دل سے کام کریں۔ قوم کی خدمت کریں، ورنہ کل حشر کے میدان میں کیا منہ دکھاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ ہماری قوم کے رہنماؤں کو عقل سلیم عطا فرمائے اور مظلوموں کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(مطبوعہ روزنامہ پاسبان 13/10/1994)

ملک میں مخلوط حکومت قائم ہوگی

آزادی کے بعد ایک زمانہ دراز تک ہندوستان پر نہرو خاندان کا سکہ چلتا رہا۔ درمیان میں ایک تھوڑے سے وقفے کے سوا تقریباً چالیس سال تک کانگریس نے بڑی شان وشوکت کے ساتھ ملک پر حکمرانی کی۔ جن سنگھ سیاست میں برائے نام موجود تھی اور جنتا پارٹی کا وجود صرف انتخابات کی ضرورت پورا کرنے کے لیے تھا۔ انتخابات بھی صرف جمہوریت کی روایت کو برقرار رکھنے کے لیے ہوتے تھے، مگر یہ سب کانگریس پارٹی کی کسی خصوصیت کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ ہندوستان پر نہرو خاندان کا جادو چلتا تھا۔ یہ سحر اس وقت ٹوٹا جب پنڈت نہرو کے نواسے راجیو گاندھی نے بابری مسجد کا تالا کھلوایا اور انہی کی سرپرستی میں کانگریس کے لیڈر بوٹا سنگھ نے ایودھیا میں رام جنم بھومی کے لیے سنگ بنیاد رکھا۔ اس سے کانگریس کا جو سیکولر امیج لوگوں کے ذہن میں بیٹھا ہوا تھا وہ پاش پاش ہوگیا۔ اور اسی کے ساتھ ملک میں یک جماعتی نظام کا دور ختم ہوگیا۔ اقلیتیں، خصوصاً مسلمان کانگریس سے بدظن ہوگئے اور ۱۹۸۹ء کے عام انتخابات کے بعد جنتا دل برسرِ اقتدار آئی، مگر اس میں خود اپنے بل بوتے پر حکومت چلانے کی قوت نہیں تھی۔ جس کی وجہ سے دوسری جماعتوں کی حمایت کا سہارا لینا پڑا۔ بدقسمتی سے یہ حکومت زیادہ دنوں تک نہیں چل سکی اور کانگریس دوبارہ برسر اقتدار آئی۔ مگر ۱۹۹۱ء میں بابری مسجد کی شہادت کا اندوہناک واقعہ

پیش آیا جو کانگریس پارٹی کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔ بی جے پی اپنے فرقہ وارانہ نظریات اور فسطائی ذہنیت کی وجہ سے نہ کبھی خود اپنے بل بوتے پر حکومت چلانے کے قابل رہی اور نہ ہی آگے کبھی اس کو اتنی قوت حاصل ہونے کی امید ہے، کیونکہ ہندوستان مختلف مذاہب، تہذیبوں اور زبانوں کا ملک ہے، یہاں کوئی ایک مخصوص نظریہ یا مذہب کی بنیاد پر حکومت قائم نہیں ہوسکتی۔ جنتا دل کا تو وجود ہی معدوم ہوتا چلا جارہا ہے۔

ان سبھی حالات کی وجہ سے مختلف ریاستوں کی علاقائی جماعتیں اپنی اپنی ریاست میں مضبوط ہوگئیں۔ اور اب یہ حالت ہے کہ بی جے پی نے تو مختلف علاقائی جماعتوں کا ایک قومی جمہوری اتحاد قائم کرلیا ہے اور کانگریس اپنی مضبوطی کے تمام تر دعوؤں کے باوجود کچھ ریاستوں میں علاقائی جماعتوں کے ساتھ انتخابی سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہے۔ اور کانگریس کے کئی لیڈروں نے بیانات بھی جاری کیے ہیں کہ اگر ضرورت پڑی تو کانگریس مرکز میں مخلوط حکومت قائم کرنے کے بارے میں غور کرسکتی ہے۔ مگر یہ کھلی حقیقت ہے کہ ملک میں اس وقت ایسا سیاسی ماحول بنا ہوا ہے کہ کوئی بھی جماعت صرف اپنی قوت پر ملک کو مستحکم حکومت فراہم کرنے کے قابل نہیں ہے۔ کانگریس اور جنتا دل میں پھوٹ کے بعد ملک میں کئی چھوٹی چھوٹی سیاسی جماعتیں پیدا ہوگئیں ہیں اور ہر جماعت کا اپنے دائرے میں خصوصی اثر ورسوخ بھی ہے اور کئی علاقائی پارٹیاں بھی اس وقت اتنی قوی ہو چکی ہیں کہ کانگریس یا بی جے پی یا اور کسی پارٹی کو اپنے بل بوتے پر حکومت بنانا ناممکن ہوگیا ہے۔ ان تمام حقائق سے یہ ظاہر ہے کہ ملک میں اس وقت یک جماعتی نظام حکومت کا دور ختم ہو چکا ہے اور آگے چل کر ملک کو مخلوط حکومتیں ہی استحکام فراہم کرسکتی ہیں۔

(مطبوعہ روزنامہ سیاست 25/09/1999)

ہمدردانِ قوم کے نام

گزشتہ پارلیمانی انتخابات کے موقع پر شہر کے کئی دینی ملی اور مسلم سماجی اداروں بالخصوص شہر کا مشہور ملی ادارہ خادمان ملک وملت نے بڑی جانفشانی کے ساتھ ریاست کرناٹک کے تمام پارلیمانی حلقوں کا سروے کرنے کے بعد ایک فہرست جاری کی تھی، مسلمانوں سے یہ درخواست کی گئی کہ فلاں حلقے میں فلاں پارٹی کے امیدوار کو ووٹ دے کر کامیاب بنائیں مگر بدقسمتی سے یہ اعلان عین موقع پر یعنی الیکشن سے صرف چند ہی دنوں قبل آخری وقت میں کیا گیا، جس کی وجہ سے عوام کی صحیح رہنمائی نہیں ہوسکی۔

علاوہ ازیں عام مسلمان اس وجہ سے بھی کشمکش میں مبتلا ہوگئے تھے کہ اگر ہم ایک حلقے میں ایک پارٹی کے امیدوار کو کامیاب کریں اور دوسرے حلقے میں دوسری پارٹی کے امیدوار کو تو اسی طرح معلق پارلیمان قائم ہوجائے گی، اس طرح عوام یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ وہ اپنا ووٹ کس طرح استعمال کریں۔ اب پھر الیکشن سروں پر ہے اور مسلمان پھر اس کشمکش میں ہیں کہ اپنا ووٹ کس طرح استعمال کریں۔ اس لیے تمام ملی سماجی اداروں کے ذمہ داروں سے میری ہمدردانہ گزارش ہے کہ الیکشن کی تاریخ کے اعلان کے ساتھ ہی تمام ملی اداروں کی ایک مشترکہ میٹنگ طلب کی جائے اور شہر اور اطراف واکناف شہر اور ریاست بھر کے ذمہ داروں کو دعوت دی جائے اور آپسی افہام وتفہیم کے ذریعے کسی ایک نتیجہ پر پہنچ کر دوسرے ہی دن اخباروں کے ذریعے یہ اعلان شائع کرادیا جائے کہ مسلمان

کس کو ووٹ دیں، نیز ائمہ اور خطباء سے حضرات، جمعہ کے خطبوں اور تقریر کے ذریعے مسلمانوں کو ووٹ اور اس کے صحیح استعمال کی اہمیت سے آگاہ کریں اور قوم کا درد رکھنے والے ملی ادارے اور انجمنیں بھی مختلف پروگراموں کے ذریعے ہر ایک کو اس کی اہمیت سے آگاہ کراتے رہیں۔اور مسلمانوں کے ووٹ کو ضائع ہونے سے بچائیں۔

(مطبوعہ روزنامہ پاسبان10/06/1999)

مذہبی مقامات بل
دستورِ ہند کے پس منظر میں

دستور ہند کے مرتبین اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ تقسیم ہند کے باوجود مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہندوستان ہی کو اپنا اصلی وطن تسلیم کرتے ہوئے یہیں رہنا پسند کرتی ہے اور اپنے وطن عزیز کو ترک کرنا پسند نہیں کرتی۔ ان مسلمانوں کے علاوہ ملک میں اور بھی کئی اقلیتیں اور نسلیں ہیں جو زمانۂ دراز سے موجود رہی ہیں اور ملک کی کل آبادی کا ایک بڑا حصہ انہی اقلیتی طبقات کا مجموعہ ہے، ان دستور سازوں کو اس بات کا بھی پوری طرح ادراک تھا کہ ملک میں امن وسلامتی کے علاوہ مجموعی اعتبار سے ملک کی ترقی اس وقت ہوسکتی ہے جب ملک کے تمام طبقات میں تحفظ کا احساس اور یکجہتی واتفاق کی فضا قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات نے ملک کی تمام اقلیتوں کو مختلف دفعات کے ذریعے ضمانتیں، تحفظات اور حقوق فراہم کیے۔ دستور کے نفاذ کے بعد بھی دستور سازوں نے بار بار قانون ساز اسمبلی میں اس بات پر زور دیا تھا کہ اسی دستور کے ذریعے اقلیتوں کو مکمل تحفظ فراہم کیا جائے، اگر اس دستور کی کسی دفعہ کے ذریعے اقلیتوں کے حقوق پامال ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسا دستور قابل تنسیخ ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر بی آر امبیڈکر نے قانون ساز اسمبلی میں ۲۰ ستمبر ۱۹۵۰ء کو تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں نے اس دستور کو ایک اکثریتی

حکومت کی درخواست پر مرتب کیا ہے، مجھے اکثریتی رائے کو مدنظر رکھ کر ہی اس کو مرتب کرنا تھا، لہٰذا میں مجبور تھا، اگر یہاں اقلیتوں کی حفاظت اس وجہ سے نہیں ہو سکتی کہ ان کے خصوصی حقوق کی حفاظت کا دستوری حق گورنر کو حاصل نہیں ہے تو اس دستور کو آگ کی بھٹی میں جھونکنے والا سب سے پہلا شخص میں ہوں گا۔ (بحوالہ نیشنلسٹ پرسویٹ) دستور ہند میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو جو حقوق اور ضمانتیں فراہم کی گئی ہیں ان پر مختصراً یہاں اشارہ کر دینا مناسب ہوگا۔

آئین ہند کی دفعہ پانچ کے تحت ہندوستان، ہندوستان کے تمام مسلمان یہاں کے شہری ہیں اور ان کو کسی امتیاز و تفریق کے بغیر وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو کسی دوسرے شہری کو حاصل ہیں۔ دفعہ ۱۹۳ کے تحت ہر شہری کو تقریر اور اظہارِ خیال کی آزادی کے ساتھ پر امن طریقے سے اجتماع منعقد کرنے، یونین یا ادارہ قائم کرنے، کوئی جائداد حاصل کرنے، اس پر قابض رہنے اور منتقل کرنے کی آزادی حاصل ہے۔

دفعہ ۲۵ کی رو سے ملک کا کوئی بھی شہری آزادانہ اپنے ضمیر کی آواز پر چل سکتا ہے، کسی مذہب پر عقیدہ رکھ سکتا ہے، اس پر عمل پیرا ہو سکتا ہے اور اس کی تبلیغ کر سکتا ہے۔

دفعہ ۲۶ کے تحت اخلاق عامہ، صحت عامہ اور امن عامہ (پبلک آرڈر) کے تحت مذہبی یا خیراتی کاموں کے لیے ادارہ اور انجمنیں قائم کر سکتا ہے، اپنے مذہبی معاملات کا انتظام کر سکتا ہے، اور اس کے لیے ہر طرح کی جائیداد منقولہ و غیر منقولہ حاصل کر سکتا ہے اور قانون کے مطابق اس کا بندوبست کر سکتا ہے۔

درج بالا دفعات کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان یا کوئی بھی اقلیت کی اپنے مذہبی یا تہذیبی تشخص کی حفاظت کے لیے ملک کے کسی بھی شہری کو یہ آزادی دی گئی ہے کہ آزادانہ

اپنے ضمیر کی آواز پر چل سکتا ہے، کسی مذہب پر عقیدہ رکھ سکتا ہے، اس پر عمل پیرا ہوسکتا ہے اوراس کی تبلیغ کرسکتا ہے۔ مذہبی کاموں (عبادت وغیرہ) کے لیے ادارے یا انجمن قائم کرسکتا ہے، اپنے مذہبی معاملات کا انتظام کرسکتا ہے، اوراس کے لیے ہر طرح کی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ حاصل کرسکتا ہےاور قانون کے مطابق اس کا بندوبست کرسکتا ہے۔

دستور ہند کی ان ضمانتوں کے پیش نظر ملک کی سب سے بڑی ریاست اتر پردیش کی بی جے پی سرکار کی طرف سے پاس کردہ عبادت گاہیں اور مذہبی مقامات ریگولیشن ایکٹ بل یقیناً دستور ہند کی صریح خلاف ورزی ہے۔اس بات سے قطع نظر کہ اس بل کا اصل نشانہ کون ہیں (اگرچہ کہ یہ واضح ہو چکا ہے کہ اس بل کے ذریعے فسطائی ذہنیت کی حامل بی جے پی حکومت مسلمانوں ہی کو نشانہ بنانا چاہ رہی ہے) ملک کے ہر شہری کی یہ ذمہ داری ہے کہ آئین ہند کی حفاظت کے لیے کمر بستہ ہو کر سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر دستور کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف احتجاج کرے، خصوصاً مسلم دانشور اور رہنمایانِ قوم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس بات کی نگرانی کریں کہ دستور کی جن دفعات کا تعلق ہندوستانی مسلمانوں سے یا ملک کی اقلیتوں سے ہے، ان کے نفاذ میں کس حد تک دیانت داری برتی جارہی ہے، نیز ملک میں کوئی ایک بھی قانون ایسا نہ بننے پائے جو مسلمانوں کے مفادات کے خلاف ہو یا اس میں ان کے جذبات اور ضروریات کو ملحوظ نہ رکھا گیا ہو۔

یہ یقیناً ایک خوش آئند بات ہے کہ ہمارے معزز علماء کرام نے اپنی اس ذمہ داری کو نبھانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔اب عام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ علماء کرام کے اس تعلق سے ہر اقدام کی تائید کریں اور حسب استطاعت اپنی نصرت و مدد فراہم کریں۔

(مطبوعہ روزنامہ پاسبان 26/04/2000)

جشن میلاد النبی اور نوجوانانِ ملت سے گزارش

اب ماہِ محرم اپنی شان وشوکت کے ساتھ ہم پر سایہ فگن ہے، یہ ماہِ مبارک اپنے دامن میں ایک عظیم قربانی کی تاریخ لیے ہوئے ہے، چونکہ یہ مبارک مہینہ اسلامی سال کا پہلا مہینہ ہے، خدا تعالٰی نے اس نئے سال کو تمام ملت اسلامیہ کے حق میں خیر ہی خیر بنایا ہے، یہ مہینہ حرمت والا ہے، خصوصاً اس مہینہ کی دسویں تاریخ بڑی اہمیت کی حامل ہے، خدا تعالٰی نے آسمان وزمین کو اسی دن میں پیدا کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو بھی اسی دن پیدا کیا اور ان میں روح بھی اسی دن پھونکا، اسی دن حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی اور حضرت نوح علیہ السلام کو اسی دن نجات ملی اور اسی دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود کی آگ سے نجات ملی۔ ایک روایت میں ہے کہ قیامت اسی تاریخ کو قائم ہوگی اور اسی دن دنیا بھی فنا ہوگی۔

بعض مسلمان اس مہینے کو غم کا مہینہ سمجھتے ہیں، کوئی خوشی کا کام مثلاً شادی منگنی یا کسی بھی تقریب کے انعقاد کو اس مہینے میں بے برکت ومنحوس سمجھتے ہیں اور لوگوں میں جہالت اتنی رچ بس گئی ہے کہ نئے دلہا کو اپنی نئی بیوی سے گوشہ کرادیتے ہیں۔ یہ رسمیں ہماری جہالت کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں داخل ہوگئی ہیں۔ امتِ محمدیہ کے لیے تو ہر مہینہ، ہر ہفتہ، ہر دن خیر وبرکت کو اپنے اندر لیے ہوئے طلوع ہوتا ہے، بشرطیکہ امت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر عمل پیرا ہو۔ سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مہینے کو برکت والا مہینہ قرار دیا ہے اور کثرت سے عبادت کرنے کا حکم دیا ہے،

صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو عاشوراء کے دن روزہ رکھنے کا حکم فرماتے تھے، کسی صحابی نے عرض کیا یارسول اللہ یہود ونصاریٰ بھی عاشوراء کے دن روزہ رکھتے ہیں، تو سرکار نے فرمایا کہ تب تو ہم ان سے زیادہ روزہ رکھنے کے مستحق ہیں، دسویں تاریخ کے ساتھ گیارہویں یا نویں تاریخ کو بھی روزہ رکھیں تا کہ یہود ونصاری کے ساتھ مشابہت نہ ہو۔

کچھ حضرات ماتم مناتے ہیں یہ سمجھ کر کہ امام حسین ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے ہیں، یہ غلط عقیدہ ہے، اللہ نے شہداء کے بارے میں آیت نازل فرمائی، جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو گئے ان لوگوں کو مردہ نہ کہو، وہ تو زندہ ہیں مگر تم ان کی زندگی کی کیفیت کو سمجھ نہیں سکتے۔آپ کی شہادت کا معاملہ ایسا ہی ہے۔

یوم عاشوراء میں مسلمان چند ممنوع چیزوں کو جائز سمجھ کر بڑے زور وشور سے اس کا اہتمام کرتے ہیں، مثلاً علم اٹھانا، جلوس نکالنا، یہ سب خلافِ شرع ہے، بہتر یہ ہے کہ اس دن شہدائے کربلا کے حق میں قرآن خوانی کا اہتمام کریں، ایصال ثواب کا اہتمام کریں۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی کو قبول کریں اور ہم بھی حضرت امام حسینؓ جیسا جگر پیدا کریں۔

مطبوعہ روزنامہ سالار 01/07/1993

جلسہ سیرت النبی یا سیاسی جلسے

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی، اس لیے اس ماہ میں سیرت کے جلسے منعقد کیے جاتے ہیں، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف حمیدہ کا ذکر خیر کیا جاتا ہے اور اس سے ہمارے ایمان کی تجدید کا سامان ہوتا ہے۔ جس سے ہمارے دلوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت دوبالا ہوجاتی ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلنے میں اضافہ ہوتا ہے۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ ایسے مبارک ومسعود جلسوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیانات کے ساتھ ساتھ سیاسی لوگوں کو بھی بلایا جاتا ہے، اور سیاست میں مختلف قسم کی پارٹی کے لوگ ہوتے ہیں، اب ان سیاست کے لوگوں کے لیے اچھا موقع ہے، کیونکہ الیکشن قریب ہے۔ ایسے موقع پر عوام الناس نہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسوں کا فائدہ اٹھا پاتے ہیں نہ سیاست کے داؤ پیچ سمجھ سکتے ہیں۔ لہٰذا میری عاجزانہ گذارش ہے کہ سیرت کے جلسے کرنے والے اس بارے میں خصوصی توجہ دیں اور ان مبارک جلسوں کے تقدس کی حفاظت کریں۔ مزید براں ایک اور گذارش منتظمین جلسہ سے یہ ہے کہ سیرت کے جلسوں کے اشتہارات میں قرآنی آیات نہ چھپوائیں اور اشتہارات لگانے والے غلط اور گندگی جگہوں کے پاس اشتہارات نہ لگائیں اس سے قرآنی آیتوں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک نام کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ اس لیے پاکیزہ جگہ میں لگائیں۔

مطبوعہ روزنامہ سالار 02/07/1999

آخر ایک دوسرے پر پھول جھڑیاں کب تک

چند یوم سے روزنامہ سالار میں یہ مضامین نظروں سے گذر رہے ہیں کہ تعطیل اتوار کو ہونا چاہیے، جمعہ کو چھٹی ہو تو بہتر ہے، وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ اردو مدارس میں سب سے پہلے بچوں کی تعلیم اور صلاحیت وقابلیت پر توجہ دینا ضروری ہے، آج اردو مدارس کی پوزیشن عوام کی نظروں سے گر گئی ہے، چوں کہ وہاں حد سے زیادہ لاپرواہی اور غفلت برتی جاتی ہے، بچوں میں ڈسپلن اور سلیقہ کا فقدان پایا جاتا ہے۔

اردو میں کوئی طالب علم دسویں جماعت تو کیا اگر ایم اے بھی کر لے تو بھی اس کو صحیح ڈھنگ سے لکھنا پڑھنا بھی نہیں آتا۔ طلبہ سے محنت نہیں کرائی جاتی، محض خانہ پری کے لیے حاضری لی جاتی ہے اور وقت گذاری کے لیے الف سے اللہ کو پہچان، ب سے بڑوں کا کہنا مان رٹایا جاتا ہے۔ ایسی صورتحال میں اساتذہ کو چاہیے کہ اپنے آپس کے جھگڑوں کو چھوڑ کر تعلیم کی طرف توجہ دیں۔ اگر اساتذہ ہی اس طرح تو تو میں میں کرتے رہیں گے تو پھر بچوں پر اس کا برا اثر پڑے گا۔ لہٰذا تمام اردو مدارس کے اساتذہ وذمہ دار حضرات سے التماس ہے کہ جمعہ اتوار کی چھٹی کا جھگڑا پس پشت چھوڑ دیں۔ چھٹی کبھی بھی ہو کوئی فرق نہیں پڑے گا، جس کو جیسی سہولت ہو چھٹی رکھ سکتے ہیں، طلبہ کی تعلیم اور صلاحیت کی طرف توجہ فرمائیں اور اردو دشمن قوم کو ہماری حالتِ زار پر ہنسنے کا موقع نہ دیں۔

مطبوعہ روزنامہ سالار 18/07/1994

مسلم متحدہ محاذ کل ہند سطح پر

آزاد ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ''کرناٹک مسلم متحدہ محاذ'' نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے کہ مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر اور اداروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا ہے۔ اور بالکل مختصر سے وقت میں پورے صوبے کا دورہ کر کے نہ صرف مسلمانوں کو ووٹ کی اہمیت سے آگاہ کر دیا بلکہ یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ مسلمان اگر ایک ہو جائیں تو کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ مسلمان اب بھی متحد ہو سکتے ہیں جب کہ صحیح طریقے پر کوشش کی جائے۔

یہ بات تو طے ہے کہ اگر مسلمان متحد ہو جائیں تو صرف ریاست ہی نہیں، سارے ہندوستان بلکہ پوری دنیا کا نقشہ تبدیل کر سکتے ہیں، مسلم متحدہ محاذ کے اس اقدام کے لیے محاذ کے سکریٹری صاحب (مسعود عبدالقادر) اور دوسرے سبھی ذمہ دار حضرات مبارکبادی کے مستحق ہیں، مگر اس کے لیے پہلے ہم سب کو اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس موقع پر ہماری محاذ سے گزارش ہے کہ جس طرح آپ نے ووٹ کے تعلق سے مسلمانوں کی رہنمائی فرمائی، اسی طرح مسلمانوں کے دوسرے مسائل کی فکر بھی کریں۔ یقیناً یہ آپ حضرات کے خلوص وللہیت اور اتحاد واتفاق کا ثمرہ ہی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ریاست بھر کے مسلمانوں کو آپ کے بات پر لبیک کہنے اور آپ کے ارشادات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی، آپ حضرات نے جس طرح ریاست کرناٹک میں کام کیا

اسی طرح اگر ہندوستان کی تمام ریاستوں میں کوشش کر کے ایک ایک ریاستی مسلم متحدہ محاذ قائم کرلی جائے اوراس کی سرپرستی کے لیے ایک مسلم مرکزی محاذ تشکیل دیا جائے تو یقیناً وہ دن دور نہیں کہ پارلیمنٹ میں مسلمانوں کی نمائندگی سب سے زیادہ ہوگی بلکہ وہی اراکین انتخاب میں جیت کر آئیں گے جو مسلمانوں کی پسند کے ہوں گے، آئندہ انتخابات کے لیے ہمارے پاس بہت سارا وقت پڑا ہے، اس درمیان میں اگر مسلم متحدہ محاذ کے ذمہ دار حضرات محنت کر کے کوشش کریں اور ہندوستان کی تمام ریاستوں کا دورہ کر کے اور ریاستوں کا جائزہ لے کر ''کل ہند'' سطح پر دلی میں مسلم متحدہ محاذ کا اجلاس طلب کریں اور آل انڈیا مسلم محاذ کا قیام عمل میں آجائے تو میں سمجھتا ہوں کہ انشاء اللہ ہمارے مسائل اور ہمارے تقاضے آسانی سے حل ہو جائیں گے۔

امید کہ کرناٹکا مسلم متحدہ محاذ کے ذمہ دار حضرات بندے کے اس خیال پر غور فرمائیں گے، نیز قارئین کرام سے بھی مودبانہ گذارش ہے کہ بندہ کے اس خیال پر اپنے تاثرات کا اظہار فرمائیں گے تاکہ تمام مشوروں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے محاذ کے ذمہ داروں کو کسی ایک نتیجہ پر پہنچنے میں آسانی ہو۔ امید کہ قارئین ضرور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم تمام کو ہر سطح پر متحد ہو کر کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

مطبوعہ روزنامہ سالار 13/11/1999

لجنۃ العلماء کا قیام وقت کی اہم ضرورت

بارگاہِ رب العزت میں صد شکر بجالاتے ہوئے اوران حضراتِ علماء کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان حضرات کی خدمت میں ہدیہ تہنیت پیش کرتا ہوں جنہوں نے امت کی موجودہ حالت زاراور مسلم معاشرے کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر بہت بڑا بیڑا اپنے سرلیا ہے، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔

سب سے قبل اس بات کی طرف ہم توجہ دیں، ان بزرگوں نے جو نام رکھا ہے **لجنۃ العلماء** لجنہ کے کیا معنی ہیں، نا صرف عوام بلکہ خواص کے طبقے میں لجنہ کے متعلق غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں، عربی زبان جو حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی قرآن مجید کی اور جنت کی زبان ہے، اور حدیث تفسیر وفقہ اسلامی کا ایک بڑا ذخیرہ جس زبان میں ہے، اس سے عوام تو عوام خواص تک کی غفلت کا اندازہ ہوتا ہے، لجنہ عربی زبان کا ایک لفظ ہے جس کے معنی جماعت، مجلس، کمیٹی یا ایسوسیشن کے ہیں۔ لجنۃ العلماء (بفتح اللام) کو مختلف طریقوں سے پڑھا جارہا ہے۔ بعضوں نے تو حد کردی لجنۃ العلماء علماء کی جنت وغیرہ وغیرہ۔

حضرات علماء کرام نے اس لجنہ کو اس مقصد کے تحت قائم کیا ہے کہ علماء کرام آپس میں سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس بات پر غور وفکر کریں کہ امت کے مسائل کا حل کس طرح نکالا جائے۔ اور امت پر ہونے والے ظلم کا مقابلہ کس طرح کیا جائے، اور امت کو سماج میں کس طرح اوپر لایا جائے؟ امت کو غیروں کا محتاج بننے سے کس طرح روکا جائے، (چاہے وہ تعلیمی میدان میں ہو یا زندگی کے دیگر شعبوں میں ہو) اور امت کو اپنے

عائلی مسائل حل کرانے کے لیے قائم کئے گئے امارت شرعیہ اور اس کے ماتحت قائم دارالقضاء کی طرف رجوع کرنے کی طرف متوجہ کرائیں اور اس کے بجائے غیروں کے سامنے کورٹ کچہریوں میں اپنے معصوم بچیوں کو لے کر پھرنے سے روکا جائے۔

اسی طرح ہر شعبہ میں مسلمان اپنے اپنے نجی مسائل اور دیگر مسائل شرعی حدود میں رہ کر کیسے حل کریں، ان سارے مسائل کے حل کے لیے حضرات علماء کرام نے ایک مجلس قائم کی **لجنة العلماء کرناٹک**۔

میں کرناٹک کے سارے عوام کی طرف سے علماء کرام کی اس گراں قدر اقدام اور لجنۃ کے قیام پر مبارکباد دیتا ہوں اور ادباً گذارش کرتا ہوں کہ اس لجنۃ کو ہمیشہ ہمیشہ باقی رکھیں (یہ بات ضرور ہے کہ ہر کارِ خیر میں شیطان اپنی ٹانگ ضرور اڑاتا ہے، تو مخالفین تو ضرور پیدا ہوں گے، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین تھے تو کیا آپ کی امت کے مخالفین نہیں ہوں گے) اور میں عوام سے بھی گذارش کرتا ہوں کہ حضرات علماء کرام نے اتنا بڑا کام اپنے سر لیا ہے تو ہم سب مل کر ان حضرات کی تائید کریں، میں اس بات کا ذکر کروں تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ لجنۃ صرف یوپی یا دیگر ریاستوں میں مذہبی سیاہ بل کی مخالفت کے لیے فقط نہیں ہے، مسلمانوں کے جتنے بھی مسائل ہوں چاہے وہ رویت ہلال کا مسئلہ ہو، چاہے مسلم پرسنل لاء میں مداخلت کا ہو چاہے جامعہ اسلامیہ میں طلبہ پر ظلم کا کیوں نہ ہو۔ چاہے ندوہ پر چھاپے کا مسئلہ کیوں نہ ہو۔ مسلمانوں کی خلاف کی جانے والی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے ان مقتدر علماء کرام نے اتنا بڑا کام اللہ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے ہم سب حضرات کے تعاون کی امید لے کر لجنہ کا قیام عمل میں لایا ہے۔ لہٰذا میں عوام سے دوبارہ گذارش کرتا ہوں کہ وہ لجنۃ العلماء کا مکمل تعاون فرمائیں اور مخالفین کا

منھ توڑ جواب دیں اور اپنے مسائل کو علماء کرام کی سر پرستی میں حل کریں ورنہ تو غیر مسلم ہم لوگوں کو ایک کھلونا بنالیں گے اور آخر کار ہمارا انجام

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

کے مصداق ہو جائے گا۔

امت کے ہر فرد سے میں گذارش کرتا ہوں کہ وہ علماء سے تعلق رکھیں، ہم لوگوں نے رویت ہلال کے تنازعہ کے بعد علماء سے بدظن ہو کر (نعوذ باللہ) اپنا ناطہ توڑ لیا تھا، یہ سراسر غلط ہے، یہ ایک شیطانی فریب ہے۔شیطان ہمیشہ امت میں فساد برپا کرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی بات کو بڑی بنا کر پیش کرتا ہے، خصوصاً علماء کرام سے عوام کا تعلق توڑنے کی فکر میں زیادہ رہتا ہے کہ کہیں امت علماء سے جڑ نہ جائے اور آنے والی زندگی میں کامیاب نہ ہو جائے ۔ ہمارا طرزِ عمل یہ ہے کہ آج ہم لوگوں نے علماء کرام کو صرف نماز پڑھانے اور نکاح پڑھانے کی حد تک محدود کر رکھا ہے، (اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے) یہ سراسر غلط ہے۔

ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہمارا جو بھی کام ہو علماء سے پوچھ کر ان کے مشورے کے ساتھ انجام دیں، انشاء اللہ اس سے ہماری زندگی سنورے گی، اگر ہم علماء سے کٹ کر زندگی گزاریں گے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ عذاب خداوندی ہمیں آگھیرے۔علماء انبیاء کے وارث ہیں، ظاہر بات ہے کہ وارثین انبیاء غلط مشورے نہیں دیں گے اور غلط راستہ نہیں بتائیں گے۔

ان سب حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے آیئے ہم عہد کریں کہ ہمارے جو بھی مسائل ہوں گے ہم حضراتِ علماء کرام کی سر پرستی میں حل کریں گے اور غیروں کے پاس

اپنے مسائل لے جانے سے گریز کریں گے، اخیر میں ہم یہ بھی عہد کریں کہ ’’لجنۃ العلماء کرناٹک‘‘ کا ہر طرح سے تعاون کریں گے۔ ہم سب دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس لجنۃ کو تا قیامت جاری رکھے اور نظر بد سے بچائے اور ان حضراتِ علماء کرام کا سایہ ہمارے سر پر تا دیر قائم رکھے اور پاک پروردگار ان بزرگوں کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور اپنی غیبی تائید شاملِ حال فرمائے۔

ہمارے دیگر مسائل کی فکر کون کرے

جب بھی ریاست میں پارلیمانی یا اسمبلی انتخابات ہوتے ہیں تو شہر گلستان میں کمیٹی جنم لیتی ہے۔ کبھی جمعیۃ العلماء، کبھی انجمن اصلاح معاشرہ، کبھی خادمانِ ملک وقوم، کبھی ملی پولیٹیکل فارم یا کبھی کوئی اور ادارہ جنم لیتا ہے۔ لیکن ہمدردانِ قوم سے ہم یہ پوچھتے ہیں کہ آپ صرف اخباروں کی زینت بنے رہیں گے یا قوم کے لیے کچھ کام بھی کریں گے ؟ الحمدللہ مسلم متحد محاذ والوں نے سب کو (شہر کے اکثر اداروں کو) یکجا تو کرلیا ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ سارے ادارے مسلم متحدہ محاذ کے لیے کیا گل کھلائیں گے۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ صرف انتخابات کی وجہ سے نئے نئے ادارے جنم لیتے ہیں، پھر دوبارہ انتخابات تک ان اداروں کی طرف سے کوئی آواز پکار نہیں ہوتی۔ اس لیے میں مسلم متحدہ محاذ کے ذمہ داروں سے گزارش کرتا ہوں کہ جب آپ نے سارے اداروں کو یکجا کرہی لیا ہے تو مسلم معاشرے کے مختلف مسائل تعلیمی، دینی سماجی اقتصادی سیاسی وغیرہ ان پر بھی غور کرلیا جائے۔ اس میں مشورہ کر کے ہر شعبے کو ایک ایک ذمہ داری دی جائے مثلاً کسی ایک ادارے کو مسلمانوں کے بچوں کی تعلیم کے تعلق سے فکر دلائیں کہ کس گھر میں بچہ تعلیم سے محروم ہے اور اس کی کیا وجہ ہے؟ تحقیق کریں اور قوم کی ان کرنوں کے تعلق سے ہم فکر کریں، اگر بچہ مالی اعتبار سے کمزور ہے یعنی یونیفارم، کتابیں، اسکولی فیس، وغیرہ تو ہم شہر کے مالداروں کے ذریعہ ان معصوم مفلسوں کا مستقبل روشن کریں۔ مالدار اپنے بچوں کے لیے ہزاروں روپے کا ڈونیشن دے سکتے ہیں تو کیا ان غریب بچوں کے لیے پانچ سو،

ہزار روپے کا ڈونیشن نہیں دے سکتے ۔ ہماری بے فکری کے نتیجہ میں قوم کے بچے علم سے محروم رہ جاتے ہیں، اور جرائم کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

اسی طرح مسلمانوں کے دوسرے مسائل ہیں، بیشمار شعبے ہیں، اگر ہمارے یہ ادارے ایک دوسرے کے مسائل کو، ایک دوسرے کی ذمہ داریوں کو بانٹ کر کام کریں گے تو انشاء اللہ ہمارے مسائل کا حل خود بخود نکل آئے گا۔ ورنہ تو ہماری قوم آج پولیس اسٹیشنوں میں کورٹوں میں اور کچہریوں میں ساری عمر کاٹ رہی ہے۔ قارئین کرام سے بھی گذارش ہے کہ ان خیالات کے تعلق سے اپنے قیمتی مشوروں سے ہم کو نوازیں تا کہ ہم سب کو مل کر امت کے مسائل حل کرنے میں آسانی ہو، ہم آپس میں جب تک ایک دوسرے کا تعاون نہیں کریں گے کوئی کام نہیں ہوگا۔ امید کہ مسلم متحدہ محاذ بندے کی اس حقیر رائے پر غور کرے گی۔

مطبوعہ روزنامہ سالار 10/08/1999

مبارکبادیوں کے بعد وزراء کیا کریں

کرناٹک مسلم متحدہ محاذ کے خوش آئند اقدام کی وجہ سے ساری ریاستِ کرناٹک میں کانگریس کو کامیابی ملی اور ہمارے صوبے میں کانگریس کی حکومت بنی۔ نیز کانگریس کی حکومت بننے کے بعد آزادی کے بعد تاریخ میں پہلی مرتبہ پانچ مسلم وزراء کو کابینہ میں وزراء کے قلمدان سونپے گئے ہیں، اور ہر طرف سے نومنتخب وزراء کو مبارکبادیوں کے پیغامات کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ اگرچہ کہ تمام ریاست کے مسلمانوں کے لیے یہ ایک خوشی کا موقع ہے اور ہر دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلم وزراء کو ان کے عہدے بے حد مبارک کرے۔ مگر اس وقت ہمارے وزراء صرف مبارکبادیوں اور واہ واہ پر اکتفاء نہ کریں، اس وقت کام کی ضرورت ہے، اس وقت اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ جن جن وزراء کو جو قلمدان دیے گئے ہیں اس میدان میں وہ ایسے کام انجام دیں کہ ایک تاریخ بن جائے اور آئندہ آنے والی نسلیں یہ دیکھیں کہ جب کسی مسلمان قوم کو جب کوئی ذمہ داری دی جاتی ہے تو وہ اپنی ذمہ داری کس خوش اسلوبی سے نبھاتے ہیں۔ اس ضمن میں ہمارے معزز وزراء کی خدمت میں میری چند گذارشیں ہیں۔

وزیر ٹرانسپورٹ سے میں گذارش کرتا ہوں کہ شہر میں بسوں کے نظم میں کڑی نگرانی کی جائے اور اسکول کے اوقات میں اسکول کے بچوں کے لیے مستقل بسوں کا انتظام کریں، دفتری اوقات میں بھی بسوں کا اضافہ کریں۔ نیز زیادہ دھواں خارج کرنے

والی سواریاں جیسے آٹو رکشا، ٹیکسی کیاب وغیرہ کا پرمٹ ختم کر دیں تاکہ شہر کی فضا مزید مکدر نہ ہو اور بیماریوں میں اضافہ نہ ہو۔

وزیر سیاحت سے میری گذارش ہے کہ شہر کے بہت سارے پارک ویران پڑے ہیں اور شہر ہی نہیں بلکہ پوری ریاست بھر میں کئی سیاحتی مقامات ٹھیک طرح سے دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے سیاحوں کے لیے وبالِ جان بنے ہوئے ہیں۔ شہر میں کبن پارک، لال باغ اور السور تالاب میں لوگ اپنی فیملیوں کے ساتھ چھٹیوں میں وقت گذاری کے لیے آتے ہیں مگر ٹھیک سے پاکی صفائی نہ ہونے کی وجہ سے طبیعت مکدر ہو جاتی ہے اور تفریح کا سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے آدمیوں کو مقرر کریں، ہمارا شہر ساری دنیا میں گارڈن سٹی کے نام سے مشہور ہے، مگر اب یہ نام صرف زبانوں پر رہ گیا ہے۔

وزیر اوقاف سے گذارش ہے کہ وقف کی بہت ساری جائیدادیں غیروں کے حوالے ہو گئیں ہیں، اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ بہت سارے ادارے وقف کی جائیداد کو اپنی ملکیت بتاتے ہوئے سالہا سال سے کرایہ ادا کیے بغیر اپنی حکمرانی چلا رہے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے مناسب حل نکالیں اور وقف کے خزانہ میں اضافہ کرنے کی فکر کریں۔ بیجاپور کی کئی تاریخی عمارتیں جو دراصل وقف کی ملکیت ہے وہ ویران پڑی ہیں اور بعضوں پر غیر مسلم کا قبضہ ہے۔ اگر ان کی دیکھ بھال کا انتظام کریں تو اس سے ریاست کے تفریحی مقامات میں اضافہ ہوگا اور ملت مسلمہ کے جائداد کی حفاظت بھی ہوگی۔

ہوزنگ منسٹر سے گذارش ہے کہ غریب اور نادار مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جھونپڑ پٹیوں میں بالکل پریشان حال زندگیاں گذار رہی ہے۔ حکومت کی مختلف اسکیموں

کے تحت ان غریبوں کے لیے مکانات تعمیر کر کے الاٹ کیے جائیں۔اس میں مسلمانوں کے لیے مناسب مقدار متعین کی جانی چاہیے۔ ہمارے وزیر صاحب سے مزید ایک گذارش ہے کہ اب تک شہر میں اردو ہال کے لیے آوازیں اٹھتی تھیں پھر سناٹا چھا جاتا۔ وزیر موصوف سے گذارش ہے کہ ایک اردو ہال تعمیر کرادیں تو ایک تاریخی کارنامہ ہوگا۔ کیونکہ شہر میں ادبی نشستیں ہوں تو غیروں کے پاس جا کر ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔

وزیر میڈیکل ایجوکیشن سے گذارش ہے کہ وہ مسلم خواتین اور ضعیف العمر حضرات کے لیے علاحدہ کارڈ بنوائیں، اور مسلمان بچوں کو میڈیکل کالج میں بغیر ڈونیشن کے سیٹ دلوانے کی بھی فکر کریں۔اس کے لیے مسلمانوں کو مناسب ریزولیشن دلوایا جائے۔اس کے علاوہ مسلم مینجمنٹ والے کالجوں کے قیام کی اجازت بھی دلوائیں۔اس طرح ہمارے دیگر مسائل کو اپنے کابینہ کے رفقاء کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کریں۔آپ حضرات کابینہ میں رہ کر مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے میں تساہل برتیں تو پھر غیروں کو مسلمانوں کے تئیں بے فکرا ہونے کا اور زیادہ موقع مل جائے گا۔ مثلاً اگر کوئی مسلمان اپنی کوئی درخواست لے کر کسی مسلم وزیر کے پاس جائے تو وہ صاف کہہ دے گا کہ تمہارے مسلم وزراء ہی تمہاری مدد نہیں کرتے تو ہم کیوں کریں۔اس لیے میں تمام مسلم وزراء سے اور تمام کابینی وزراء سے گذارش کرتا ہوں کہ ہر ایک اپنی اپنی ذمہ داری کو پوری طرح ادا کریں اور قوم کے مسائل کو حل کرنے کی فکر کریں۔امید کہ سارے وزراء، خصوصاً مسلم وزراء ہماری اس پکار کی طرف توجہ دیں گے۔

مطبوعہ روزنامہ سیاست 02/11/1999

خدمتِ خلق اور ہمارے سماجی کارکن

خدمت خلق انسانیت کا اہم ترین شعبہ ہی نہیں بلکہ ایک عظیم کارِ خیر بھی ہے۔انسانوں کی حاجت روائی، مدد اور کارسازی خداوند تعالیٰ کی صفت ہے۔اس کی فضیلت ایک واضح حقیقت ہے۔اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص خدمت کر کے لوگوں پر سبقت لے جائے اس سے کوئی شخص بھی کسی بھی عمل کے ذریعے سے بازی نہیں لے جاسکتا(بیہقی)اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ شخص وہ ہے جو خلق سے نیک سلوک کرتا ہے اور ان کی بے لوث خدمت کرتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب سے زیادہ وقیع اور بہتر وہ شخص ہے جو اپنی استطاعت کے مطابق لوگوں کے مسائل حل کرنے میں دلچسپی لیتا ہے۔ان کی مشکلات اور پریشانیاں دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔بے سہارا غریب لوگوں کو ظلم سے بچاتا ہے اور ان کے الجھے ہوئے مسائل کو سنوارتا ہے اور ایسے کام کرتا ہے جس کے نتیجہ میں معاشرہ خوشگوار اور پرامن بن جائے،اس کو سماجی کارکن یا شوشل ورکر کہا جاتا ہے۔

انسان چونکہ سماجی زندگی کا پابند ہے اور لوگ ایک دوسرے کے محتاج ہیں اس لیے عام انسانوں اور دوسرے مذہب کے ماننے والوں میں بھی خدمت خلق ایک عظیم کام ہے۔اور اس کے لیے پوری دنیا میں کئی فلاحی اور امدادی ادارے کام کررہے ہیں،مگر مسلمانوں کے نزدیک خدمت خلق ایک سماجی ذمہ داری ہی نہیں بلکہ اس کو اہم عبادت کا درجہ حاصل ہے اور اس پر دنیوی معاملات کے وعدے بھی ہیں اور جنت کی بشارت بھی احادیث میں دی گئی ہے مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشخبری دی ہے کہ ”جو شخص میرے

کسی امتی کوخوش کرنے کی نیت سے اس کی کوئی حاجت پوری کرتا ہے وہ دراصل مجھے خوش کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا۔ (مشکوٰۃ)

مسلمانوں میں خدمت خلق کا شوق بہت زیادہ موجود ہے۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس کا مظاہرہ مسلم معاشرے میں اکثر ہوتا رہتا ہے۔ شہر کے ہر محلے میں امدادی انجمنیں اور فلاحی ادارے قائم کیے گئے ہیں۔ اگر ان میں محلے والوں کو کچھ پریشانیاں ہوتی ہیں تو ان کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ یہ یقیناً ایک خوش آئند بات ہے مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ بعض خود ساختہ سماجی کارکنوں نے اس مقدس شعبہ اور اس عظیم کارِ خیر کو بھی ایک کاروبار بنالیا ہے اور اپنے مفاد اور ذاتی اغراض کی خاطر اس کو استعمال کرنے لگے ہیں۔ یہ خود ساختہ خادمانِ خلق صرف دنیوی نفع اور اپنے ذاتی مفاد کی خاطر لوگوں کی خدمت کرتے ہیں اور ان کے معاملات میں دلچسپی لیتے ہیں، بلکہ لوگوں کے ساتھ دھوکہ دہی کا معاملہ کرتے ہیں، وزراء، امراء سرکاری اور پولس افسران سے اپنے تعلقات کا رعب جھاڑ کر بے سہارا غریب لوگوں کو جو ان کے پاس اپنی حاجتیں اور پریشانیاں لے کر آتے ہیں ان کے خون پسینہ سے کمایا ہوا زندگی بھر کا سرمایہ ہڑپ کر جاتے ہیں۔

عوام کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایسے مفاد پرست سوشل ورکروں کے پیچھے نہ پڑیں جن کو قرآن سے لگاؤ نہ حدیث سے کچھ واسطہ، نہ خوفِ خدا نہ فکرِ عقبیٰ۔ اگر کچھ مسائل اور پریشانیاں ہوں تو اہل علم حضرات کی طرف رجوع ہوں اور ان کے مشورے سے دینی فلاحی اداروں کے ذریعہ اپنے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں۔

مطبوعہ روزنامہ سالار 30/05/1998

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ایک بار پھر ملک پر الیکشن کے بادل منڈلا رہے ہیں اور ہر طرف سیاست کا بازار گرم ہے، اس وقت مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ابھی سے طے کرلیں کہ آئندہ ہونے والے انتخابات میں مسلمانوں کا کیا رول ہونا چاہیے۔ ہماری قوم ہمیشہ سے ہی کاہلی میں مشہور ہے اور دوسرے لوگ مسلمانوں کی کاہلی کا غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور جھوٹے وعدے کرتے ہیں۔ مسلمان بھی فوراً ان کی باتوں میں آکر اپنے قیمتی ووٹ کو ضائع کر دیتا ہے۔

لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

ہماری قوم کی کاہلی اور سستی کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، گزشتہ دو تین ماہ میں دو مرتبہ ووٹنگ لسٹ میں نام درج کرانے کے لیے ناموں کی تصحیح کے لیے یا پتہ تبدیل کرانے کے لیے حکومت کی طرف سے بار بار اعلان ہوتا رہا اور روزانہ اخباروں میں اس کی اہمیت بتانے کے باوجود ہماری قوم سستی سے کام چلائی۔ آج بھی اگر مکمل طریقہ سے جائزہ لیا جائے تو پچاس فیصد بھی ووٹنگ فہرست کا کام پورا نہیں ہوا ہے، اکثر نے لاپرواہی سے انجام دیا ہے۔ ووٹنگ لسٹ میں اپنا نام درج کرانے کے لیے کہا جاتا ہے تو غفلت اور لاپرواہی کرتے ہیں۔ جب کسی کام کے لیے (پاسپورٹ یا شہری ثبوت وغیرہ) کے لیے ووٹنگ لسٹ مانگا جاتا ہے تو ان دنوں کارپوریشن آفس یا پنچایت ہال کے چکر لگاتے رہ جاتے ہیں۔ نہ راشن کارڈ ہی بنتا ہے نہ پاسپورٹ وغیرہ۔ دیگر سارے امور ادھورے کے ادھورے رہ جاتے ہیں۔ اس لیے کاہلی کو دور کر کے چستی پیدا کریں۔

ووٹ کی اہمیت کو سمجھیں، ہم لوگوں نے دیکھا کہ ایک مسلمان (سیف الدین

سوز) کے صرف ایک ووٹ کی وجہ سے حکومت کا تختہ پلٹ گیا۔اس بات سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمان چاہے تو حکومت بنا بھی سکتا ہے،حکومت گرا بھی سکتا ہے۔الیکشن کے دن اتحاد واتفاق کے ساتھ کاہلی اور سستی کو بالائے طاق رکھ کر کسی ایک ایسی پارٹی کو کامیاب کریں جو امت کے درد کو سمجھنے والا ہو اور امت کے سارے مسائل کو سمجھنے والا ہو۔ورنہ بقول شاعر

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

مطبوعہ روزنامہ سالار 17/06/1999

قصور کس کا، جھنڈے کا یا.....؟

جشن رحمت للعالمین کا موقع! جی ہاں ایسی عظیم شخصیت کی ولادت کا جشن ہے کہ جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا اور جن کے دشمن بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امن پسندی اور محبت و بھائی چارگی کی تعلیمات کے قائل ہیں، اور جو واقعی نہ صرف مسلمان بلکہ تمام مخلوقات اور تمام عالم کے لیے رحمت بن کر دنیا میں تشریف لائے۔ جنہوں نے ازلی دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف کا معاملہ فرمایا، جنہوں نے جانوروں بلکہ چھوٹے حقیر پرندوں کو بھی تکلیف پہنچانے سے اپنے پیرووں کو منع فرمایا، ضد اور ہٹ دھرمی کو جنہوں نے کبھی پسند نہیں فرمایا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جانثار صحابہ رضوان اللہ علیہم کے اصرار کے باوجود موقع اور مصلحت کے پیش نظر دشمنانِ اسلام کی ہر شرط کو منظور فرمالیا۔ ایسے عظیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے موقع پر کسی فساد کا ہو جانا کیسے تعجب کی بات ہے؟

مگر افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے شہر گلستان (جس کو لوگ امن کا گہوارہ کہتے ہیں) کے ایک علاقے وینکٹیش پورم میں اسی نبی رحمت کے ماننے والوں نے جو خود بھی امتِ رحمت بنا کر دنیا میں بھیجے گئے ہیں اور جن کا کام پوری دنیا میں امن وآشتی کا پیغام عام کرنا ہے، وہ فساد کا ذریعہ بنے۔ بات بالکل معمولی تھی، اور آسانی کے ساتھ معاملے کو سلجھایا جاسکتا تھا، اسی معمولی بات کو لے کر اتنا بڑا فساد ہوا کہ جس کے نتیجے میں تمام شہریانِ بنگلور کے دل دہل گئے

۔گھروں کولوٹا گیا، کاروبار تباہ کیے گئے، کئی گاڑیوں کو نقصان پہنچایا گیا، کتنوں کی جانوں سے کھیلا گیا۔اور ہمیشہ کی طرح اصل مجرم اپنے من میں مست ہیں اور ان مجرموں کے کرتوتوں کی وجہ سے بہت سارے بے قصور معصوموں کو تھانے میں بند کر دیا گیا ہے، یہاں تک کہ جیل بھی بھیج دیا گیا ہے (اللہ تعالیٰ ان بے قصوروں کی جلد رہائی فرمائے)۔

بات بالکل آسانی سے ختم ہونے والی تھی، آسانی کے ساتھ آپس میں اتحاد کا مظاہرہ کرتے اور صلح حدیبیہ کے منظر کو سامنے رکھ کر بات ختم کر دیتے۔خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا کر اس کو بہت بڑا مسئلہ بنا لینے کی وجہ سے جو لوگ مزدور طبقے کے ہیں، خصوصاً کے جی ہلی، عربک کالج، خوشحال نگر اور اطراف و اکناف کے محلوں میں اکثر ایسے لوگ ہیں جو روز کی روزی روز کمانے کھانے والے ہیں، اگر ایک روز نہ کمائیں تو سارا گھر فاقہ کشی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ان لوگوں کے گھروں میں کیا گذری ہوگی، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ظاہر ہے کہ ان مزدوروں کے گھروں میں معصوم بچے ضرور ہوں گے، وہ بچے اپنی بھوک کیسے برداشت کیے ہوں گے۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ سارے فساد اور مجبور و بے کس عوام پر جو مشکلات کے پہاڑ ٹوٹے ہیں، ان سب کا اصل مجرم کون ہے؟ اس کی صحیح جانچ پڑتال کرنے کے بعد ان مجرموں کو واقعی کیفر کردار تک پہنچانا سرکاری اداروں کی ذمہ داری ہے۔ ان مجرموں کو ایسی سزا دی جانی چاہیے جو دوسروں کے لیے عبرت کا سامان ہو۔ اسی کے ساتھ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ بلوائی اور سماج دشمن عناصر تو ایسے موقع کا انتظار کرتے رہتے ہیں، کیا وہ لوگ بھی مجرم نہیں ہوتے جو سماج دشمن عناصر کو ایسے مواقع فراہم کرتے ہیں، اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان تمام حالات میں اصل قصور کس کا ہے، بلوائیوں کا یا جھنڈے کا؟

مطبوعہ روزنامہ پاسبان19/07/1998

اصلاح معاشرہ کے ذمہ داروں سے چند گزارشات

پچھلے دنوں شہر میں ایک اور بچی حمیرہ جہیز کی لعنت کی بھینٹ چڑھی تو ہمارے نوجوانوں کا گرم خون جوش مارنے لگا۔ انجمن اصلاح معاشرہ کچھ فعال ہوئی تو سینکڑوں افراد اس کا ساتھ دینے کے لیے کمربستہ ہوگئے۔ اخبارات میں اصلاح معاشرہ کے تعلق سے اظہار خیال ہورہا ہے اور انجمن اصلاح معاشرہ کو طرح طرح کے مشورے دیے جارہے ہیں، مسلم معاشرے کی بہت بڑی خوبی ہے کہ قوم کے کسی فرد واحد پر کوئی افتاد پڑتی ہے تو پوری قوم چیخ اٹھتی ہے۔ یہ اس حدیث مبارکہ کے عین مطابق ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ مومنوں کی مثال محبت کرنے، رحم کرنے اور ہمدردی کرنے میں ایسی ہے جیسے ایک جسم کی کیفیت ہوتی ہے کہ جب اس کا ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو اس کا سارا جسم بیمار اور بے خوابی میں مبتلا ہوجاتا ہے (بخاری مسلم) یعنی اہل ایمان رشتۂ ایمان کی بناء پر ایک جسم کے اعضاء کی طرح مربوط اور ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی معصوم لڑکی پر جہیز کی وجہ سے مظالم ڈھائے جاتے ہیں اور وہ تنگ آکر خودکشی کرلیتی ہے یا اس کو قتل کردیا جاتا ہے تو پورے مسلم معاشرے میں ایک کھلبلی مچ جاتی ہے، مگر اس کا ایک تاریک پہلو اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ تمام تجاویز اور مشورے صرف زبان وقلم کی حد تک ہی رہتے ہیں اور کوئی مثبت اقدام نہیں ہوپاتا۔ اور یہ احساس اور ردِ عمل بھی دیرپا نہیں رہتا اور جلد ختم ہوجاتا ہے۔

سات سال پہلے دسمبر ۱۹۹۱ کو دارالسلام کے ہال میں اصلاح معاشرہ پر ایک

اجلاس ہوا تھا جس میں تمام مکاتب فکر کے مقتدر علماء کرام اور متعدد شعبہائے زندگی سے وابستہ مسلم دانشور جمع ہوئے تھے، اس اجلاس میں غور وفکر بھی ہوا تھا افہام وتفہیم بھی۔اور علمائے کرام کے بیانات بھی ہوئے تھے، بیانات کو سن کر عوام نے واہ واہ کی اور اہل شعور نے اس پر تبصرے کیے اور بس اس سے زیادہ کچھ حاصل نہیں۔اس اجلاس میں ایک قرار داد منظور کی گئی جس میں اور دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا گیا کہ مسلمان اپنے نکاح مسجد میں انجام دیں۔اور مساجد کے ذمہ دار دفتر نکاح اور قاضی کو مسجد سے باہر فراہم نہ کریں۔ مجلس اصلاح معاشرہ بھی قائم کی گئی، اس کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد ایک دوسرے اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی کہ مسجد میں نکاح کرنا ضروری نہیں ہے اور مسلمانوں کو اس پر مجبور کرنا اور دفتر باہر دینے سے انکار کرنا سخت ظلم اور خلافِ شریعت ہے۔اس کے بعد ایک ہنگامہ برپا ہوگیا اور کئی دنوں تک یہ ہنگامہ رہا۔پھر قبرستان کی سی خاموشی چھا گئی۔

اب تقریباً سات سال بعد ایک اور لڑکی جہیز کی بھینٹ چڑھ گئی تو ایک بار پھر ہنگامہ شروع ہوگیا ہے، اب دیکھنا ہے کہ یہ کتنا دیرپا اور مؤثر ہوگا۔یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اصلاح معاشرہ والے اب تک کیا کرتے رہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اصلاح معاشرہ کو جگانے کے لیے ہر بار ایک معصوم لڑکی کی بلی دینی پڑے گی۔اگر واقعی اصلاح معاشرہ کا کام کرنا ہے تو ہر وقت اور ہمیشہ فعال رہنا چاہیے۔

کسی بھی کام کو مؤثر بنانے کے لیے دو باتیں بہت ضروری ہوتی ہیں، ایک اجتماعیتِ قلوب، دوسرا اتحادِ فکر، یعنی اول یہ ہے کہ تمام مسالک ومکاتب کے فروعی جزئی اور نظریاتی اختلافات کو بھلا کر ایمان کی بنیاد پر ایک ہوجائیں اور حقیقی معنوں میں کالجسد الواحد یعنی ایک ہی جسم کی طرح متحد ہوکر اصلاح معاشرہ کی فکر کریں اور دوسری بات یہ ہے

کہ مسلمان اصلاح کے متعلق اپنی فکر میں بھی اختلاف پیدا نہ کریں اور جو کچھ بھی تجاویز اور قرارداد منظور ہوان پر متفقہ طور پر عمل کریں۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی اس غلطی کو دوبارہ نہ دہرائیں۔ ہماری یہ عادت سی بن گئی ہے کہ اصلاحِ معاشرہ یا کسی بھی کام کے لیے کوئی ادارہ یا انجمن قائم ہوتی ہے تو دوسرے ہی دن اس کے مقابل میں ایک دوسرے ادارے کے قیام کے اعلانات اخبارات میں شائع ہو جاتے ہیں، اسلامی مزاج اجتماعیت کا حامل ہے اور اس نے ہمیں جو نظام عطا فرمایا ہے وہ امارت کا نظام ہے، یعنی مسلمان اپنا کوئی بھی کام جماعت کی شکل میں انجام دیں اور جماعت کا ایک امیر بھی ہو۔ اس لیے اصلاح معاشرہ کے لیے بھی دنیوی طریق پر ادارے اور انجمنیں قائم کر کے صدر وسکریٹری کا انتخاب کرنا اور اجلاسوں و مذاکروں کے ذریعے کام کرنے کے بجائے اگر جماعت کی شکل میں امیر کے ماتحت اور مشورے کے ساتھ کام کریں گے تو انشاء اللہ اللہ تعالیٰ کی مدد بھی شامل حال ہوگی اور انشاءاللہ زیادہ موثر انداز میں کام بھی انجام پائے گا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہمارے ہر کام میں اخلاص وللہیت کا ہونا بھی ضروری ہے اگر اخلاص نہیں ہوگا تو ہمارے ساتھ اللہ کی مدد بھی نہیں ہوگی اور اللہ کی مدد کے بغیر کوئی بھی کام پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم کوئی بھی عمل کریں ہمارا مقصود صرف رضائے الٰہی ہونا چاہیے، اصلاح معاشرہ کا کام بہت اچھا کام ہے، مگر کام کرنے والوں میں بھی اچھائی کا ہونا ضروری ہے کہ ہم کوئی بھی کام کریں چاہے وہ اصلاح معاشرہ کا کام ہو یا کسی اور میدان میں ہم کام کریں درمیانہ روی اور اعتدال کی راہ اختیار کریں، اس لیے کہ اسلامی تعلیمات اعتدال کی تعلیمات ہیں اور عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ بہترین کام وہ ہیں جن میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ ابتداء

میں تو خوب جوش تھا، بھر بھراہٹ تھی، خوب کام کرلیا اور پھر قبرستان کی سی خاموشی۔ یہ تو وہی بات ہوئی چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے۔

یہ بات بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے ہر کام کو چاہے وہ معاشرے کی اصلاح کا کام ہو یا جوڑے جہیز کے مطالبے کو ختم کرنے کا۔ نکاح میں دعوت کے ختم کرنے کا کام ہو یا ڈیکوریشن میں فضول خرچی کو روکنے کا، ہر کام ہم اپنے بڑوں اور علمائے کرام کی سرپرستی میں انجام دیں، اگر علمائے کرام کی سرپرستی اور ان کے مشوروں سے کام ہوگا تو اللہ کی مدد ہمارے ساتھ ہوگی اور غیبی تائید شاملِ حال ہوگی، ورنہ ہم جب تک علمائے کرام کی سرپرستی میں کام نہیں کریں گے ہمیں کامیابی نصیب نہیں ہوگی۔

مطبوعہ روزنامہ سالار 23/05/1998

پڑھیے یک نہ شد دو شد

روزنامہ سالار مورخہ ۱۱ ستمبر میں عزیزی منظر قدوسی کا مضمون ''لیجئے یک نہ شد دو شد'' نہایت ہی فکر انگیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موصوف کو امت کا درد سمجھنے کا ملکہ عطا فرمایا ہے، خصوصاً معاشرے میں علماء کرام کا مقام اور ان کے رول پر بہت فکر کرتے ہیں، مگر افسوس کی بات ہے کہ مذکورہ مضمون کچھ غلط فہمیوں پر مبنی ہے، مجلس اصلاح معاشرہ کی وضاحت نہ کوئی بم ہے نہ میزائل ہے، بلکہ یہ مجلس اصلاح معاشرہ کے اپنے ہی کرتوتوں کا ثمرہ ہے کہ ان علماء کرام کو ضرورت پیش آئی کہ وہ ایک وضاحتی بیان جاری کریں اور عوام کو معلوم کرائیں کہ اصلاح معاشرہ کے کام کو ان علماء کی سرپرستی ضرور حاصل ہے، ان حضرات علماء کرام نے اپنی بے انتہاء مصروفیتوں کے باوجود اپنے قیمتی وقت کو فارغ کر کے انجمن اصلاح معاشرہ کی تمام مجالس میں شرکت کی اور امت کو سمجھانے کا فرض نبھایا ۔لوگ اپنے بیانات میں، جمعہ کے خطبوں میں اور اپنی نجی مجالس میں بھی، اپنے ملنے جلنے والوں میں بھی اس بات کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں اور پوری طرح سے اصلاح معاشرہ کی تائید میں ہیں مگر یہ بات بھی ضروری ہے کہ انجمن کے ذمہ دار حضرات اپنا ہر کام علماء کرام کی رائے اور مشورے سے سرانجام دیں۔ عزیزی منظر قدوسی کو شاید یاد ہوگا کہ آپ نے خود بھی ایک مضمون میں انجمن کے ذمہ داروں کو اس بات کا مشورہ دیا تھا کہ وہ علماء کرام کی سرپرستی میں انہی کے مشورے سے ہر کام انجام دیں۔

منظر صاحب کوسب سے زیادہ تعجب حضرت امیر شریعت کے دستخط پر ہوا ہے، مگر یہاں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے ، میں مانتا ہوں کہ وہ قوم کے امیر ہیں اور ساری ریاست کے مسلمانوں کو لے کر چلنا ہے، مگر امیر بھی ایک انسان ہی ہوتا ہے نہ کہ کوئی دوسری مخلوق، ٹھیک ہے، لوگوں کو سمجھانا ان کی ذمہ داری ہے، مگر لوگوں کو سمجھانے کے باوجود لوگ اپنے مسلک اور مکتب فکر کو سامنے لا کر ہی امیر کو امیر تسلیم کریں تو......؟

کسی تعمیری کام میں اختلاف ہو تو لوگوں کو چاہیے کہ اپنے امیر کی طرف رجوع کریں اور اپنے مسائل کا حل نکال کر انہیں حل کر لیں، مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہے، آج لوگ اپنے اثر ورسوخ کے گھمنڈ میں نہ امارت شرعیہ ہی سے رجوع ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنے امیر سے رجوع کرتے ہیں۔ یہ بھی واضح کر دوں کہ امیر نہ کسی گروہ کے ساتھ ہوتا ہے نہ کسی گروہ کی نفی کرتا ہے، ہاں البتہ آپ ہی غور کریں کہ ایک گروہ اپنے نامناسب کاموں کی وجہ سے عوام اور ساری امت کی نظروں سے گر جائے تو اس کی تائید امیر کیوں کرے۔

اس بیان میں امت کے شیرازے کو بکھیرنے والی کوئی بات نہیں ہے۔ علماء کرام نے امت کو جوڑنے ہی کی بات کی ہے نہ کہ توڑنے والی بات۔ آپ اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ یہ مقتدر علماء کرام امت کے شیرازے کو جوڑنے ہی کا کام کرتے ہیں، آج ان بزرگ علمائے دین نے اپنے مسلک اور اپنے مکتب فکر کو بالائے طاق رکھ کر اتحاد و اتفاق سے کام کر رہے ہیں۔ اگر موصوف کے خیال کے مطابق ''یک نہ شد دو شد'' ہوتے تو جو کام انجمن اصلاح معاشرہ کر رہی ہے، اس میں بھی مختلف علماء اپنے اپنے مسلک اور مکتب کے ساتھ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر الگ بیٹھ جاتے۔

مطبوعہ روزنامہ سالار 16/09/1998

الیکشن میں مسلمانوں کا رول کیا ہو؟

یہ سوال سب کے سامنے ہے کہ ہمارے ووٹ کو ہم کس طرح استعمال کریں۔ ہم لوگوں کو کیسی حکومت کی ضرورت ہے؟ اس کا فیصلہ ہم ووٹنگ بوتھ میں جانے سے پہلے کریں۔ ہمارے علماء کرام اور دیگر حضرات جس کو کہیں انہی کو کامیاب بنائیں اور مجھے امید بھی ہے کہ ہمارے بڑے بزرگ ایسے ہی امیدوار کی تائید کریں گے جو ہمارے مسائل کو سمجھنے والا ہو اور ہمارے مسائل حل کر سکتا ہو۔ ہم لوگ صرف پارٹی کو دیکھ کر اور امیدوار کو دیکھ کر اپنا ووٹ ضائع نہ کریں، اگر ہم امیدواروں کے جھوٹے وعدوں کو دیکھ کر انہیں کامیاب کرائیں تو دوبارہ الیکشن ہونے تک پچھتاوا ہمارے ساتھ رہے گا، اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ کون کتنا وعدے کا سچا ہے، اگر عوام کی کسی امیدوار سے امیدیں وابستہ ہوں کہ وہ کامیاب ہو کر ہمارے سماجی اور تعلیمی اقتصادی نیز دیگر مسائل حل کر سکتا ہے تو اس سے ایک حلفیہ بیان لے لیں۔ اگر اس حلفیہ بیان کے مطابق وہ امیدوار اپنے وعدوں کو پورا نہیں کر رہا ہے تو اس حلفیہ بیان کے ذریعے اس کو پارلمنٹ اور اسمبلی سے واپس بلا سکتے ہیں۔ الیکشن لڑنے والے امیدوار کو معلوم بھی ہونا چاہیے کہ عوام سے وعدہ پورا کرنا ہے۔ ایک اہم گزارش یہ ہے کہ کسی بھی حلقہ سے دو دو مسلمان امیدوار نہ بنیں۔ اس سے تو دوسرے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں نے میرے حلقے کے گزشتہ انتخابات میں دیکھا کہ ہمارے ہی مسلم بھائی کو غیروں نے کچھ رقم دے کر امیدوار بنا دیا تا کہ مسلمانوں کے ووٹ بٹ جائیں اور اس سے غیر فائدہ اٹھائے۔ آخر کار ایسا ہی ہوا، اگر کوئی مسلمان اپنے ہی بھائی

کے خلاف میں الیکشن لڑنے کے لیے کاغذات داخل کیے ہیں تو آپسی رضامندی سے جس کو مناسب سمجھیں اس کو کھڑا کر کے اپنے کاغذات واپس لے لیں۔ سارے مسلمان اتحاد واتفاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے لوگوں کو بتادیں کہ مسلمان اگر ایک ہو جائے تو کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ اور خصوصاً الیکشن کے دن اپنی سستی اور کاہلی کو بالائے طاق رکھ کر ووٹ کی اہمیت کو جان کر دوسروں کو بھی الیکشن بوتھ تک رہنمائی کریں۔ ووٹنگ بوتھ میں جانے سے قبل جن کو معلوم نہیں وہ حضرات رہنماؤں سے معلوم کر لیں ورنہ ہمارا ووٹ ضائع ہو جائے گا۔

مطبوعہ روزنامہ سالار 20/08/1999

جنہیں دیکھ کے شرمائے یہود

آج اس پرفتن دور میں اکثر مسلمانوں کو دیکھا جارہا ہے کہ اپنی رسوم اختراعیہ کے اس قدر پابند ہیں کہ فرائض وواجبات کے قضا ہوجانے یا چھوٹ جانے کا بھی غم نہیں۔ مگر ان من گھڑت رسومات میں رائی برابر کمی نہیں ہوتی۔ ان بری رسموں کی وجہ سے طرح طرح کی پریشانیاں، تنگدستی اور مصیبت آگھیرتی ہے، لیکن اس کا احساس بھی انہیں نہیں ہوتا کہ یہ سب اپنا ہی کیا کرایا تو ہے، چونکہ ان بری رسموں کا رواج عام ہوگیا ہے اس لیے اس کی برائی بھی دلوں سے جاتی رہی۔ برے کام کرتے کرتے اس قدر عادی ہوگئے ہیں اور ایسا سمجھتے ہیں گویا یہ کوئی کارِ ثواب کررہے ہیں۔ بعض امور کو تو اعتقاداً برا جانتے ہیں لیکن عملاً اس کو ہلکا اور معمولی سمجھتے ہیں اور اپنے کو اس کے کرنے میں معذور ومجبور جانتے ہیں، بعض کو تو بالکل مباح اور حلال کہتے ہیں، اس سے بڑھ کر غضب یہ کہ بعض کو طاعت وعبادت بنا چکے ہیں، چونکہ اس میں دنیا کا نقصان اور عاقبت کا خسران تھا، اس لیے ہمارے مسلم سماج کو اس پر آگاہ کرنا مقتضائے خیر خواہی اور ایمان میں سے ہے۔

آج کل شادیوں میں ناچ گانے کرانے کا رواج عام ہوتا جارہا ہے، جس میں مندرجہ ذیل برائیاں ہوتی ہیں: نامحرم عورت کو اہل مجلس دیکھتے ہیں جو کہ آنکھ کا زنا ہے، گانے کی آواز سنتے ہیں جو کہ کانوں کا زنا ہے، عورتیں اور مرد آپس میں باتیں کرتے ہیں جو کہ زبان کا زنا ہے، اس طرح ہر عضو سے زنا صادر ہوتا رہتا ہے جس کا ہمیں احساس تک

نہیں ہوتا، جو زیادہ بے حیا ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہیں جو ہاتھ کا زنا ہوا۔

بخاری شریف کی حدیث میں ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے لوگوں کو عذاب میں دیکھا، ایک غار ہے جو تنور کی شکل کا ہے، نیچے سے کشادہ اور اوپر سے تنگ، اس میں آگ بھڑک رہی ہے، اس میں بہت ساری عورتیں اور مرد ننگے ہیں، جس وقت آگ کا شعلہ بلند ہوتا ہے اس وقت وہ سب اوپر جاتے ہیں اور جب وہ شعلہ نیچے کو آتا ہے تو سب اس کے ساتھ نیچے کو آجاتے ہیں۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے دریافت فرمایا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ زنا کار لوگ ہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جو شخص بری نگاہوں سے دیکھے قیامت کے دن اس کی آنکھوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالا جائے گا۔

قرب قیامت کی نشانیاں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علامات قرب قیامت میں فرمایا کہ جب فلاں فلاں امر واقع ہوں اور گانے والیاں اور بجانے والے علی الاعلان ظاہر ہونے لگیں تو اس وقت لوگوں کو انتظار کرنا چاہیے سرخ ہوا کا، زلزلہ کا، زمین میں غرق ہوجانے کا اور صورت مسخ ہوجانے کا، پتھر برسنے کا اور بڑی بڑی نشانیوں کا، اس طرح لگاتار جیسے لڑی ٹوٹ گئی ہو اور دانے پیہم گرے چلے جا رہے ہوں۔ جو لوگ بے باکی سے ناچ گانے کی محفلوں میں شریک ہوتے ہیں ان کے لیے بہت سی وعیدیں آئی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی قوم میں بے حیائی اور فحش عام ہوجائے تو ان میں طاعون پھوٹ پڑتا ہے اور ایسی ایسی بیماریاں آنے لگتی ہیں کہ ایسی بیماریاں پہلے کبھی نہیں آئی تھیں۔

ہمارے ملک میں طاعون اور دیگر مہلک امراض کا پھیلنا، یہ نتیجہ ہے اپنے برے اور گندے اعمال کا۔ آج کل تو شادی کے کارڈوں میں یہ بھی لکھا جانے لگا ہے کہ فلاں دن آرکسٹرا ہوگا، گویا فسق و فجور کی کھلم کھلا دعوت دی جاتی ہے۔ جب کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تمام گنہگاروں کی معافی ہوسکتی ہے مگر جو کھلم کھلا گناہ کرتے ہیں ان کی معافی نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ تو اپنی ستاری کا معاملہ فرماتا ہے مگر بندہ خود رات میں گناہ کر کے دن میں اپنی شان جتاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے فلاں کے ساتھ زنا کیا، شراب پیا، جوا کھیلا، وغیرہ وغیرہ۔ اس بندے کو کثرتِ گناہ کی وجہ سے یہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ یہ گناہ کا کام ہے اور اس نے دوسروں کو گناہ کا کام بتا کر اپنے ہی خلاف گواہ بنالیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے خدا نے مجھے مزامیر اور معازف کے مٹانے کا حکم دیا ہے۔ مگر امت آج اس کو رونق دینے کا کام کر رہی ہے۔ اس طرح ناچ گانے والوں کو نماز جو کہ معراج المومنین ہے بھلا کیا خاک نصیب ہوگی۔ خود تو نماز نہیں پڑھتے، دوسرے نمازیوں کی نمازوں میں خلل ڈالتے ہیں۔ اور ان کی نمازوں کے برباد ہونے کا وبال انہیں ناچ گانے والوں پر پڑتا ہے۔

ایمان کہاں رہا؟

جب ناچ گانے دیکھنا عام ہوجاتا ہے تو اس کی برائی بھی دلوں سے جاتی رہتی ہے۔ یعنی یہ بات دل سے طوطے کے مانند نکل جاتی ہے کہ یہ برا کام ہے بلکہ اس کے برعکس ناچ گا کر فرحت اور خوشی محسوس ہوتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان ہونے کی علامات کے طور پر ارشاد فرماتے ہیں اگر نیکی کر کے دل خوش ہو اور گناہ کر کے دل برا ہو یعنی ملامت کرے تو سمجھو تم مومن ہو۔ گناہ کر کے دل خوش ہوتا ہو تو پھر ایمان کہاں رہا؟ یہ

انجام تو ناچ گانے دیکھنے کا ہے، جو لوگ خود ناچ گانا کرتے ہیں ان کا کیا حشر ہوگا۔ اور بعض لوگ ناچنے والی اور گانے والی کے عشق میں پھنس جاتے ہیں اور پھنس کر اپنا مال اور عزت وآبرو گنوا بیٹھتے ہیں اور دین اور آخرت سب برباد کردیتے ہیں، اس کا وبال بھی اسی منتظم ہی کو ہوگا۔ یہ عشق مجازی کی وجہ سے عشق حقیقی یعنی اپنے مالک سے عشق کرنا ترک کردیتا ہے اور یہ عشق مجازی ایسی بلا کی چیز ہے کہ بعض دفعہ آدمی کو کفر تک پہنچادیتی ہے۔

حکایت ہے کہ مصر میں ایک شخص مسجد میں رہا کرتا تھا اور اس کے چہرے پر عبادت کا نور چمکتا تھا، ایک دن اذان دینے کے لیے مینار پر چڑھا، اسی مینار کے نیچے ایک نصرانی کا گھر تھا، اتفاق سے نصرانی کی بیٹی پر نگاہ پڑگئی اور عشق ہوگیا۔ اذان کے بعد مینار سے نیچے اترا اور اس کے گھر پہنچا۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ کیا بات ہے اور کیا چاہتا ہے۔ اس شخص نے اپنا حال بیان کیا اور کہا کہ میں اس لڑکی کو چاہتا ہوں۔ لڑکی نے کہا کہ تم مسلمان ہو اور میں نصرانی ہوں، میرا باپ ہرگز تم سے نکاح کرنے نہیں دے گا۔ تو یہ مسلمان کہنے لگا ''اگر میں نصرانی ہوجاؤں تو؟ تو اس نصرانی نے کہا، تب ممکن ہے۔ یہ مسلمان شخص نکاح کی امید میں نصرانی ہوگیا، ابھی نکاح نہیں ہوا تھا کہ کسی کام کے لیے کوٹھے پر چڑھا اور اتفاقاً گر کر مر گیا۔ دنیا اور آخرت دونوں گنوا بیٹھا۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

اکثر لوگ اس بلائے عشق کو معمولی اور ہلکا سمجھتے ہیں اور بعض تو موجب قرب الٰہی جانتے ہیں۔ جو سراسر الحاد اور زندیقی ہے، بددینی کا اعتقاد ہے اور بزرگوں کے کلام کا حوالہ دیتے ہیں جو کہ یہ غلط معنی نہیں رکھتا۔ اور بعض جگہوں میں یہ بھی دیکھنے کو ملا ہے کہ اپنے

پڑوس میں جو شخص رہتا ہے چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر۔ گھر میں ایک دو بار آئے جائے تو اسے ایسا سمجھتے ہیں گویا اسی گھر کا ایک فرد ہے۔ اور اپنے گھر کی نوجوان لڑکی کو اس کے ساتھ بھیجتے ہیں، کوئی منع کرے تو کہتے ہیں کہ ہمارے گھر کے آدمی جیسا ہے۔ لیکن جب ر اس بدعملی کا نتیجہ سامنے آتا ہے تو پھر ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں۔

بے حیائی اور فحاشی

اکثر ہمارے مسلم سماج میں ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ جو دوست غیر مسلم ہوتا ہے اس کے سامنے اپنی ماں بہنوں کو بلا جھجک اور بلا روک ٹوک اور بغیر پردہ کیے بٹھاتے ہیں اور وہ اپنا پلان بنانے لگتا ہے اور موقع کی تاک میں رہتا ہے اگر کوئی روکے تو کہتے ہیں کہ ہمارا پرانا پڑوسی ہے، بلکہ اس کو گھر کا ایک ممبر بنا دیتے ہیں۔ اور وہ گھر والوں کے سارے حالات سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے اور موقع سے فائدہ اٹھا کر ماں بہنوں پر حملہ کر دیتا ہے۔ بات لمبی ہو جاتی ہے، اب اپنے کئے پر پچھتا کر اس کافر کے ہاتھ اپنی بچی کو نکاح کر کے دے دیتے ہیں بلکہ یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ اپنی بچی کو جہنم میں ڈال دیتے ہیں۔ اگر شروع سے احتیاط کرتے اور خدا اور رسول کے احکامات کی پرواہ کرتے تو یہ نتیجہ سامنے نہ آتا۔

بے حیائی اور فحاشی کی حد دیکھئے کہ ہمارے معاشرے میں شادیوں میں جو اسراف ہوتا ہے وہ کھلے عام کیا جاتا ہے۔ حکم خداوندی کو توڑتے ہوئے جب فوٹو گرافر بلا جھجک جہاں مستورات ہوتی ہیں وہاں آتا ہے تو اس کو روکنے کی بجائے ہماری خواتین، اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے، اپنے حسن اور زیورات کا کھل کر مظاہرہ کرتی ہیں۔ ہماری خواتین کو شاید وہ حدیث یاد نہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں

ایک نابینا صحابی آئے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سامنے کھڑی ہوئی تھیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''عائشہ، کیا پردہ نہیں ہے؟ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ اللہ کے نبی یہ تو نابینا ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ تم کو نہیں دیکھ رہے، ٹھیک ہے، مگر تم تو ان کو دیکھ رہی ہو۔ حضرت عائشہ فوراً پردہ میں چلی گئیں۔

ہماری ماں بہنوں کو منع کرو تو کہتی ہیں کہ یہ تو فوٹو والا ہے، یہ تو شکرانے کے دن سے اور رسم کے دن سے ہمارے ہی گھر میں ہے، یہ ہمارے لیے اجنبی نہیں ہے۔ اس طرح عورتیں خود راستہ صاف کر کے دیں تو غیروں سے کیا شکوہ۔ وہ تو موقع سے فائدہ اٹھانا خوب جانتے ہیں۔

ہماری قوم کی بری رسموں کو دیکھ کر غیر خود شرماتے ہیں، اور شرم سے سر نیچے کر کے چلتے ہیں، پہلے دور میں لوگ ہماری قوم کے آداب اور کردار وگفتار کو دیکھ کر ہی ایمان میں داخل ہوجاتے تھے۔ اب ایسا وقت آ گیا ہے کہ ہماری قوم میں بے دینی کی کثرت کی وجہ سے خود کو مسلمان کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح سمجھ عطا فرمائے اور ہم سب کو ان بری رسموں اور رواج کو ختم کر کے اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مطبوعہ روزنامہ پاسبان 23/08/1998

آخر اس مرض کی دوا کیا ہے؟

پندرہویں لوک سبھا انتخابات میں جیت خواہ کسی بھی پارٹی کی ہوئی ہو، دو باتیں واضح طور پر ابھر کر سامنے آگئی ہیں، (۱) ملک میں جمہوریت اور سیکولرازم کی جڑیں بہت مضبوط ہیں جنہیں مذہب، ذات پات، چھوت چھات اور مسالک وفرق کے نام پر کھوکھلا نہیں کیا جاسکتا۔ (۲) ہماری سرسبز وشاداب ریاست کرناٹک میں اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں میں اتحاد واتفاق کی وہ صورتیں ابھی پیدا نہ ہوسکیں، جو ملک کی دیگر ریاستوں میں کافی حد تک پائی جاتی ہیں۔ پڑوسی ریاست آندھرا پردیش کی مثال ہمارے سامنے ہے ، جہاں فرقہ پرست پارٹی بی جے پی کو نہ صرف یہ کہ آگے بڑھنے کا موقع نہ ملا، بلکہ اس کا کھلا ہوا کھاتا بھی بند ہوگیا۔ وہاں کے اقلیتی فرقوں بالخصوص مسلمانوں نے ایسے اتحاد واتفاق کا مظاہرہ کیا کہ ان کی حیثیت اقلیت ہونے کے باوجود کنگ میکر (بادشاہ گر) کی ہوگئی ہے۔

میری معلومات کی حد تک چار پانچ حلقے ضرور ایسے تھے جہاں اقلیتی امیدوار یا مسلم امیدوار کو بآسانی جتایا جاسکتا تھا، بنگلور ساؤتھ سے کرشنا بائرے گوڑا، بنگلور سنٹرل سے ٹی ایچ سانگلیانہ، اور بنگلور نارتھ سے سی کے جعفر شریف صاحب کو اقلیتی طبقے کے افراد بآسانی جیت سے ہمکنار کرسکتے تھے۔ سب سے زیادہ افسوس بنگلور سنٹرل کے نتیجہ سے ہوتا ہے کہ جہاں اقلیتی فرقے سے وابستہ دو امیدواروں کی آپس کی لڑائی سے بی جے پی کے پی سی موہن کو کامیابی کی دہلیز پر قدم رکھنے کا موقع مل گیا، جب کہ الیکشن سے قبل یہ

باور کیا جار ہا تھا کہ اصل مقابلہ صرف کانگریس اور جے ڈی ایس کے درمیان ہی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ''دو بلیوں کی لڑائی میں بندر بانٹ'' کا یہ واقعہ ہماری پہلی لغزش اور غلطی نہیں ہے۔ پچھلے لوک سبھا انتخابات میں بھی ہم نے ایسی ہی ناسمجھی اور سیاسی عدم بیداری کا ثبوت دیا تھا۔ مومن کی شان تو یہ ہونی چاہیے کہ وہ ایک بار گرے تو سنبھل جائے، مگر ہم نے شاید قسم کھا رکھی ہے کہ ہم سدھرنے والے نہیں، دیکھیں کون مائی کا لال آ کر ہمیں ہماری پستی سے نکالتا ہے۔

ریاست میں اقلیتی فرقے کی شکستِ فاش کی صرف یہ ایک وجہ نہیں کہ ان میں آپس میں اتحاد و اتفاق کی کمی ہے، اگر صرف یہی بات ہوتی تو شہر کے مختلف ادارے، جمعیۃ العلماء، پاپولر فرنٹ اور مسلم متحد محاذ جیسی تنظیموں سے یہ امید کی جا سکتی تھی کہ یہ نا اتفاقی وقتی ہے، آئندہ اتحاد و اتفاق کی صورتیں پیدا ہونے کی کافی توقعات ہیں۔ بلکہ اصل چیز اور دکھتی رگ جو ہمارے اندر ہے وہ یہ ہے کہ فیلڈ ورک کا ہمارے اندر فقدان ہے۔ اقلیتی فرقے میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو ''اپنی چمڑی میں مست'' رہنے کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں۔ ''یا شیخ! اپنا اپنا دیکھ'' کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ان لوگوں کے نزدیک ہمیشہ یہی بات پیش نظر رہتی ہے کہ ہزاروں کلو میٹر دہلی کے سنگھاسن پر کون راجمان ہے، اس سے ہمیں کیا مطلب، ہمیں تو بس اپنی اور اپنے بال بچوں کی فکر کرنی چاہیے۔ ان لوگوں سے صرفِ نظر (اور یہ صرفِ نظر کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ آپ ووٹ دینے کو ''ضروری'' سے بڑھ کر ''مسنون''، بلکہ ''واجب'' یا ''فرض'' تک کہہ دیں، ان لوگوں کے کانوں پر جوں تک رینگنے والی نہیں۔) جو لوگ ووٹ کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور ووٹ دینا چاہتے ہیں، اچھے برے امیدواروں کی انہیں تمیز ہے۔ لیکن فیلڈ ورک اور زمینی

کام کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ بعض ایسے ہیں جنہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ووٹنگ آئی ڈی کارڈ کہاں بنوایا جارہا ہے۔ بعض ایسے ہیں جنہیں اتفاقیہ طور پر معلوم تو ہوگیا ہے کہ ووٹنگ آئی ڈی کارڈ کہاں بنایا جارہا ہے، مگر یہ جاننا بھی ان کے لیے وبالِ جاں بنا ہوا ہے۔ ووٹنگ سنٹر کے چکر لگاتے لگاتے ان کی ایڑیاں گھس جاتی ہیں اور مختلف ناموں اور مختلف بہانوں سے ان کی آئی ڈی کارڈ بننے میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں۔

ان سب سے ہٹ کر ایک بڑی تعداد ایسوں کی ہے جنہیں ہر کام میں دیری کرنے کی عادت ہے۔ صبح اٹھیں گے تو دیر سے، رات سوئیں گے تو بھی تاخیر سے، اور عین پولنگ کے دن ووٹ ڈالنا چاہیں گے تو یہ بھی تاخیر سے۔ اور یہ تاخیر ہوتے ہوتے اس قدر ہوجاتی ہے کہ یا تو ان کا دل، خود اپنے آپ کو پولنگ بوتھ تک پہنچا نہیں پاتا۔ یا بہ مشکل پولنگ بوتھ پر پہنچ بھی گئے تو لمبی قطار لگانے کے بعد جب اپنا نمبر آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نام سے تو پہلے ہی ووٹ ڈالا جاچکا ہے۔

علاوہ ازیں اقلیتی طبقے کی نمائندگی کرنے والے اداروں نے بھی اپنا سارا کام بس اسی کو سمجھ لیا ہے کہ اخباروں اور روزناموں کے ذریعے بیداری کے اشتہارات چھاپ دیے اور بس۔ اصل کام جو کرنے کا ہے وہ یہ ہے کہ ہر ادارے والا فیلڈ ورک میں اپنی مہارت بنائے۔ لوگوں کو صحیح راہ نمائی کی جائے، کنڑی زبان سے واقف نہ ہونے والے مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک نہ ہونے دیا جائے۔ ہر ووٹنگ آئی ڈی سنٹر پر اپنا ایک آدمی رکھا جائے جو ناموں کے غلط اندراج، مذکر و مونث، عمر، پتے وغیرہ غلط لکھنے میں ووٹنگ سنٹر کے عملے کی بدعنوانیوں پر روک لگا سکے۔ ساتھ ہی ساتھ اقلیتوں کے ووٹ حاصل کرنے والی سیکولر پارٹیوں کو چاہیے کہ انتخابات میں اپنے امیدوار کا اعلان جلد از جلد

کرے تاکہ اخیر وقت میں طے ہونے والا امیدوار ذہنی طور پر پہلے سے تیار رہے۔اور ووٹر بھی سوچ سمجھ کر اطمینان سے ایک امیدوار کا انتخاب کر سکیں اور مختلف اداروں کو بھی کسی ایک کی تائید کرنے میں زیادہ غور وخوض کا موقع مل سکے۔

مطبوعہ روزنامہ سالار 29/05/2009

بمبئی ٹو گوا

بنگلور شہر ساری دنیا کا عموماً اور ہندوستان کا خصوصاً خوبصورت ترین شہر شمار کیا جاتا ہے اسے باغوں کا شہر اور امن وسرور کا شہر کہا جاتا ہے۔ اسے گارڈن سٹی بھی کہا جاتا ہے اور نہ جانے کیا کیا کہا جاتا ہے، جس طرح ایک عاشق اپنے معشوق کو کئی ایک ناموں سے یاد کرتا ہے اسی طرح بنگلور کے بھی کئی ایک نام ہیں۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اس شہرت کو سن کر غیر ملکی سیاح اور ہندوستانی تاجر وغیرہ یہاں آتے ہیں تو زیر لب مسکراتے ہیں کہ جس طرح کسی کالے کلوٹے بچے کو اس کی ماں چاند کہہ کر پکارتی ہے، شاید اسی طرح بنگلور کو یہ نام دیے گئے ہیں۔ کیونکہ یہاں اکا دکا مشہور سڑکوں مثلاً ایم جی روڈ وغیرہ کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر علاقہ نہیں۔ اور ڈرینج سسٹم ہر جگہ کا ٹھپ ہے۔ ایک رات کی برسات سے بنگلور کی ساری سڑکیں نالوں میں بدل جاتی ہیں۔ فٹ پاتھ پر مٹی جمتے جمتے ڈھیر کا روپ دھار لیتی ہے اور ٹرافک تو بھلی توبہ۔

''بمبئی ٹو گوا'' جانے والے آٹو اس قدر مسافروں کو ٹھونس لیتے ہیں کہ اگر ان کے بس میں ہوتا تو آٹو کی چھت پر بھی سوار کرا لیتے۔ اور وہ اتنی تیز رفتار سے آٹو چلاتے ہیں گویا آٹو نہیں ایروپلین ہے اور وہ پائلٹ ہیں کہ جہاں جی میں آیا ٹھہر گئے۔ خصوصاً عربک کالج کے روبرو، ٹیانری روڈ سرکل اور لال مسجد کے روبرو تو صرف آٹوؤں ہی کا جمگھٹا رہتا ہے اور عربک کالج کے سامنے تو آٹو اس طرح کھڑا کرتے ہیں گویا وہ آٹو شیڈ

ہے۔اور جہاں حکومت نے بس اسٹینڈ بنایا ہے یہ آٹو والے اسے ہی آٹو اسٹینڈ بنا لیتے ہیں اور بس ڈرائیوروں کے تو کیا کہنے، وہ تو سڑک کو اپنے گھر کا آنگن سمجھے ہوئے ہیں۔

غرض بنگلور میں نہ تو ڈرینج سسٹم صحیح ہے اور نہ ہی ٹرافک نظام کنٹرول میں ہے۔ آخر یہ کیا ہو رہا ہے، اگر یہی حال رہا تو وہ دن دور نہیں کہ بنگلور غلاظتوں کے شہر کے نام سے مشہور ہو جائے۔ بھلائی اسی میں ہے کہ حکام فوراً حرکت میں آئیں اور اپنی اپنی ذمہ داریاں نبھائیں۔ خصوصاً آٹو ڈرائیور برادری سے میں اپیل کرتا ہوں کہ مسافروں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئیں اور یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ سڑک پر آٹو کے علاوہ اور بھی بہت سی گاڑیوں کی آمد و رفت ہے۔ ان کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ 'ممبئ ٹو گوا' آٹوؤں کا۔

مطبوعہ روزنامہ پاسبان10/10/1997

جےّ نگر عیدگاہ اور کارپوریشن کا پیشاب خانہ

راقم الحروف جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے ہمیشہ جےّ نگر عیدگاہ کی مسجد حاضر ہوتا ہے، یہاں پر حضرت مولانا زکریا صاحب والا جاہی کے پر مغز اور حیرت انگیز خطاب کو سننے کے لیے دور دور سے مسلمان آتے ہیں، اور مسجد پوری طرح سے بھری ہوتی ہے، مگر مسجد کے شمالی جانب بیٹھنے والے مصلیوں کو قبلہ کی طرف دیوار سے باہر بنے ہوئے پیشاب خانے سے آنے والی پیشاب کی بدبو اور سڑھاند کی وجہ سے بہت تکلیف محسوس ہوتی ہے، اس بدبو کی وجہ سے نہ ٹھیک سے خطبہ سن پاتے ہیں اور نہ نماز میں دل لگتا ہے۔ مسجد کے اس حصے میں اتنی زیادہ بدبو ہوتی ہے کہ سر چکرانے لگتا ہے، اور تھوڑی دیر کے لیے بھی یہاں ٹھہرنا مشکل ہو جاتا ہے، مگر افسوس کی بات ہے کہ اس کی طرف کسی نے بھی توجہ نہیں کی۔ اور جمعہ کے دن بھی اس بدبو کو دور کرنے کی کوئی کوشش نہ کی جاتی۔ چند ماہ قبل مسجد کے سامنے پڑا ہوا مٹی کا ڈھیر ایک تنازعہ بنا ہوا تھا، اس متنازعہ ڈھیر کو ایک سمجھوتے کے تحت طے کر لیا گیا اور مسجد کے لیے کھاتے کے بدلے میں ایک بڑا حصہ مسجد کا راستے کے لیے دے دیا گیا ،مگر اسی وقت مسجد کی دیوار سے لگا کر بنائے گئے کارپوریشن کے اس پیشاب خانے کے متعلق کسی نے بھی خیال نہیں کیا، اس پیشاب خانے کو بھی وہاں سے منتقل کرنے کی ایک

تجویز رکھنی چاہیے تھی۔

مسجد کے ذمہ داروں سے گزارش ہے کہ اس پیشاب خانے کو مسجد کی دیوار سے ہٹا کر بس اسٹانڈ کے نیچے کے حصے میں منتقل کرنے کی کوشش کریں ،جب تک یہ کوشش بارآور نہیں ہوجاتی ،کم از کم جمعہ کی نماز کے موقع پر اس پیشاب خانے کو پاک وصاف کروائیں اور فینائل وغیرہ ڈال کر بدبو سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں تاکہ مصلیوں کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہو اور وہ بشاشت کے ساتھ جمعہ کے خطبے کی سماعت کرسکیں اور نماز جمعہ سے فراغت حاصل کرسکیں اور خطبہ جمعہ میں سنی ہوئی باتوں پر عمل کرنے کی فکر کرسکیں ،امید ہے کہ مسجد کے ذمہ دار حضرات اور کارپوریشن کا عملہ، نیز بی بی ایم پی کے ذمہ دار بھی اس طرف خصوصی توجہ دیں گے۔

(مطبوعہ روزنامہ پاسبان02/09/1999)

ضلعی وقف کمیٹیوں کی تشکیل

سالار مورخہ ۲۵ مئی ، میں محمد اسد اللہ صاحب ہاسن کا مقالہ عزت مآب وزیر اوقاف متوجہ ہوں، نظر سے گذرا۔ موصوف نے واقعی ایک بے حد اہم معاملہ کی طرف وزیر اوقاف کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ اصل میں اوقاف امت مسلمہ کا قیمتی اثاثہ ہے۔ کوئی بھی جائداد اور کوئی بھی چیز آدمی اللہ کے نام پر اسی لیے وقف کرتا ہے کہ اس کے ذریعے عام مسلمانوں کو فائدہ حاصل ہو، مگر افسوس کا مقام ہے کہ ہماری ریاست کے طول وعرض میں بیشمار اوقافی جائیدادیں بے توجہی کا شکار ہوکر بیکار پڑی ہوئی ہیں ، یا پھر مفاد پرست حضرات اس سے غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں ، اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر اوقاف کا انتظام وانصرام ایسے افراد کے ہاتھوں میں ہے جو احساس ذمہ داری سے عاری ہیں، اس وجہ سے اوقافی جائیداد کی بہتات کے باوجود ان سے امت مسلمہ کو قرار واقعی فائدہ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ نئی ضلعی وقف کمیٹیوں کی تشکیل اور اوقافی اداروں پر نئے عہدیداروں کا تقرر واقعی عزت مآب وزیر اوقاف کا ایک خوش آئند اقدام ہے، مگر یہاں ایسے افراد کا تقرر بے حد ضروری ہے جو اس کے اہل ہوں، جو مساجد یا مدارس عربیہ سے وابستہ رہے ہوں اور اوقافی اداروں کے انتظام کا جنہیں تجربہ حاصل ہو۔ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے تمہیں ان کے سپرد کرو امانتوں کو جو ان کے اہل ہیں۔ (النساء) اس آیت مبارکہ کے ضمن میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں حکومت

کے عہدے اور منصب جتنے ہیں وہ سب اللہ کی امانتیں ہیں، جائز نہیں کہ کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد کریں جو اپنی عملی یا علمی قابلیت کے اعتبار سے اس کا اہل نہیں ہے۔ (معارف القرآن)

یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب دیکھو کہ کاموں کی ذمہ داری ایسے لوگوں کے سپرد کردی گئی ہے جو اس کام کے اہل نہیں تو قیامت کا انتظار کرو۔ (بخاری) لہٰذا ہم ہمارے ہردلعزیز وزیر اوقاف سے گذارش کرتے ہیں کہ ضلعی وقف کمیٹیوں کی تشکیل کے وقت مناسب اور اس منصب کے اہل افراد کو مقرر کریں، جو اوقافی جائدادوں کی نہ صرف حفاظت کرسکیں بلکہ ان کے صحیح انتظام کے ذریعے امت مسلمہ کو فائدہ بھی پہنچائیں۔

(مطبوعہ روزنامہ سالار 01/06/2000)

ارزاں ہے خونِ انساں گائے کے دودھ سے

پچھلے تقریباً ایک ہفتہ سے ایک عجیب وغریب بحث اخبارات کی زینت بنی ہوئی ہے پچھلے ہفتے جانوروں کے تحفظ کی علمبردار ہماری مرکزی وزیر محترمہ مینکا گاندھی نے یہ کہہ دیا کہ گائے کا دودھ پینا اس کا خون پینے کے مترادف ہے۔ لوگوں کو دودھ پینے سے روکنے کے لیے محترمہ نے یہاں تک کہہ دیا کہ دودھ پینے سے کینسر جیسی مہلک بیماری لاحق ہوسکتی ہے۔ محترمہ مینکا گاندھی نے یہ بات گاؤ رکشا کے نام پر منعقد ایک اجلاس میں کہی تھی، جہاں کئی سادھو سنت اور مذہبی رہنماء کے ساتھ وہ بھی بطور مہمان خصوصی کے مدعو تھیں۔ محترمہ کی اس انوکھی بات سے برہم ہوکر کئی اہم مذہبی رہنما یہ کہتے ہوئے اجلاس سے نکل گئے کہ یہ دھرم کے نام پر ادھرم کی باتیں کرتی ہیں۔ جب کہ دودھ پینے کہ نہ صرف شاستروں میں اجازت ہے بلکہ دیوتاؤں سے بھی دودھ پینا ثابت ہے۔ اس اجلاس کے منتظمین نے بھی یہ کہتے ہوئے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا کہ ہم نے آپ کو ہمارا ہم خیال سمجھ کر مدعو کیا تھا، مگر آپ نے اپنے غلط نظریات کو پیش کر کے ہمیں مایوس کیا ہے۔ بہر حال محترمہ منیکا گاندھی کے اس بیان کے بعد یہ بحث چھڑ گئی ہے کہ کیا واقعی گائے کے دودھ اور خون میں فرق ہے یا نہیں اور کیا دودھ پینے سے کینسر ہوسکتا ہے۔ محترمہ منیکا گاندھی کا یہ بھی استدلال ہے کہ دودھ حاصل کرنے کے لیے گائے کے چھوٹے بچے (بچھڑے) کو نہ صرف یہ کہ گائے سے جدا کردیا جاتا ہے بلک گائے کو بھی بار بار بچہ جننے کی اذیت سے دوچار کیا جاتا ہے۔ یہ ان جانوروں پر ظلم ہے جبکہ یہ بے زبان جانور ہمارے رحم کے محتاج ہیں۔

بلا شبہ جانوروں پر رحم کرنا ضروری ہے، اسلام میں اس کا سختی سے حکم دیا گیا ہے ۔ چنانچہ ایک موقع پر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا کہ یارسول اللہ، کیا ان جانوروں کے سلسلے میں بھی ہمارے لیے اجر وثواب ہے۔آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہر ایک تر جگہ میں تمہارے لیے اجر ہے۔ (بخاری ومسلم) یعنی جس کسی میں شعور اور حس پایا جاتا ہے خواہ وہ جانور اور چوپایا ہی کیوں نہ ہو، اس کا خیال رکھنا ضروری ہے، اسے بلاوجہ تکلیف پہنچانا جائز نہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ رحم دلی سے پیش آنا اللہ کو پسند ہے اور اس پر وہ لوگوں کو اجر وثواب مرحمت فرماتا ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک عورت دوزخ میں ایک بلی کی وجہ سے ڈالی گئی اس نے اسے باندھے رکھا تھا، نہ تو اس نے اسے کھانے کو دیا اور نہ کھلا چھوڑا کہ حشرات الارض میں سے کچھ کھالیتی۔ (بخاری ومسلم) معلوم ہوا کہ جانوروں پر رحم کرنے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوکر اجر وثواب سے نوازتا ہے اور ان کے ساتھ بے رحمی کا برتاو کرنے پر سخت عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔ مگر جانوروں پر رحم کرنے کے بہانے فطری نظام کائنات اور طبعی طور طریقوں سے ہی بغاوت کر دینا یہ کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے۔

خیر یہ دوسری بات ہے۔ مگر افسوس اور صد افسوس اس بات پر ہے کہ جانوروں پر رحم کی بات کرنے والے ان حضرات کو ملک بھر میں انسانی جانوں پر ہو رہے ظلم واستبداد کا کوئی احساس نہیں ہے۔ کشمیر کی چھتی سنگھ پورہ سے لے کر چنتامنی کی کمبلا پلی تک بہنے والے انسانی خون کے نالوں پر ان کی نظر نہیں پڑتی۔ ان انسانیت سوز حادثات سے پورا ملک دہل گیا بلکہ اقوام متحدہ تک اس کی گونج سنائی دی۔ ہر چھوٹے بڑے نے معصوم انسانی

جانوں کی اس پامالی پر اپنے غم و غصے کا اظہار کیا مگر محترمہ منیکا گاندھی نے اس پر تبصرہ کرنا ضروری نہ سمجھا۔ بلکہ اسی درمیان دودھ کا مسئلہ کھڑا کر کے ملک اور قوم کو ایک نئی الجھن کا شکار کر دیا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ محترمہ نے اپنی آنکھوں پر دودھ کی سفید عینک اس طرح پہن لی ہے کہ انہیں معصوم انسانوں کا بہتا ہوا لال لال خون نظر ہی نہیں آتا اور نہ ہی جلی ہوئی کالی نعشیں۔ گویا جانوروں کے مقابلے میں انسانی جانوں کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ کیا انسانی خون جانوروں کے دودھ سے بھی زیادہ بے قیمت اور بے وقعت ہو گیا ہے۔ یہ وقت اس بحث میں پڑنے کا نہیں کہ گائے کے دودھ اور گائے کے خون میں کچھ فرق ہے یا نہیں بلکہ یہ سوچنے کا وقت ہے کہ ان انسان نما درندوں کو انسانیت کا سبق سکھا کر انہیں معصوم انسانی جانوں سے کھلواڑ کرنے سے کس طرح روکا جائے اور انسانی خون کی ارزانی کو ختم کیا جائے۔

غلامی سے آزادی کی طرف......

(آزادی صرف حکومت بدلنے کا نام نہیں بلکہ اصل آزادی روح اور ذہن کی آزادی ہے، سوچ اور فکر کی آزادی ہے۔ اسی طرح غلامی صرف حکومتی سطح پر غلام اور ماتحت رہنے کا نام نہیں بلکہ ذہن ودماغ کی غلامی اور غلامانہ سوچ وفکر ہی اصل غلامی ہے۔ زیرنظر مضمون میں غلامانہ سوچ اور خودمختارانہ فکروخیال کی ہلکی سی تصویر کشی کی گئی ہے)

صبح کا تڑکا ہوا، اور سورج کی پہلی کرن نینا اور نینو کے پنجرے پر پڑی۔

''اٹھو نینو! ابھی تک تمہاری اونگھ ختم نہیں ہوئی، بس تھوڑی ہی دیر ہوگی کہ لالہ جی آئیں گے اور ہمیں پیار بھری نظروں سے دیکھ کر دانہ پانی دیں گے'' نینا نے نینو کو جھنجھوڑتے ہوئے اٹھادیا۔

''اونہہ، اس میں کون سی نئی بات ہے جو تم اتنا شور مچارہی ہو، وہی صبح، وہی لالہ جی کا کھوسٹ چہرہ، اور وہی پرانے طرز کا دانہ پانی، لالہ جی کو اتنا خیال نہیں آتا کہ اگر ہمیں اپنے پنجرے میں بند کرہی دیا ہے تو کم ازکم عمدہ کھانے پینے کا انتظام تو کردیتا۔ دوچار ہری مرچیں دینے سے اس کی لاکھوں کی جائیداد میں کون سی کمی آجائے گی۔ اور رہے امرود، وہ تو شاید ہمیں مرنے کے بعد ہی ملیں گے، جنت میں''۔ نینو نے جاگتے ہی بھاشن شروع کردیا تھا۔

نینا نے ہانڈی سے باہر نکل کر پورے پنجرے کا ایک چکر لگایا، پھر دوبارہ نینو کے بازو میں جاکر بیٹھ گئی۔

''کیا دیکھ آئی ہو'' نینو نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، کل کا پانی میلا ہوگیا ہے، پینے کے قابل نہیں۔ دانے بھی ختم ہوگئے

ہیں، بس لالہ جی کے اٹھنے کا انتظار کر رہی ہوں''

''کرتی رہو انتظار، میں تو سونے چلا، کمبخت لالہ جی، جلدی اٹھتا بھی تو نہیں۔ نینو نے تنک کر کہا۔

نینا بھڑک اٹھی'' جب دیکھو لالہ جی کی شکایت کرتے رہتے ہو، یہ نہیں دیکھتے کہ اس نے ہمیں کتنے خوبصورت پنجرے میں کیسے آرام سے رکھا ہے، روزانہ ہمارے لیے پانی وہ خود لاتے ہیں، چارے کا انتظام اپنی کمائی سے وہ خود کرتے ہیں، صبح وشام ہماری دیکھ بھال کرتے ہیں، اور پھر پنجرے میں کھانے کے لیے دانے کا برتن، پینے کے لیے پانی کا برتن، سونے کے لیے ہانڈی، اور کھیلنے کے لیے جھولا، ڈالی؛ سب کچھ تو موجود ہے۔ وہ تو شکر کرو کہ ہم پنجرے میں آرام سے جی رہے ہیں اور لالہ جی ہمارے محافظ ہیں۔ اگر کھلے آسمان میں اڑتے ہوئے تو اب تک نہ معلوم کس چیل کے شکار ہو جاتے یا کس عقاب کی نظروں میں آجاتے۔ تمہیں معلوم ہے نا، عقاب طوطوں کو بہت رغبت سے کھاتا ہے۔ وہ ہمارا خاندانی دشمن ہے'' نینا نے دل کی ساری بھڑاس نکال لی۔

''اری نادان، آزادی سے کھلے آسمان میں اڑنے کا جو مزا ہے، وہ اس قید وبند کی زندگی میں کہاں۔ تو کیا سمجھتی ہے، لالہ جی ہمارے لیے دانہ پانی کا انتظام یوں ہی کر رہا ہے۔ وہ تو اس لیے ہماری دیکھ بھال کرتا ہے کہ ہم خوش رنگ ہیں، ہماری وجہ سے اس کے گھر کی زینت بڑھتی ہے۔ ہم اس کی اور اس کے بچوں کی آوازوں کی نقل اتار کر اس کا دل بہلاتے ہیں، مہمانوں کے سامنے وہ فخر سے ہمیں پیش کرتا ہے، ہماری میٹھی آواز سے اس کے مہمانوں کا بھی دل بہلتا ہے۔ اگر ہم میں یہ سب خوبیاں نہ ہوتیں تو کیا وہ ہمیں گھاس ڈالتا۔ خیر تجھے سمجھانا میرے بس کی بات نہیں۔ میں سونے جا رہا ہوں، جب تک لالہ آ کر

دانہ پانی نہ ڈال دے، مجھے اٹھانا مت‘‘۔ نینو یہ کہہ کر سیدھا ہانڈی میں گھسا اور گردن لٹکا کر آنکھیں موندلیں۔

پورا ایک گھنٹہ گزر گیا۔ لالہ جی شاید رات دیر سے سوئے تھے، صبح دیر تک سوتے پڑے رہے۔ نینا کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے، اس نے بادلِ ناخواستہ پنجرے کا ایک اور چکر لگایا۔ دو چار دانے ادھر ادھر مل ہی گئے، اس نے انہیں چُگ کر پانی پیا، پانی بہت میلا ہو چکا تھا، چونچ مارتے ہی منہ کا مزا کر کرا ہو گیا۔ اچانک اس کی نگاہ سامنے احاطہ کی دیوار پر پڑی، اسی کی رنگت کا ایک طوطا وہاں بیٹھ کر بڑے غور سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ نینا جلدی سے ہانڈی میں گئی اور نینو کو اٹھا دیا۔

’’نینو، جلدی اٹھو، ارے اٹھو تو سہی‘‘

’’اونہہ، کیا بات ہے، لالہ اٹھ گیا ہے کیا‘‘

’’لالہ جی تو اٹھے نہیں، مگر دیکھو سامنے دیوار پر ہماری برادری کا کوئی طوطا آیا ہوا ہے‘‘۔ نینا کے جھنجھوڑنے پر نینو باہر نکل آیا۔ احاطہ کی دیوار پر اجنبی طوطا ابھی تک بیٹھا ہوا تھا۔ ’’چیں چوں، چیں چوں‘‘ نینو نے اپنی مترنم آواز میں اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

طوطے نے بھی فوراً جواب دیا ’’کہو دوست، کیا حال ہے‘‘

’’حال چال کیا پوچھتے ہو، دیکھ نہیں رہے ہو ہم کس اذیت ناک قید میں ہیں‘‘۔ نینو نے جواب دیا۔

’’نا جی! اذیت ناک، وذیت ناک کچھ نہیں، بس ہم اپنے پنجرے میں آرام سے ہیں۔ نینا بیچ میں بول پڑی۔

’’جی وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں، ویسے آج ناشتے میں کیا ملا؟‘‘ اجنبی طوطے نے

طنز کے تیر چلاتے ہوئے کہا۔

نینو کچھ کہنا چاہتا تھا مگر نینا بیچ میں بول پڑی ''جی بات یہ ہے کہ ہم کل رات ذرا دیر سے سوئے ہوئے تھے، بس ابھی جاگے ہیں، ابھی تھوڑی دیر میں ناشتہ آجائے گا۔ ہری مرچ اور سینڈوچ تو روز ملتے ہیں، کبھی کبھار امرود بھی مل جاتا ہے۔ نینا نے دروغ گوئی میں ذرا سا بھی تکلف نہیں کیا تھا۔ نینو، نینا کی طرف بس دیکھتا ہی رہ گیا۔

''اچھا یار، اپنی سناؤ تم نے آج ناشتہ میں کیا پایا''

''ایک چیز ہو تو بتاؤں، مختلف چیزیں کھا کھا کر میرا تو پیٹ بھر چکا ہے۔ بس ذرا اپنے بچے کے لیے کسی نرم غذا کی تلاش میں گھوم رہا ہوں''۔ نینو کے پوچھنے پر طوطے نے بتایا۔ پھر پر تولتے ہوئے کہنے لگا ''اچھا چلتا ہوں دوستو، بس ایک بات کہتا ہوں برا نہ ماننا، تم دونوں انسانوں کی صحبت میں رہ کر بری عادتیں سیکھ رہے ہو۔ رات دیر سے سونا، صبح دیر تک سوتے رہنا یہ اچھی عادت نہیں۔ صبح کا سونا رزق میں کمی لاتا ہے اور ہاں، جہاں تک ہو سکے آزاد ہونے کی کوشش کرتے رہنا، اور موقع ملتے ہی بھاگ نکلنا، چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔

''دیکھا، کیسا آزاد پنچھی تھا۔ جہاں چاہا، جو چاہا چگ لیا اور پھر رات کو اپنے گھر واپس''۔ نینو نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''ہونہہ، آزاد پنچھی!، دیکھو کیسے اپنے بچے کی غذا کے لیے مارا مارا پھر رہا ہے'' نینا نے دل میں سوچا اور پنجرے کی آہنی دیوار سے لگ کر لالہ جی کا انتظار کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد لالہ جی نے دروازہ کھولا۔ پہلے پنجرے کو دیکھا پھر تالے کو۔ پھر اس سے مطمئن ہو کر اندر جھانکا، دونوں موجود تھے۔ ایک لمبی انگڑائی لے کر اس نے پہلے نینو کو آواز دی۔

''نینو، نینو''۔ نینو ہانڈی پر بیٹھا ہوا تھا، اس نے لالہ جی کی پکار کا کچھ جواب نہیں

دیا۔ لالہ جی نے تھوڑی دیر بعد نینا کو پکارا۔ ''نینا، نینا''۔ نینا نے جواب دیا ''لالہ، لالہ''

''ہونہہ، معلوم نہیں یہ نینو کو کیا ہوتا جا رہا ہے، بیمار ہو گیا شاید''۔ لالہ جی نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور اندر کوٹھری کی طرف بڑھ گئے۔ تھیلا کھول کر دانے برتن میں نکالنے لگے۔ ''اف، ایک کلو لایا تھا، دو مہینے بھی نہیں گزرے، سب کھا کر ختم کر دیا ان دونوں نے'' لالہ دل ہی دل میں سوچ کر رہ گیا اور دانے لے کر پنجرے کی طرف بڑھ گیا۔

''تم نے لالہ جی کی پکار کا جواب کیوں نہیں دیا'' ادھر نینا، نینو سے پوچھ رہی تھی۔

''اسی پر بس نہیں نینا! اب تو میں لالہ جی کی کسی پکار کا جواب نہیں دوں گا۔ آزاد طوطے کی بات میرے دل میں گھر کر گئی ہے'' نینو نے اطمینان سے جواب دیا۔

''اونہہ، نہ جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے، خیر اب ڈھنگ سے بیٹھو، دیکھو لالہ جی آرہے ہیں''۔ نینا نے ڈالی پر جھولتے ہوئے کہا۔

لالہ جی نے دانے کا برتن اندر کھسکایا، لیکن پانی بدلنا بھول گئے، نینا چیخ چیخ کر یاد دلاتی رہی مگر وہ اس کی بولی کیا سمجھتے۔ ناشتہ کیا اور دکان پر چلے گئے۔

نینا نیچے اتر کر دانہ چگنے لگی۔ نینو اوپر ہی بیٹھا رہا۔ ''آؤ نینو، آج روزہ ہے کیا؟ بھوک نہیں لگی؟ بھوک تو لگی ہے، مگر کھانے کی بھوک نہیں، آزادی کی بھوک لگی ہے۔ آزادی کی بھوک''۔

''خیر تمہاری مرضی، تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ نینا نے کہا اور خاموشی سے دانہ چگنے لگی۔ مگر آج اکیلے کھاتے ہوئے اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ''کھانے کے بعد پیوگی کیا؟ پانی تو ہے نہیں۔ نینو نے اوپر ہی سے پوچھ لیا۔

لالہ جی پانی رکھنا بھول گئے ہیں شاید، شام کو آ کر رکھ دیں گے'' نینا نے بے دلی سے کہا۔

بس وہ دن تھا اور اس کے بعد کے تین دن۔ نینو نے نہ کچھ کھایا نہ کچھ پیا۔ نینا کے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ انکار ہی کرتا رہا۔ چوتھے دن لالہ جی جب پنجرے میں جھانکے تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ ان کا قیمتی طوطا مینو مرا پڑا ہے۔ اور اس کی مادہ نینا اس کے قریب ہی سر جھکائے بیٹھی ہے۔

''ہونہہ، مر گیا مردود'' لالہ جی نے ناک سکوڑتے ہوئے کہا اور پنجرے میں ہاتھ ڈال کر پیروں سے گھسیٹتے ہوئے نینو کو باہر نکالا اور کیاریوں میں پھینک دیا جیسے وہ کوئی طوطا نہیں، سڑا گلا پھل ہو۔

نینا نے سر جھکائے یہ سارا منظر دیکھا۔ شام تک وہ لالہ جی کے بارے میں سوچتی رہی، ایک دفعہ نظر اٹھا کر باہر دیکھا تو چیونٹیوں کی ایک قطار نینو کے منہ میں جا رہی تھی۔ چند مکوڑے بھی ارد گرد گھومتے نظر آ گئے۔ یہ دیکھ کر اس نے ایک سرد آہ بھری اور دھم سے گر گئی۔

لالہ جی چائے پیتے بیٹھ کر یہ منظر دیکھ رہے تھے، انہوں نے جب نینا کو گرتے دیکھا تو اپنا سر پکڑ لیا۔ ''معلوم نہیں، کیا بات ہے، آج کل ہر جگہ بے ایمانی کا دھندا ہے، کیسے پرندے دیے ہیں ٹھگوں نے، ایک صبح مرا تھا اب یہ دوسرا بھی مر گیا''۔ چائے کی پیالی رکھ کر وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھے اور پنجرہ کھول کر نینا کو پیروں سے پکڑا اور باہر کھینچ لیا۔ مگر یہ کیا!! پنجرے سے باہر آتے ہی نینا پھڑ پھڑائی، اور لالہ جی کے ہاتھ سے چھوٹ کر سیدھے اڑتی ہوئی احاطہ کی دیوار پر جا بیٹھی۔

''ارے یہ تو زندہ ہے'' لالہ جی نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا۔ نینا دیوار پر بیٹھی تھی اور لالہ جی چوکھٹ پر کھڑے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ''نینا، نینا''

لالہ جی نے پیار بھرے لہجہ میں پکارا۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ ہرگز اچک کر نینا کو پکڑ نہیں سکتے ۔ نینا خود ہی چاہے تو واپس آسکتی ہے ورنہ اسے پکڑنا ان کے بس کی بات نہیں۔

نینا نے ایک نظر لالہ جی کو دیکھا اور ایک نظر نیچے مردہ پڑے ہوئے نینو کو۔

''شکریہ نینو، تمہاری نصیحت آموز باتوں نے مجھے آزادی کی وہ قدر و قیمت نہیں بتائی جتنا کہ تمہاری موت نے مجھے سمجھا دیا۔ لالہ تمہیں پنجرے سے نہیں نکالتا تھا، تو تم نے دنیا ہی سے نکل جانے کے سوچ لیا۔ خیر۔ آج تمہاری بدولت میں آزاد ہوں، لیکن صرف جسمانی طور پر آزاد نہیں بلکہ ذہنی و فکری طور پر بھی آزاد ہوں۔ میں سمجھ گئی ہوں کہ لالہ ہمارا محافظ نہیں تھا، وہ تو اپنے مفادات کا محافظ تھا۔ اسے ہم سے محبت نہیں تھی، اسے تو اپنی خواہشات کی تکمیل سے محبت تھی۔ اگر اسے ذرا بھی تم سے محبت ہوتی تو وہ تمہیں دفن ضرور کرتا، تمہیں یوں کیڑے مکوڑوں کے حوالے نہ کرتا۔ لیکن وہ بھلا تمہیں دفن کیوں کرے گا، تم زندہ تھے تو اس کے کام کے تھے، مردہ طوطے کو لے کر وہ کیا کرتا۔ آہ نینو! لیکن تم نے مجھے یہ سمجھانے کے لیے بہت بڑی قیمت چکائی۔ بہت بڑی قیمت۔ نینا نے کہا اور لالہ جی کو متاسف و پریشان چھوڑ کر ہنستی ہوئی چلی گئی۔

قفس کی بندشوں سے آسمان کی وسعتوں کی طرف......

ذہن کی اسیری سے خودمختارانہ فکر و خیال کی طرف......

رزق کی تنگی سے فراخی کی طرف......

غلامی سے آزادی کی طرف......

ٹکٹ کوڑرِی سر

'شیواجی نگر' سے 'عربک کالج' جاتے ہوئے اس نے بی ایم ٹی سی (B.M.T.C) بس میں دس روپے کا نوٹ نکال کر ہتھیلی میں پکڑا اور کنڈ یکٹر کا انتظار کرنے لگا۔ بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ویسے بھی یہ شام کا وقت تھا، لوگ اپنے اپنے دفاتر سے تھکے ماندے ستاتے ہوئے بوجھل قدموں کے ساتھ، نڈھال؛ جلد از جلد اپنے گھروں کو پہنچنے کی فکر میں تھے۔ صبح وشام کے اوقات تو ویسے ہی بسیں بھری ہوتی ہیں، پھر ٹیانری روڈ کی بس بھلا کیسے خالی رہ سکتی ہے جب کہ شہر کی تقریباً نصف آبادی اسی تنگ وتاریک علاقے میں ''آباد'' ہے۔ شیواجی نگر سے عربک کالج کا کرایہ نو روپے ہے، ایک روپیہ بچے گا، وہ سوچنے لگا۔ ایک روپے میں وہ منے کے لیے کیا لے جاسکتا ہے زیادہ سے زیادہ ایک سستے والا چاکلیٹ ہی آجائے گا اور بس۔ بیوی آج پھر طعنہ دے گی، اڑوس پڑوس کے لوگ کام سے لوٹتے وقت ہر دن کچھ نہ کچھ اپنے بچوں کے لیے مٹھائی، کھلونے وغیرہ لاتے ہیں، بس ایک آپ ہیں کہ جب دیکھو، ہاتھ جھاڑے چلے آرہے ہیں۔

''ٹکٹ، ٹکٹ'' کنڈ یکٹر کی آواز پر وہ چونک کر خیالوں کی دنیا سے نکل آیا۔ ہاتھ میں پہلے سے پکڑا ہوا دس روپے کا نوٹ اس نے آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''عربک کالج، ونڈ۔ کنڈ یکٹر نے اس کے ہاتھ سے نوٹ لیا، ایک اچٹتی سی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی، نوٹ انگلیوں میں دباتے ہوئے اس نے بیگ سے پانچ روپے کا نیا سکہ نکالا اور اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ ٹکٹ، ٹکٹ...اسے اپنی پشت سے کنڈ یکٹر کی آواز آنے لگی۔ اس نے حیرت سے اپنے ہاتھ میں ٹھسے ہوئے پانچ کے سکے کو دیکھا۔ کیا کرے، کیا نہ کرے؟؟

یہی وہ لمحہ ہے جہاں اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ یہ لمحہ فیصلے کا لمحہ ہوتا ہے۔ یہ ساعت فیصلے کی ساعت ہوتی ہے۔ یہ لمحہ، یہ ساعت اپنی تنگ دامنی کے باوجود انتہائی نازک ہوتی ہے، انسانی زندگی میں فیصلے کی یہ گھڑی ایک بار نہیں بار بار آتی ہے، کئی موقعوں سے آتی ہے، کئی طریقوں سے آتی ہے، چھوٹے سے چھوٹے اور کم حیثیت افراد پر بھی آتی ہے اور ذی حیثیت عظیم شخصیات پر بھی۔ معمولی سے معمولی کلرک پر بھی آتی ہے اور ملک کے وزیرِ اعظم پر بھی۔ راہ چلتے راہ گیروں پر بھی آتی ہے اور بلند و بالا طیارہ نشینوں پر بھی۔ یہ وقت، یہ ساعت، یہ لمحہ، یہ گھڑی، یہ پل فیصلے اور ڈسیشن کا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے نفع وضرر کو سامنے رکھ کر اپنی راہِ عمل کا انتخاب کرے۔

دنیا کے تمام جھوٹے مذاہب کے درمیان صرف اور صرف اسلام ہی ایک ایسا سچا مذہب ہے جو اس نازک موڑ پر انسان کی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔ جی ہاں، یہ اسلام ہی ہے جس نے ہمیں دوسروں کے حقوق کی مکمل پاسداری کی تعلیم دی ہے۔ روپیوں پیسوں کی تحصیل کے کچھ ذرائع پسندیدہ ہیں اور کچھ ناپسندیدہ۔ چوری، ڈاکہ، دھوکہ، فریب کو ساری ہی دنیا برا سمجھتی ہے لیکن ان ذرائع کے جائز یا ناجائز ہونے کا کوئی صحیح معیار عام طور پر لوگوں کے پاس نہیں۔ اور ہو بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ اس کا تعلق پوری دنیا کے انسانوں کی صلاح وفلاح اور بہبودی سے ہے، اور پوری انسانیت کی صلاح و بہبودی کی راہ وہی بتا سکتا ہے جو خود اس عالمِ انسانیت کا رب ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق مت کھاؤ۔ سود، قمار، دھوکہ، فریب پر مشتمل ذرائع معاش کو حرام قرار دینے کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ وہ حقوقِ عامہ کے لیے مضر ہیں۔ ان کے نتیجے میں خواہ چند افراد پلیں، بڑھیں، لیکن ساری امت مفلسی کے گڑھے میں گرتی چلی جاتی ہے، ایسے معاملات فریقین کی رضامندی سے بھی اس لیے حلال نہیں کہ وہ پوری انسانیت کے خلاف ایک جرم ہے،

کسی شخص کے مال میں ناجائز تصرف دراصل اپنے مال میں تصرف کے لیے راستہ ہموار کرنا ہے، غور کیجئے اشیاء ضرورت میں ملاوٹ کی رسم چل پڑے، کوئی شخص گھی میں تیل ملا کر، یا چربی ملا کر زائد پیسے وصول کرے تو لازماً یہ ہوگا کہ جب اسے دودھ خریدنے کی ضرورت ہوگی دودھ والا دودھ میں پانی ملا کر دیگا۔ مسالے کی ضرورت ہوگی، اس میں ملاوٹ ہوگی، دوا کی ضرورت ہوگی، اس میں ملاوٹ ہوگی، تو جتنے پیسے ایک شخص نے ملاوٹ کر کے زائد حاصل کیئے، دوسرا آدمی وہ پیسے اس کی جیب سے نکال لیتا ہے اور اس طرح دوسرے کے پیسے تیسرا نکال لیتا ہے، یہ بیوقوف اپنی جگہ پیسوں کی زیادتی شمار کر کے خوش ہوتا رہتا ہے مگر انجام نہیں دیکھتا کہ اس کے پاس رہا کیا؟

قیامت کے دن ایک عجیب وغریب منظر پیش ہوگا، ایک شخص حاضر ہوگا۔ نفلی صدقات، روزے، حج، نمازیں، غرض ہر طرح کی نیکیاں اس کے نامۂ اعمال کو پُر کیے ہوئے ہوں گی۔ وہ بڑا مسرور اور بڑا خوش ہوگا، لیکن جب اس کی پیشی ہوگی تو معلوم ہوگا کہ اس نے کسی کا مال ناحق کھایا تھا، پس نیکیوں کا ایک ذخیرہ اٹھا کر مظلوم کو دے دیا جائے گا، پھر معلوم ہوگا کہ کسی کو گالی دی تھی، نفل نمازیں اسے دے دی جائیں گی۔ معلوم ہوگا کہ کسی کو مارا تھا، صدقاتِ نافلہ میں سے کمی کر دی جائے گی۔ یوں ہوتے ہوتے اعمالِ صالحہ کا پورا ذخیرہ ختم ہو جائے گا لیکن مظلوموں کی فریادیں بھی باقی ہوں گی، پھر ہوگا یہ کہ ان مظلوموں کے گناہ اس کے سر ڈال دیے جائیں گے اور وہ جہنم میں ڈھکیل دیا جائے گا۔

پانچ روپے کا سکہ ہاتھ میں آتے ہی مختلف مٹھائیوں کے نام اپنے ہیولوں کے ساتھ اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اسلامی تعلیمات نے اس کی رہنمائی کی۔ تبلیغی جماعت میں گزرے ہوئے شب و روز یاد آئے۔ اس نے سوچا: ٹکٹ لیے بغیر پانچ روپے کا سکہ لینے کا مطلب یہ ہوا کہ بقیہ پانچ روپے کنڈیکٹر کی جیب میں چلے جائیں گے۔

ممکن ہے کنڈ یکٹر کے گھر میں بھی کوئی بچہ ڈائری ملک چاکلیٹ کا منتظر ہو، مگر ہم دونوں کے اس ''سمجھوتے'' سے بی ایم ٹی سی (B.M.T.C) کو نو روپے کا نقصان ہوگا۔ بی ایم ٹی سی کسی ایک فرد کا نام نہیں، بلکہ شہریانِ بنگلور کے مجموعی مفاد سے وابستہ مشنری کا نام ہے۔ بی ایم ٹی سی سے نو روپے غبن کرنے کا مطلب یہ ہے کہ لاکھوں انسانوں کے مجموعی مفاد کو نقصان پہنچایا جائے۔

اسے اچانک محسوس ہوا کہ روزِ قیامت برپا ہے۔ وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی نمازوں کے ساتھ، گنے چنے روزوں کے ساتھ، خستہ حال صدقات کے ساتھ، چھوٹی موٹی نیکیوں کے ساتھ اپنے رب کے حضور کھڑا ہوا ہے۔ پیشی کا وقت آیا، اچانک کیا دیکھتا ہے کہ شہریانِ بنگلور کا ایک جمِ غفیر اس کی طرف چلا آرہا ہے، اپنے حقوق کے مطالبے کے لیے.............!!!

دفعتاً اس نے بس میں پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کنڈ یکٹر کافی آگے بڑھ چکا تھا اس نے گلا پھاڑ کر کہا ''ٹکٹ کوڑِ ی سر'' کنڈ یکٹر، جو شاید اب تک اس کو بھول بھی چکا تھا، پلٹ کر اسے دیکھا، اور کرخت لہجے میں بولا ''این ری؟ (کیا ہے) اس نے فوراً پانچ روپے کا سکہ آگے بڑھایا اور متانت سے کہا ''ٹکٹ کوڑِی سر'' (ٹکٹ دیجیے جناب) چارونا چار کنڈ یکٹر نے چرمی بیگ میں ہاتھ ڈالا، ایک روپے کا سکہ نکال کر اور نو روپے کی ٹکٹ کے ساتھ ایک روپے اسے دے کر پانچ کا سکہ واپس لے لیا اور برا سا منھ بناتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

اس نے ایک روپے پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ سکے کو جیب میں رکھ کر وہ سیٹ پر پشت لگا کر اطمینان سے بیٹھ گیا، جیسے منوں مٹی کا بوجھ اس کے کاندھے سے اتر گیا ہو۔ ہاں اُترا تو تھا..........مٹی کا بوجھ نہیں..........گناہوں کا بوجھ۔ (بتصرفِ قلیل)

'جرم' ایک ثقلِ بے کراں ہے میر
کاں یہ تجھ ناتواں سے اٹھتا ہے

کرفیو پاس

خالد اپنے والد کی عیادت کر کے واپس آ رہا تھا کہ شہر میں فساد پھوٹ پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے فسادیوں نے شہر کے اکثر لوگوں کو لوٹنا اور جلانا شروع کر دیا، جب فساد تھوڑی دیر کے لیے رکا تو خالد اپنے گھر کی طرف رخ کرتا ہے اور اپنے محلے کے اکثر گھروں اور دکانوں سے نکلتی ہوئی آگ اور دھویں کو دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے۔ اب سارے شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے۔ خالد اپنے والدین کے لیے ایک ہی لڑکا ہے اور اس کی دو چھوٹی بہنیں اسما اور سیما ہیں۔ اسماء ساتویں جماعت میں پڑھتی ہے اور سیما پانچویں میں۔ شہر میں کرفیو نافذ رہنے کی وجہ سے خالد کو اپنے والد کی عیادت کے لیے جانا دشوار ہو جاتا ہے۔ اضطرابی عالم میں اس کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کرے؟ خالد اپنے محلے کے تھانے میں جاتا ہے اور اپنے والد کے بیمار ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ پولیس والے اس کو کرفیو پاس دینے سے انکار کر دیتے ہیں، خالد بہت ہی منت سماجت کرتا ہے مگر پولیس والے اس کو دھتکار دیتے ہیں ''جاؤ ہر کسی کو یہاں پر پاس نہیں دیا جاتا'' خالد مایوس ہو کر اپنے گھر لوٹتا ہے اور خدا کے حضور بہت ہی گڑگڑاتا ہے، اس کو تسلی دینے والا بھی کوئی نہیں، اس لیے کہ خالد ہی گھر میں بڑا لڑکا ہے۔ خالد کی ضعیف دادی اور دو بہنیں اسے تسلی دیتی ہیں، خالد کو یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ اسے اپنے والد کو دیکھے بغیر ایک دن گذر گیا ہے۔

محلے کے نوجوانوں کو اس بات کا علم ہوتا ہے تو محلے کے نوجوان سب مل کر تھانے پہنچ جاتے ہیں اور خالد کے واسطے کرفیو پاس دلا دیتے ہیں، مگر شہر میں کرفیو ہونے کی وجہ

سے خالد اپنے والد کے لیے کچھ بھی خرید نہیں پاتا۔ اسپتال کی کینٹین میں جب جا کر دودھ اور روٹی کی قیمت معلوم کرتا ہے تو ان تمام اشیاء کی قیمت بہت ہی بڑھ گئی ہوتی ہے۔ لیکن مجبوری کی وجہ سے اس کو انہی داموں خریدنا پڑتا ہے، وہ اسے لے کر اپنے والد کے پاس جاتا ہے۔

خالد کی والدہ بچپن ہی میں گذر گئی تھی۔ خالد گھر میں ہو تو اس کا دل اسپتال میں رہتا ہے اور جب اسپتال میں ہو تو اس کو اپنی دونوں بہنوں کی فکر ستاتی ہے۔ خالد شام میں چھ بجے اپنے گھر آ رہا تھا، شہر میں شام کے چھ بجے ہی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رات کے دو یا تین بج رہے ہیں، ہر طرف سناٹے کا راج تھا، خالد ڈرتا ڈرتا اپنے گھر کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ اس کو دور ہی سے خاکی وردی والے دکھائی دیتے ہیں، خالد خاکی وردی والوں سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ خاکی وردی والے اسے بلا کر اس کا توشہ چیک کرتے ہیں، توشہ خالی دیکھ کر گالیاں دیتے ہوئے اسے واپس بھیج دیتے ہیں۔ خالد جیسے ہی اپنی گلی میں مڑتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ ساری گلی میں آگ کے شعلے اٹھ رہے ہیں، لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں اور محلے کے نوجوان آگ بجھانے کے لیے پانی لا لا کر ڈال رہے ہیں ۔اس قیامت صغریٰ کے عالم میں بھی شرپسند اپنی لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہیں، ہر ایک اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ خالد کو اپنی چھوٹی بہنوں کی فکر تھی کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہی ہیں۔ اس کے ذہن میں بڑے برے خیالات آ رہے تھے کہ کہیں شرپسندوں نے اس کی بہن کو جلا تو نہیں دیا۔ خالد اسی کسمپرسی کی حالت میں کھڑا ہوا ہے کہ اس کی بہن سیما بھیا بھیا کہہ کر پکارتی ہوئی آتی ہے۔ خالد مڑ کر دیکھتا ہے تو سیما کا ایک ہاتھ جلا ہوا ہے، وہ بڑی بہن اسماء کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ اپنے گھر کی طرف اشارہ کر کے رونے لگتی

ہے۔خالداپنے گھر کی طرف دیکھتا ہے،فسادیوں نے گھر کو جلا کر راکھ بنادیا ہے۔

اب خالد اپنی بہن سیما کو لے کر تھانے جاتا ہے اور چھوٹی بہن کے ہاتھ جل جانے اور اسماء کے جلا دینے جانے اور گھر کو راکھ بنانے کے بارے میں رپورٹ لکھانا چاہتا ہے تو پولیس والے اس کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور اس کو دھتکار کر تھانے سے بھیج دیتے ہیں۔وہ مایوس ہوکر اپنی چھوٹی بہن کو لے کر دواخانے آتا ہے،لوگوں کا اژدحام زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ قطار میں کھڑا ہوجاتا ہے،چھوٹی بچی درد نا قابل برداشت ہونے کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر اپنے بھیا کے کاندھے پر دم توڑ دیتی ہے۔جیسے ہی وہ دم توڑ دیتی ہے خالد بے ہوش ہو کر گر جاتا ہے۔محلے کے نوجوان اس کو قریبی دواخانے میں داخل کر کے اس کی بہن کی تجہیز و تکفین کر دیتے ہیں۔ جب خالد کو ہوش آتا ہے تو سیما کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی ہوتی ہے کہ بھیا مجھے بچالو مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔ یہ آواز کانوں میں گونجنے کے بعد اس پر دوبارہ غشی طاری ہوجاتی ہے۔جب افاقہ ہوتا ہے تو اپنے آپ کو سنبھال کر وہ پریشان ہو کر اپنے والد کے دواخانے کی طرف دوڑتا ہے۔والد کو شہر میں فساد کی اطلاع ملنے پر بھی اپنے گھر اور معصوم بچوں کی فکر میں ڈوبے رہتے ہیں،جیسے ہی خالد پر نظر پڑتی ہے وہ اپنے بیٹے کو پاس بلا کر کہتے ہیں کہ اپنی چھوٹی بہنوں کا اور گھر کا خاص خیال رکھنا۔خالد اپنے والد کو حقیقت بیان کرنا ہی چاہتا ہے کہ ان کی روح داعی اجل کو لبیک کہہ دیتی ہے۔خالد کو پہلے تو اپنی چھوٹی بہنوں کے وصال کا صدمہ تھا،اب یہ والد کی موت کا دہرا صدمہ ہوجاتا ہے۔

خالد اپنے والد کے کفن دفن کا انتظام کرنے کے لیے باہر نکلتا ہے،مگر اب بھی شہر میں کرفیو نافذ ہے۔ایک دو گھنٹہ کا عرصہ درمیان میں وقفہ دیا جاتا ہے ۔سارے راستے

حسب معمول ویران ہیں۔ خالد کو خاکی وردی والے نظر آتے ہیں، جیسے ہی وہ خاکی وردی والوں کو دیکھتا ہے اس کے بدن میں کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ خاکی وردی والے اس کو بلا کر ڈانٹتے ہیں کہ وہ کرفیو میں کہاں گھوم رہا ہے، وہ کہتا ہے کہ اپنے باپ کے لیے کفن لانے جا رہا ہوں، خاکی وردی والے اس سے ''کرفیو پاس'' پوچھتے ہیں۔ خالد کرفیو پاس دکھاتا ہے، مگر خاکی وردی والے اس کے پاس سے کرفیو پاس لے کر پھاڑ دیتے ہیں اور اس کی پٹائی شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جلدی بھاگ جاورنہ تجھے دوسرے لوگ ختم کر دیں گے۔ جیسے ہی وہ اٹھ کر بھاگنے لگتا ہے خاکی وردی والے بڑی بے دردی سے اس کے سارے بدن کو چھلنی کر دیتے ہیں اور وہ وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے۔

ڈُلہا سعودی کا، کیس ڈاوری کا

جوان بچی گھر میں بیٹھی ہوئی ہے اور شادی کا انتظار کرتے کرتے اس کی جوانی ڈھلتی جارہی ہے، حرص ولالچ کے مارے والدین صرف یہ سوچ کر خاموش بیٹھے ہیں کہ ہماری بچی کی شادی تاخیر ہی سے صحیح مگر کسی ایسے نوجوان سے کریں جو اچھا، خوبصورت (اگر چہ کہ خوب سیرت نہ ہو) اور سعودی میں ملازم ہو۔ (اس بات سے بھی غرض نہیں کہ خواہ لڑکا سعودی میں بھنگی ہی کا کام کررہا ہوں اور یہاں یہ بتائے میں میں ڈیفنس میں انجینئر ہوں) اوراس کے پاس سعودی کا ویزا ہو یا کم از کم ایسا شخص ہو جو شادی کے بعد سعودی جانے والا ہو، خیر تلاشِ بسیار کے بعد سعودی کا دلہا مل جاتا ہے اور بڑے دھوم دھام سے شادی ہوتی ہے، شادی کے چند دنوں ہنسی خوشی دن گزارتے ہیں اور چند ماہ بعد لڑکا اپنی نئی نویلی دلہن کو ماں بہن بھائیوں کے حوالے کرکے اپنی ملازمت پر واپس لوٹ جاتا ہے، جیسے ہی وہ روانہ ہوا یہاں لڑکی کا جینا حرام ہوجاتا ہے، شادی کے شروع دنوں کے مزے، سیر وتفریح، پارکوں میں پھرنا اور رات دیر سے دونوں کا گھر لوٹنا، یہ سب دیکھ کر جو گھر والے کڑھتے تھے اب انہیں موقع مل جاتا ہے کہ اپنے دل کی بھڑاس نکالیں، اب لڑکی پر ظلم وستم کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں، ایک طرف سے ساس تنگ کرتی ہے تو دوسری طرف سے نند اور دیور کچوکے لگاتے ہیں۔ کچھ دنوں کی راحت خواب کی طرح ختم ہوجاتی ہے اور لڑکی ظلم وستم کی چکی میں پسنے لگتی ہے، سسرال والے لڑکی کو ماں کے گھر بھی جانے

نہیں دیتے بلکہ ظلم کی انتہاء دیکھئے کہ ماں کے گھر فون کرنے بھی نہیں دیتے اور اگر ماں کے گھر سے خود فون آئے تو نند یا دیور خود فون کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے کہ لڑکی کی زبان پر کوئی حرف شکایت نہ آنے پائے، اس درمیان لڑکے کو بھی خطوط، فون وغیرہ کے ذریعے بیوی کے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں اور نت نئے الزامات تراش کر اسے اپنی بیوی سے بدظن کرتے ہیں اور وہ بھی دور رہ کر صحیح حالات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے گھر والوں کی باتوں کا یقین کر لیتا ہے اور بیوی کا نان ونفقہ بھی بند کر دیتا ہے، جب ظلم اپنی انتہاء کو پہنچ جاتا ہے اور لڑکی نڈھال ہو کر کسی طرح بچ بچا کر اپنی ماں کے گھر پہنچ جاتی ہے تو اس پر چوری کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔ لڑکی کے ماں باپ اور سارے رشتہ داروں کو جب ان باتوں کا علم ہوتا ہے تو وہ بھی بجائے اس کے کہ اپنے کئے پر پچھتاتے اور حقیقی صورت حال کی تحقیق کرتے سیدھے فیملی کورٹ، کمشنر آفس یا ویمنس ویلفر اسوسی ایشن جا کر لڑکے کے خلاف (جو خود بھی حالات کا ستایا ہوا اور بالکل بے قصور ہوتا ہے) جہیز ہراسانی کا مقدمہ (ڈاوری کیس) دائر کر دیتے ہیں۔

درج بالا سطور قارئین کو یقیناً کوئی چٹ پٹی کہانی محسوس ہو رہی ہوگی، مگر نہیں، یہ کوئی افسانہ نہیں، یہ ایک المناک کھیل ہے جو شہر اور اطرافِ شہر کے اکثر گھروں میں نتائج سے بے پرواہ ہو کر کھیلا جا رہا ہے۔ لڑکیوں کے ماں باپ بغیر تحقیق کے سعودی ریال کے چکر میں اپنی بچیوں کی شادیاں ایسے گھروں میں کر دیتے ہیں اور لڑکے والے بھی نتائج کو سوچے سمجھے بغیر صرف حسد کی وجہ سے حالات کو بگاڑ دیتے ہیں اور بڑوں کی غلطیوں کا خمیازہ بچے بھگتتے ہیں۔

جہیز ہراسانی دائر ہونے کے بعد دونوں فریق کورٹ کچہری کے چکر لگاتے

لگاتے اپنی زندگی کا ایک بڑا اور قیمتی حصہ گنوا بیٹھتے ہیں اور اسی چکر میں اپنی ٹوٹی پھوٹی پونجی جو خون پسینے کی کمائی ہوئی ہوتی ہے، اس کو بھی صرف کر کے خالی ہاتھ فتح علی خان ہو جاتے ہیں، اور یہ سمجھنے میں بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے کہ دونوں طرف سے نقصان ہی ہوا ہے اور فائدہ ہے تو صرف سامنے والے فردِ ثالث یعنی وکیل کا فائدہ ہے، بہر حال جب دونوں فریق کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کورٹ کچہری کے چکر کا حاصل کچھ نہیں تو آخر میں اسلام یاد آتا ہے، حالانکہ ایک مسلمان کو کورٹ کچہری کے چکر میں پڑنے کے بجائے پہلے ہی اپنے مسائل کو سلجھانے کے لیے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا صریح ارشاد ہے کہ ”اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو، اور امیر کی جو تم میں سے ہو، پس اگر تم میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹا دو اگر تم یومِ آخرت پر ایمان رکھنے والے ہو تو یہی تمہارے لیے اچھی بات ہے اور انجام کے اعتبار سے بہتر ہے۔(سورۃ النساء ۵۹)

در در کی ٹھوکریں کھانے کے بعد جب اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم یاد آتا ہے تو لوگ کم علمی کی وجہ سے بجائے اس کے کہ دارالقضاء یا علماء کرام کی طرف رجوع ہوں ،فلاحی اداروں یا مساجد کے ذمہ داروں کی طرف رجوع ہوتے ہیں، جن کو نہ قرآن کا علم ہوتا ہے نہ حدیث سے کوئی نسبت ہوتی ہے، نہ مسائل سے کوئی واقفیت ہوتی ہے، نہ فقہ سے کوئی تعلق ہوتا ہے، اکثر بے سرو پا فیصلے کر دیتے ہیں۔ بہر حال لڑکیوں کے والدین کو چاہیے کہ شادی سے قبل ان ساری باتوں پر غور کریں، اپنی بچیوں پر ظلم کیے بغیر صحیح وقت پر

اچھے اور نیک سیرت لڑکوں سے شادی کرائیں۔ بیرونِ ملک جانے والوں کے بجائے ایسے لڑکوں کے ساتھ شادی کرائیں جو ہندوستان میں صحیح برسرِ روزگار، محنتی ہو، چاہے وہ اپنے شہر یا گاؤں ہی میں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر رہا ہو۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو سب سے پہلے دین کی سمجھ عطا فرمائے اور اپنی معصوم بچیوں پر ظلم کرنے سے بچائے اور جوڑے جہیز کی لعنت کو ختم کر کے سیدھی سادی شادی کرنے والا بنائے۔ کورٹ کچہریوں کے چکر سے اللہ تعالیٰ سارے مسلمانوں کو محفوظ رکھے۔

مطبوعہ روزنامہ پاسبان 12/06/1998

بحمد اللہ تعالیٰ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆☆
☆☆☆☆
☆☆☆
☆☆
☆